توحید، رسالت، قیامت، قضا و قدر، آسمانی کُتُب
اور اُصولِ دین پر جامع کتاب

عِلمُ الکلام



مُصنّف

مولانا مُحمّد ادریس کاندھلوی رحمۃ اللہ علیہ

۱۸۹۹ء — ۱۹۷۶ء



زمزم پبلشرز

توحید، رسالت، قیامت، قضاء وقدر، آسمانی کتب
اور اصول دین پر جامع کتاب

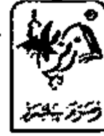
عِلمُ الکلام

مصنف
مولانا محمد ادریس کاندھلوی رحمۃ اللہ علیہ
۱۸۹۹ء - ۱۹۷۶ء



زمزم پبلشرز

کتاب کا نام	علم الکلام
مصنف	مولانا محمد ادریس کاندھلوی رحمہ اللہ
صفحات	۴۶۴
تاریخ اشاعت	نومبر ۲۰۲۴ء
ناشر	زمزم پبلشرز کراچی



زمزم پبلشرز

شاہ زیب سینٹر نزد مقدس مسجد، اُردو بازار کراچی

اندرون ملک سے رابطے کے لیے

+92 302 8478551
+92 335 1111329

بیرون ملک سے رابطے کے لیے

+92 302 8478552
+92 300 8204770

فنی اور علمی امور کے لیے

+92 333 2748092
printingzzp@gmail.com

آن لائن خریداری کے لیے

+92 335 1111326
ezamzampublishers@gmail.com

: zamzampublisher@gmail.com
: www.zamzampublishers.com.pk

ملنے کے دیگر پتے

- دار الاشاعت، اردو بازار کراچی
فون: 021-32213768
- مکتبہ بیت العلم (اردو بازار، لاہور)
فون: 042-37112356
- مکتبۃ القرآن (بنوری ٹاؤن، کراچی)
فون: 021-34856701
- قدیمی کتب خانہ، آرام باغ کراچی
فون: 021-32212220
- دار الاخلاص (محلہ جنگی، پشاور)
فون: 091-2567539
- مکتبہ رحمانیہ، اقرا سینٹر
غزنی اسٹریٹ، اردو بازار، لاہور
فون: 042-37224228
- ادارۃ المعارف (جامعہ دار العلوم کورنگی، کراچی)
فون: 021-35032020
- مکتبہ اصلاح و تبلیغ (مارکیٹ ٹاور، حیدرآباد)
فون: 022-2621622
- بک لینڈ، المصباح ۱۶، اردو بازار لاہور
فون: 042-37124656

فہرست مضامین

عنوان	صفحہ

صفحہ	عنوان

صفحہ	عنوان
۳۹۲	تفصیل
۳۹۶	ابطال تناسخ
۴۰۷	مسئلہ نجات
۴۱۷	توبہ اور استغفار کے حکم اور اسرار
۴۲۰	پہلا مرتبہ...... ذلت احتیاج
۴۲۱	دوسرا مرتبہ...... ذلت اطاعت
۴۲۱	تیسرا مرتبہ...... ذلت محبت
۴۲۱	چوتھا مرتبہ...... ذلت خطاء و تقصیر
۴۲۷	مادر مہربان
۴۲۹	اصل مقصد کی طرف رجوع
۴۳۱	نجات کا دوسرا طریقہ
۴۳۳	نجات کا تیسرا طریقہ
۴۳۴	نجات کا چوتھا طریقہ
۴۳۴	ابطال کفارہ
۴۴۷	زبور (۹۱) آیت ۱۱
۴۵۵	ایک شبہ اور اس کا ازالہ
۴۵۵	ایک شبہ اور اس کا جواب
۴۵۶	نجات دائمی
۴۵۹	دیدار خداوندی
۴۶۳	خلاصہ کلام



بسم اللہ الرحمن الرحیم

مقدمہ

والد مرحوم نے اپنی تفسیر، معارف القرآن کے مقدمہ میں اپنا مختصر تعارف ان الفاظ میں تحریر کیا ہے:

"بندۂ ناچیز حافظ محمد ادریس بن حافظ محمد اسماعیل کاندھلوی، نسباً صدیقی، مسلکاً حنفی اور مشرباً چشتی ہے۔"

تاریخ ولادت کے بارے میں لکھا ہے:

"میں بارہ ربیع الثانی ۱۳۱۷ھ/ ۱۸۹۹ء کو شہر بھوپال میں پیدا ہوا۔"

خاندان کی مذہبی روایات کے مطابق دینی تعلیم کی ابتداء حفظِ قرآن سے کی، نو برس کی عمر میں حفظِ قرآن سے فارغ ہوئے۔ حفظ قرآن سے فارغ ہوئے تو ہمارے دادا حافظ محمد اسماعیل انہیں لے کر مولانا اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ تعالیٰ کی خدمت میں تھانہ بھون حاضر ہوئے۔ اور مولانا تھانوی رحمہ اللہ تعالیٰ سے کہا:

"مولوی اشرف علی! میں ادریس کو خانقاہ اشرفیہ میں داخل کرانے کے لئے لایا ہوں۔ اب یہ آپ کے سپرد ہے۔"

مولانا تھانوی نے برجستہ جواب دیا: حافظ اسماعیل! یہ نہ کہئے کہ خانقاہ اشرفیہ میں داخل کرانے لایا ہوں، بلکہ یوں کہئے کہ مدرسہ اشرفیہ میں داخل کرانے لایا ہوں۔

مولانا تھانوی اس حقیقت کو بھانپ گئے تھے کہ حافظ محمد اسماعیل کا بیٹا خانقاہی نظام کے لئے پیدا نہیں ہوا۔ اس سے تو قدرت قرآن وسنت کے علوم کی ایسی خدمت لے گی جو برسوں میں کسی مردِ مؤمن کا نصیب بنتی ہے۔ چنانچہ مولانا تھانوی کے ارشاد کے مطابق آپ کو خانقاہ اشرفیہ کے بجائے مدرسہ اشرفیہ میں داخل کیا گیا۔

مدرسہ اشرفیہ تھانہ بھون میں ابتدائی تعلیم کا انتظام تھا، اس لئے ابتدائی کتابیں وہاں پڑھنے کے بعد سہارن پور چلے گئے۔ وہاں مدرسہ عربیہ مظاہر العلوم میں سلسلہ تعلیم جاری رکھا۔ مولانا خلیل احمد سہارنپوری، مولانا ثابت علی اور مولانا حافظ عبداللطیف جیسے جلیل القدر علماء سے استفادہ کیا۔

۱۹ ر برس کی عمر میں سند فراغت حاصل کی۔

دارالعلوم دیوبند میں:

اگرچہ آپ نے مظاہر العلوم سے سندِ فراغت حاصل کی، مگر آپ نے دیکھا کہ دارالعلوم دیوبند ملک، بلکہ عالمِ اسلام کے جہابذۂ فن کا مرکز بنا ہوا ہے، وہاں کے افق پر پیغمبرانہ علوم کے ماہ و نجوم کا جھرمٹ ہے۔ آپ نے ان درخشندہ ماہ و نجوم سے کسبِ نور کا ارادہ کیا اور مظاہر العلوم سے سندِ فراغت حاصل کر کے دیوبند چلے گئے۔ وہاں دوبارہ دورۂ حدیث پڑھا اور علامہ انور شاہ کاشمیری، علامہ شبیر احمد عثمانی، میاں اصغر حسین اور مفتی عزیز الرحمٰن رحمہم اللہ تعالیٰ جیسے مایہ ناز اساتذہ کے سامنے زانوئے ادب تہ کیا۔

تدریسی زندگی:

۱۳۳۸ھ = ۱۹۲۱ء سے تدریسی زندگی کا آغاز ہوا، سب سے پہلے مدرسہ امینیہ دہلی سے تعلق قائم ہوا، مدرسہ امینیہ کا یہ وہ دور تھا جب مفتی محمد کفایت اللہ مرحوم مدرسہ کی روحِ رواں تھے، لیکن مدرسہ امینیہ سے آپ کا تعلق صرف ایک سال قائم رہا۔ آئندہ سال دارالعلوم دیوبند کی کشش آپ کو دارالعلوم کھینچ لائی۔ آپ کے لئے یہ بہت بڑا اعزاز تھا کہ جن عظیم اساتذہ کے آگے ایک سال قبل زانوئے ادب تہ کیا تھا، انہوں نے ہی آپ کو تدریس کی دعوت دی، اور قدرت نے یہ شرف بخشا کہ علامہ شبیر احمد عثمانی، علامہ انور شاہ کاشمیری، مفتی عزیز الرحمٰن اور مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی رحمہم اللہ تعالیٰ جیسے جلیل القدر علماء اور اساتذہ کے پہلو بہ پہلو مسندِ درس پر فائز ہوئے۔

دارالعلوم میں پہلے ہی سال جو اسباق دیئے گئے، ان میں ہدایہ اور مقاماتِ حریری جیسی مشکل کتابیں تھیں۔ فرمایا کرتے تھے کہ مجھے کبھی ابتدائی کتابیں نہیں دی گئیں۔ شروع ہی سے مشکل اور اہم کتابوں کی تدریس کا آغاز کیا۔

حیدر آباد دکن میں قیام:

۱۹۲۹ء میں علامہ انور شاہ کاشمیری رحمہ اللہ تعالیٰ اور علامہ شبیر احمد عثمانی رحمہ اللہ تعالیٰ کا دارالعلوم دیوبند کی انتظامیہ سے اختلاف ہوا اور نہ صرف یہ دونوں بلکہ ان کے گروپ کے بہت سے اساتذہ، حتیٰ کہ طلبہ بھی ان کے ہمراہ دارالعلوم چھوڑ کر ڈابھیل چلے گئے۔ والد صاحب نے حیدر آباد دکن جانے کو ترجیح دی۔ حیدر آباد دکن میں کم و بیش دس برس قیام رہا، اگرچہ وہاں نہ

دارالعلوم سے وابستگی جیسی نعمت تھی اور نہ علامہ انور شاہ اور علامہ عثمانی جیسے علم وحکمت کے سرچشموں سے قرب حاصل تھا، مگر اس اعتبار سے وہاں کا زمانۂ قیام آپ کی زندگی کا قیمتی حصہ گردانا جاسکتا ہے کہ "التعليق الصبيح شرح مشكوة المصابيح" جیسی عظیم اور مایہ ناز کتاب کی تالیف کا موقعہ ملا اور اس کی ابتدائی چار جلدیں وہیں کے دورانِ قیام دمشق جاکر طبع کرائیں۔

"التعليق الصبيح" عربی زبان میں ہے اور علمی نقطۂ نظر سے اتنی ٹھوس اور بلند پایہ ہے کہ علمائے ہند کے علاوہ مصر، شام، عراق اور حرمین الشریفین کے علماء نے بھی اس کو قدر ومنزلت کی نگاہ سے دیکھا اور اس پر تقاریظ لکھیں۔ التعليق الصبيح کی تالیف واشاعت ہند سے نکل کر عرب ممالک میں آپ کے تعارف کا ذریعہ بنی۔

۱۹۳۹ء میں علامہ شبیر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ دارالعلوم دیوبند میں صدر مہتمم کی حیثیت سے آئے تو وہاں دورۂ حدیث کی طرح دورۂ تفسیر کا بھی اجراء کیا گیا۔ اور شیخ التفسیر کے لئے علامہ عثمانی رحمۃ اللہ علیہ صدر مہتمم اور قاری محمد طیب رحمۃ اللہ علیہ مہتمم دارالعلوم نے آپ کو دارالعلوم آنے کی دعوت دی۔

جس وقت آپ کو یہ دعوت دی گئی، اس وقت آپ کو حیدر آباد میں ڈھائی سو روپے ماہانہ مشاہرہ مل رہا تھا اور دیوبند میں صرف ستر روپے ماہانہ کی پیشکش کی گئی، کیوں کہ اس وقت وہاں اساتذہ کی تنخواہوں کا یہی معیار تھا۔ تمام احباب اور گھر والوں نے شدید مخالفت کی اور کہا کہ ڈھائی سو روپے چھوڑ کر ستر روپے ماہانہ پر جانا کہاں کی عقل مندی ہے۔ خود والد صاحب کہا کرتے تھے کہ تمہاری والدہ نے بھی مخالفت کی اور کہا کہ ہم ڈھائی سو روپے ماہانہ پاتے ہیں، رہائش مفت ہے، وہاں ستر روپے میں کیسے گزارہ ہوگا؟ مگر قدرت نے والد صاحب کو جس قناعت سے نوازا تھا، اس کا اندازہ دوسرے نہیں کر سکتے تھے۔ احباب اور گھر والوں سے کہہ دیا کہ خواہ تنگی ہو یا فراخی، میں دارالعلوم کی دعوت کو رد نہیں کر سکتا اور پھر وہ بھی تفسیر قرآن پڑھانے کیلئے۔ بقول والد محترم:

> "جب گھر والوں نے زیادہ ہنگامہ کیا تو میں اپنے اطمینانِ قلب کی خاطر کاندھلہ آیا کہ والد صاحب سے مشورہ کروں، تاکہ وہ جو رائے اور حکم دیں اس پر شرحِ صدر کے ساتھ عمل کروں، چنانچہ کاندھلہ آیا، والد صاحب کو علامہ شبیر احمد عثمانی اور قاری طیب کے خطوط دکھائے کہ ان حضرات نے دارالعلوم میں شیخ التفسیر کی جگہ کے لئے دعوت دی ہے، لیکن تنخواہ وہاں کے ڈھائی سو روپے کے بجائے صرف ستر روپے

ماہانہ ہوگی، آپ کی کیا رائے ہے۔ چلا جاؤں یا عذر کردوں؟ یہ بات سن کر والد صاحب سخت ناراض ہوئے، فرمایا۔ درکارِ خیر ہیچ حاجت استخارہ نیست، نیز فرمایا: تم پوچھنے بھی کیوں آئے۔ پہلے ہی خط میں ہاں کہہ دینا تھا۔"

والد صاحب کی یہ بات سن کر آپ کو کلی اطمینان اور شرح صدر ہوگیا اور آپ نے دارالعلوم کی درخواست قبول کرلی اور اس طرح حیدر آباد دکن کو خیر آباد کہہ کر ۱۹۳۹ء میں بحیثیت "شیخ التفسیر" دارالعلوم دیوبند چلے آئے۔

دسمبر ۱۹۴۹ء میں پاکستان آئے۔ ۲۷؍دسمبر ۱۹۴۹ء سے ۱۰؍اگست ۱۹۵۱ء تک شیخ الجامعہ، جامعہ عباسیہ بہاول پور کے منصب پر فائز رہے۔

۱۱؍اگست ۱۹۵۱ء سے جامعہ اشرفیہ لاہور سے وابستہ ہوئے اور زندگی کے آخری لمحے تک اس تعلق کو قائم رکھا۔ ۲۸؍جولائی ۱۹۷۴ء کو وفات پائی۔

تصنیف وتالیف:

آپ کا تصنیفی کام بنیادی طور پر تین موضوعات پر ہے۔

1. تفسیر القرآن
2. حدیث وسیرۃ
3. علم الکلام

فقہ کے موضوع پر کوئی کتاب نہیں لکھی اور نہ کبھی فتاویٰ کا کام کیا۔ ناچیز راقم اور برادر بزرگ مولانا محمد مالک کاندھلوی مرحوم نے جب ہدایہ کا اردو ترجمہ کیا تو بہت خوش ہوئے اور تقریظ میں یہ بات لکھی کہ: "میں فقہ کی کوئی خدمت نہ کرسکا تھا۔ اللہ کا شکر ہے کہ اس نے میری اولاد کو فقہ کی خدمت کی توفیق عطا کی۔"

تفسیر القرآن:

اسلام میں علم اور رشد و ہدایت کا اولین سرچشمہ قرآن حکیم ہے۔ خدمتِ قرآن کی ابتداء دارالعلوم دیوبند سے ہوئی جب آپ کو وہاں ۱۹۳۹ء میں شیخ التفسیر بنایا گیا۔ ۱۹۴۹ء تک تفسیر بیضاوی اور ابن کثیر کا درس دیا، یہ دونوں تفسیریں، دورۂ تفسیر کی درسی کتب تھیں۔ مکمل کتب شامل نصاب تھیں۔ ان درسی کتب کے علاوہ دارالعلوم ہی میں نماز فجر کے بعد درس قرآن کا اہتمام کیا، اس درس قرآن میں طلبہ، اساتذہ اور شہر کے اہل علم کثیر تعداد میں شریک ہوتے تھے۔

بظاہر تفسیر کے اسی تدریسی سلسلے سے تفسیر قرآن لکھنے کی طرف توجہ ہوئی۔

معارف القرآن کے نام سے قرآن حکیم کی ضخیم تفسیر بزبان اردو لکھی اس تفسیر کے بارے میں اگر مختصراً یوں کہا جائے تو جامع تبصرہ ہوگا کہ یہ تفسیر سلف صالحین اور علمائے متاخرین کے علوم و معارف کا خلاصہ اور نچوڑ ہے۔

ترجمہ شاہ عبدالقادر دہلوی کا شامل کیا ہے۔ لفظی ترجمہ کے بعد رواں ترجمہ ہے جس میں قوسین میں ضروری تشریحات دی ہیں۔ آپ کو آیات وسورۃ میں ربط کا خاص ذوق تھا، اس ذوق کو اپنی تفسیر میں پورے طور پر ملحوظ رکھا ہے۔ آیت کی ضروری تشریح کے بعد فائدہ کے عنوان سے اسرار و نکات بیان کئے اور جا بجا فقہی اور کلامی مسائل کی توضیح کی ہے۔ جہاں ایک طرف حافظ ابن کثیر، امام قرطبی، امام فخر الدین رازی اور علامہ آلوسی رحمہم اللہ تعالیٰ کے اقوال نقل کرتے ہیں۔ وہاں شیخ محی الدین بن عربی، حسن بصری اور مولانائے روم رحمہم اللہ تعالیٰ کے صوفیانہ اور ذوقی معارف بھی نقل کئے ہیں۔ شکوک و شبہات کے جوابات بھی دیئے ہیں۔ فقہی مسالک میں جصاص رحمۃ اللہ علیہ کی احکام القرآن اور تفسیر مظہری کو بنیاد بنایا ہے۔ تمام کتب تفسیر آپ کے پیشِ نظر ہیں اور مختلف ائمہ اور مفسرین کے اقوال نقل کر کے آخر میں قول راجح بیان کرتے ہیں۔

بعض مسائل پہ بہت محققانہ گفتگو کی ہے۔ قدیم تفاسیر کا خلاصہ نکال کر قارئین کے سامنے رکھ دیا ہے۔ وزنِ اعمال، حیات عیسیٰ، عصمت انبیاء، ہجرت مدینہ، تشبہ بالکفار، ہبوط آدم۔ یہ ایسے مباحث ہیں جن پر بہت تفصیل کے ساتھ بحث کی ہے۔ ان موضوعات پر دوسری اردو تفاسیر میں اتنی تفصیل نہیں ملتی۔

یہ تفسیر سات جلدوں پر مشتمل ہے۔ پانچ جلدیں تاختم سورۂ صافات والد صاحب کی تالیف کردہ ہیں۔ اور سورہ ص سے تاختم قرآن برادر محترم مولانا محمد مالک رحمۃ اللہ علیہ کی مؤلفہ ہیں۔

الفتح السماوی بتوضیح تفسیر البیضاوی:

قرآن حکیم کی تفاسیر تو بہت علماء نے لکھیں، لیکن تفسیر قرآن کی تفسیر و شرح بہت کم لکھی گئی۔ والد صاحب نے قاضی بیضاوی کی تفسیر کی شرح لکھی۔ بظاہر اس کا محرک یہ بنا کہ دارالعلوم دیوبند میں دورۂ تفسیر کے نصاب میں تفسیر بیضاوی کامل پڑھائی جاتی تھی اور آپ نے اولین شیخ التفسیر ہونے کے ناطے کم وبیش نو دس برس بیضاوی پڑھائی۔ ۱۹۴۹ء میں جامعہ عباسیہ بہاول پور میں شیخ الجامعہ کی حیثیت سے آئے۔ وہاں بھی تفسیر بیضاوی کا درس جاری رکھا۔ ۱۹۵۱ء کے آخر میں جامعہ

اشرفیہ لاہور آئے تو وہاں صحیح بخاری کے ساتھ کئی سال بیضاوی بھی پڑھاتے رہے۔ تفسیر بیضاوی کی یہ تفسیر عربی زبان میں ہے۔ اور ۲۳ اجزاء پر مشتمل ہے۔ مطبوعہ شکل میں کم و بیش پندرہ سو صفحات کی ضخامت کا اندازہ ہے۔

علوم حدیث:

علم حدیث پر سب سے پہلا اور سب سے ضخیم کام "التعلیق الصبیح" کے نام سے عربی زبان میں مشکوۃ شریف کی شرح ہے۔

اس ضخیم شرح کی ابتدائی چار جلدیں آپ نے ۱۹۳۳ء میں دمشق جا کر طبع کروائیں۔ طویل عرصے کے بعد باقی تین جلدیں پاکستان بننے کے بعد لاہور سے طبع ہوئیں۔ مگر ان کا طباعتی معیار بہت معمولی تھا۔ ۱۹۸۷ء میں برادر محترم مولانا محمد مالک کاندھلوی رحمۃ اللہ علیہ نے بقیہ تین جلدیں اسی معیار سے عربی ٹائپ میں چھپوائیں جیسے ابتدائی چار جلدیں دمشق میں طبع ہوئی تھیں اور آخری تین جلدوں کے ساتھ ابتدائی چار جلدیں بھی طبع کیں۔ اس طرح مشکوۃ کی یہ شرح سات جلدوں میں مکمل ہوگئی۔

خود والد صاحب کے بقول مشکوۃ کی تین قدیم شروح سے زیادہ استفادہ کیا۔ اولاً شیخ شہاب الدین فضل اللہ بن حسین تورپشتی رحمۃ اللہ علیہ (م: ۶۶۰ھ) کی شرح سے، مشکل احادیث کی توضیح و تشریح اور ان کے لطائف و معارف کے بیان میں شیخ حسین بن عبداللہ بن محمد طیبی رحمۃ اللہ علیہ (م: ۷۴۳ھ) کی شرح سے استفادہ کیا۔ کلماتِ حدیث کے ضبط و تعین اور وجوہِ اعراب کے ذیل میں شیخ نور الدین علی بن سلطان محمد ہروی معروف بالقاری رحمۃ اللہ علیہ (م: ۱۰۱۴ھ) کی شرح "مرقاۃ" کو بنیاد بنایا۔ جزوی طور پر عبدالحق محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کی شرح "لمعات" کو بھی پیش نظر رکھا۔

تحفۃ القاری بحل مشکلات البخاری:

امام محمد بن اسماعیل بخاری رحمۃ اللہ علیہ (م: ۲۵۶ھ) کی الجامع الصحیح، جمہور علماء کے نزدیک کتاب اللہ کے بعد صحیح ترین کتاب ہے۔ صحیح بخاری نہ صرف یہ کہ اکثر بلادِ اسلامیہ میں زیرِ درس ہے بلکہ علماء نے اس پر اتنا علمی کام کیا کہ بہت کم کتابوں کو اہل علم و فضل نے اس حد تک اپنی علمی کاوشوں کا موضوع و محور بنایا ہوگا۔

صحیح بخاری کی نمایاں خصوصیت اس کے ابواب و تراجم (عنوانات) ہیں۔ علماء نے شروح و

حواشی تو ہر دور میں لکھے، ان میں ضخیم و مفصل بھی تھے اور مجمل و مختصر بھی۔ لیکن ابواب و تراجم کے حل میں مستقل کتابیں تالیف نہیں کیں، شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے حل تراجم میں ایک رسالہ لکھا جو عربی زبان میں ہے، اور بہت مختصر ہے۔ برصغیر میں صحیح بخاری کے جو نسخے طبع کیے گئے ہیں، ان میں یہ رسالہ شامل ہے۔ شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندی رحمۃ اللہ علیہ (المتوفی: ۱۹۲۰ء) نے صحیح بخاری کے ابواب و تراجم کا حل اردو میں لکھنا شروع کیا تھا، لیکن آپ صرف کتاب الایمان اور کتاب العلم کے ابواب و تراجم کا حل لکھنے پائے تھے کہ خالق حقیقی سے جا ملے۔ مولانا حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ (المتوفی: ۱۹۵۷ء) نے تکمیل کا ارادہ کیا مگر بات آگے نہ بڑھ سکی۔ والد صاحب مرحوم نے اس موضوع پر مستقلاً کام کیا۔ عربی میں صحیح بخاری کے ابواب و تراجم کا حل کیا، مشکلات احادیث پر بھی اجمالی بحث کی، لیکن بنیاد حلِ تراجم کو بنایا۔

عربی میں مسودہ مکمل ہے۔ عربی میں مسودے کی تکمیل کے بعد اردو میں ابتداء کی۔ اردو میں قدرے اختصار سے کام لیا، اردو مسودہ نامکمل ہے۔ تقریباً ایک تہائی کتاب کے حل تراجم پر مشتمل ہے۔ دونوں مسودے غیر مطبوعہ ہیں۔ عربی مسودے کو کتابی صورت میں شائع کیا جائے تو ضخامت کا اندازہ دو ہزار صفحات ہے۔

منحۃ الحدیث فی شرح الفیۃ الحدیث:

حافظ زین الدین عراقی رحمہ اللہ تعالیٰ کا تعلق آٹھویں صدی ہجری سے ہے۔ ان کا شمار کبار محدثین میں ہے۔ ان کا علمی مقام متعین کرنے کے لئے یہ کہہ دینا کافی ہے کہ ان کے لائق تلامذہ میں علی بن ابی بکر ہیثمی رحمۃ اللہ علیہ (م: ۸۰۷ھ) اور ابن حجر عسقلانی رحمۃ اللہ علیہ (م: ۸۵۲ھ) جیسی قدآور شخصیتیں شامل ہیں۔

حافظ عراقی نے علوم حدیث پر جہاں دوسری بہت سی قابل قدر کتابیں تالیف کیں، وہاں علوم حدیث میں ''الفیۃ الحدیث'' کے نام سے ایک کتاب بھی لکھی۔ کتاب کی سب سے نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ منظوم ہے۔ کسی علمی اور فنی بحث اور مضمون کو نظم میں بیان کرنا خاصا دشوار کام ہے۔ ''یہ الفیۃ ایک ہزار دو اشعار پر مشتمل ہے۔ مختلف ادوار میں علماء نے اس کی شرحیں لکھیں۔ والد مرحوم نے بھی منحۃ الحدیث کے نام سے اس کی شرح لکھی۔ یہ شرح عربی زبان میں ہے اور کم وبیش پانچ سو صفحات پر مشتمل ہے۔

ناچیز کے پھوپھی زاد بھائی ساجد الرحمٰن صدیقی نے اس مخطوطہ کو ایڈٹ کیا ہے۔ اس پر انہیں

پنجاب یونیورسٹی لاہور کی طرف سے ڈاکٹریٹ کی ڈگری عطا کی گئی ہے۔ابھی زیورِطبع سے آراستہ نہیں ہوا۔لیکن امید ہے کہ مستقبل قریب میں طبع ہو جائے گا۔

مقدمۃ الحدیث:

اس تالیف میں تقریباً ان تمام مسائل اور موضوعات کو جمع کر دیا گیا ہے جن کی ایک طالب علم کو مطالعہ حدیث کے وقت ضرورت ہوتی ہے۔

حدیث کی مشروعیت، حدیث کی تعریفات، اقسام، طریقِ اسناد، تدوین حدیث، حدیث اور فقہ کا باہمی تعلق۔ یہ "مقدمۃ الحدیث" کے اہم اور بنیادی مباحث ہیں۔مخطوطہ ۴۲۸ صفحات پر مشتمل تھا۔ بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی کے ایسوسی ایٹ پروفیسر تاج الدین الازہری نے اس مخطوطہ کو ایڈٹ کر کے پنجاب یونیورسٹی سے ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی ہے۔مخطوطہ عربی زبان میں ہے۔مقالہ ابھی شائع نہیں ہوسکا۔

جلاء العینین فی مسئلۃ رفع الیدین:

عربی زبان میں ہے۔ مسودے کے ۱۰۷ صفحات ہیں۔ مولانا کے ابتدائی دور تصنیف و تالیف کا مسودہ ہے۔تاریخِ تکمیل ۳ جمادی الاولیٰ ۱۳۶۴ھ/۱۹۴۴ء درج ہے۔

الارشاد الیٰ مہمات الاسناد:

مؤلفین صحاح ستہ نے احادیث کے انتخاب کے لئے سند کو پرکھنے اور قبول کرنے کا جو معیار رکھا ہے اس پر بحث ہے۔ نیز مؤلفین صحاح ستہ کی شرائط کے مابین جو فرق ہے، اس کو بھی واضح کیا ہے۔عربی زبان میں ہے۔

تحفۃ الاخوان بشرح حدیث شعب الایمان:

عربی زبان میں مختصر سا رسالہ ہے۔طبع ہو چکا ہے۔

الباقیات الصالحات فی شرح حدیث "انما الاعمال بالنیات":

عربی زبان میں ہے۔طبع ہو چکا ہے۔

شرح حدیث افتراقِ امت (اردو):

مختصر سا رسالہ ہے۔مطبوعہ ہے۔

حجیت حدیث:

۱۹۵۳ء میں فتنۂ انکار حدیث ابھرا، مختلف مضامین کے علاوہ حجیت حدیث کے نام سے ایک مستقل کتاب لکھی۔ اردو میں ہے، دو سو صفحات پر مشتمل ہے۔ کئی بار شائع ہو چکی ہے۔ مختصر ہونے کے باوجود بہت مدلل کتاب ہے۔

مقدمۃ البخاری:

امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کی الجامع الصحیح کے اسلوب، شرائط، خصائص و امتیازات کا جامع تعارف۔ کتب صحاح ستہ میں الجامع الصحیح کا جو مقام و مرتبہ ہے اس کی وضاحت۔ عربی زبان میں ہے۔ کئی بار شائع ہو چکا ہے۔

سیرۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم:

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرتِ طیبہ پر جامع کتاب لکھی۔

دیگر اہم مؤلفات

دلائل القرآن علیٰ مذہب النعمان	(عربی)	مطبوعہ
اعجاز القرآن	(اردو)	مطبوعہ
الکلام الموثوق فی ان کلام اللہ غیر المخلوق	(اردو)	مطبوعہ
شرائط مفسر و مترجم	(اردو)	مطبوعہ

علوم حدیث:

حجیت حدیث	(اردو)	مطبوعہ
احسن الکلام فی ما یتعلق بالقراءۃ خلف الامام	(عربی)	مطبوعہ

سیرت وسوانح:

سیرۃ المصطفیٰ	(اردو)	مطبوعہ
بشائر النبیین	(اردو)	مطبوعہ
خلافت راشدہ	(اردو)	مطبوعہ

مقاصد بعثت	(اردو)	مطبوعہ

عقائد و علم کلام:

علم الکلام	(اردو)	مطبوعہ
عقائد الاسلام	(اردو)	مطبوعہ
اصول اسلام	(اردو)	مطبوعہ
احسن الحدیث	(اردو)	مطبوعہ
مسلک الختام (ختم نبوت)	(اردو)	مطبوعہ
احسن البیان فی مسئلۃ الکفر والایمان	(اردو)	مطبوعہ
اسلام اور نصرانیت	(اردو)	مطبوعہ
دستور اسلام	(اردو)	مطبوعہ
شرائط نبوت	(اردو)	مطبوعہ
لطائف الحکم فی اسرار نزول عیسیٰ بن مریم	(اردو)	مطبوعہ
الدین القیم	(اردو)	مطبوعہ
اسلام اور اشتراکیت	(اردو)	مطبوعہ

قصائد:

لامیۃ المعراج	(عربی)	مطبوعہ
تائیۃ القضاء والقدر	(عربی)	مطبوعہ
رائیۃ الحمد والثناء	(عربی)	مطبوعہ
تشطیر لامیۃ امرأ القیس	(عربی)	مطبوعہ

ڈاکٹر محمد میاں صدیقی

۲۹/۲/۰۳



بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حمد بے حد مر خدائے پاک را آنکہ ایماں داد مشت خاک را
بعد ازاں گویم نعت مصطفیٰ آنکہ عالم یافت از نورش صفا
سیّد الکونین ختم المرسلین آخر آمد بود فخر الاولین
ہر دم از ما صد درود و صد سلام بر رسول وآل و اصحابش تمام

(شیخ فریدالدین عطار رحمۃ اللہ علیہ)

مذہب اسلام

مذاہب دنیا میں بہت ہیں مگر ایسا مذہب جو ہر بات پر دلیل اور برہان پیش کرتا ہو اور بے دلیل باتوں کا رد کرتا ہو اور جن کو اپنے آغوش میں آنے کی دعوت دیتا ہو سب سے پہلے ان کو تفکر اور تدبر کا حکم دیتا ہو کہ مجھ کو قبول کرنے سے پہلے میری تعلیمات کو عقل اور برہان کی کسوٹی پر پرکھ لو اور خوب سوچ لو اور سمجھ لو جب تمہارا قلب مطمئن ہو جائے اس وقت اس دعوت کو قبول کرو۔

کما قال تعالیٰ:

﴿يَآاَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَآءَ كُمْ بُرْهَانٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَاَنْزَلْنَآ اِلَيْكُمْ نُوْرًا مُّبِيْنًا ۝﴾[1]

ترجمہ: ”اے لوگو! بلاشبہ اللہ کی طرف سے تمہارے پاس ایک دلیل آئی ہے اور ہم نے تمہاری ہدایت کیلئے ایک نہایت چمکتا ہوا نور اتارا ہے۔“

﴿يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ۝﴾[2]

ترجمہ: ”بیان کرتا ہے اللہ تعالیٰ اپنی نشانیوں کو تاکہ تم سمجھو۔“

﴿كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمُ الْاٰيٰتِ لَعَلَّكُمْ تَتَفَكَّرُوْنَ ۝﴾[3]

---

[1] القرآن: ۴/۱۷۴ [2] القرآن: ۲/۲۴۲ [3] القرآن: ۲/۲۱۹

ترجمہ: ''اسی طرح اللہ تعالیٰ تمہارے لئے اپنی آیتوں کو بیان کرتا ہے تاکہ تم غور اور فکر کرو۔''

اور اپنے مخالفین سے بھی دلیل اور برہان کا مطالبہ کرتا ہو۔ کما قال تعالیٰ:

﴿قُلْ هَاتُوا بُرْهَانَكُمْ إِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِينَ ﴾ ۱

ترجمہ: ''آپ ان سے کہہ دیجئے کہ اپنے دعویٰ پر دلیل لاؤ اگر سچے ہو۔''

﴿إِنْ عِنْدَكُمْ مِنْ سُلْطٰنٍ بِهٰذَا ؕ أَتَقُولُونَ عَلَى اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُونَ ﴾ ۲

ترجمہ: ''اس دعوے پر تمہارے پاس کوئی دلیل نہیں کیا اللہ پر ایسی بات کہتے ہو جس کا تمہیں علم نہیں۔''

ایسا مذہب صرف اور صرف مذہب اسلام ہے۔

قرآن کریم میں اس قسم کی آیتیں بکثرت موجود ہیں لہٰذا یہ کہنا کہ اسلام ایسا مذہب ہے کہ جو اپنی باتوں کو بے دلیل منوانا چاہتا ہے ایک کھلا ہوا بہتان ہے۔

ہر مذہب میں کچھ اصول ہوتے ہیں اور کچھ فروع اصول کم ہوتے ہیں اور فروع زیادہ ان کا فرداً فرداً سمجھانا دشوار ہے بلکہ تطویل لاطائل اور بے کار ہے، اصول سمجھ لینے کے بعد فروع کا سمجھنا دشوار نہیں اس لئے اللہ تعالیٰ کی توفیق سے اس ناچیز کو یہ خیال ہوا کہ اصول اسلام پر ایک ایسی مختصر اور جامع تحریر لکھ دی جائے کہ جس سے اسلام کے اصول اور عقائد کا عقل سلیم اور فطرت صحیحہ کے مطابق ہونا واضح ہو جائے اسلام کی تمام خصوصیتوں کو تو کون شمار کرا سکتا ہے۔

؂ لا يدرك الواصف المطرى خصائصه
وان يك سابقا فی كل ما وصفا

لیکن چند خصوصیتیں ہدیہ ناظرین کرتے ہیں۔

۱ القرآن:۲/۱۱۱ ۲ القرآن:۱۰/۶۸

خصوصیاتِ اسلام

پہلی خصوصیت

اسلام کی پہلی خصوصیت یہ ہے کہ اس کا ہر قانون عقل سلیم اور فطرت صحیحہ کے بالکل مطابق ہے۔ کما قال تعالیٰ:

﴿فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِیْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَیْهَا ؕ لَا تَبْدِیْلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ ؕ ذٰلِكَ الدِّیْنُ الْقَیِّمُ ۙ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا یَعْلَمُوْنَ ﴾[1]

ترجمہ: ”اللہ تعالیٰ نے لوگوں کو فطرت صحیحہ پر پیدا کیا اور اس اصلی اور جبلی فطرت کو کوئی بدل نہیں سکتا۔ یہی دین اسلام سیدھا دین ہے کہ جو اس اصلی فطرت کے مطابق ہے لیکن اکثر لوگ جانتے نہیں۔“

”وقال النبی صلی اللّٰہ علیه وسلم کل مولود یولد علی الفطرة فابواه یهودانه او ینصرانه او یمجسانه“[2]

ترجمہ: ”نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ہر بچہ فطرت اسلام ہی پر پیدا ہوتا ہے بعد میں ماں باپ اس کو یہودی یا نصرانی یا مجوسی بنا دیتے ہیں۔“

یہی وجہ ہے کہ جس قدر سائنس اور علم کو ترقی ہوتی جاتی ہے اسی قدر اسلام کے اصول چمکتے جاتے ہیں اور بڑے بڑے ڈاکٹر اور فلاسفر اور ہر قوم کے تعلیم یافتہ اور مقتدر افراد اسلام کے حلقہ بگوش بنتے جاتے ہیں غرض یہ کہ روز بروز اسلام کے غلاموں کا حلقہ وسیع ہوتا جاتا ہے اور عنقریب وہ زمانہ بھی آئے گا اور ضرور آئے گا کہ تمام

[1] القرآن: ۳۰/۳۰ [2] بخاری و مسلم بحوالہ مشکوۃ صفحہ ۲۱

مذاہب صفحۂ ہستی سے نیست ونابود ہو جائیں گے اور صرف ایک مذہب اسلام جو علم اور عقل کا مذہب ہے وہ باقی رہ جائے گا۔

اس وقت تک اگرچہ ساری دنیا اسلام کی حلقہ بگوش نہیں ہوئی لیکن علم اور سائنس کی ترقی نے سوائے اسلام کے تمام مذاہب کو متزلزل کر دیا عوام کا تو ذکر کیا ہر مذہب کے خواص اور علماء کو بھی اپنے مذہب کے اصول اور عقائد پر یقین اور اذعان نہیں رہا۔ یہود ہوں یا نصاریٰ، سماجی ہوں یا سناتن دھرمی سب یہ سمجھ چکے ہیں کہ ہمارا مذہب قابل عمل نہیں۔ سوچتے یہ ہیں کہ آخر جائیں کہاں؟ سوائے اسلام کے کوئی پناہ نظر نہیں آتی۔

انفرادی طور پر آئے دن بڑے بڑے فاضل اور سائنس داں اسلام میں داخل ہوتے ہی رہتے ہیں۔ لیکن جب کبھی قومی اور اجتماعی حیثیت سے تبدیل مذہب کا سوال اٹھتا ہے تو اسلام ہی کا نام زبان پر آتا ہے۔

دوسری خصوصیت

نفس کی انتہائی تمنا اور آرزو یہ ہے کہ اس کو ایسا طریقہ معلوم ہو جائے کہ جس سے حتی الوسع اپنے پروردگار کے حقوق عبودیت بھی بجا لا سکے اور اپنے بھائیوں کے حقوق اخوت بھی ادا کر سکے۔ سو الحمد للہ شریعت اسلامیہ نفس کی اسی انتہائی تمنا اور آرزو کے مطابق ہے۔ حقوق اللہ اور حقوق العباد کی جو تفصیل شریعت اسلامیہ نے کی ہے اس کا عشر عشیر بھی کسی ملت و مذہب میں ملنا دشوار بلکہ ناممکن ہے۔ شریعت اسلامیہ نے اگر ایک طرف خداوند کردگار کی معرفت اور عبودیت کے طریقے بتلائے تو دوسری طرف سیاست ملکیہ اور مدنیہ کے وہ اصول اور قوانین بتلائے کہ جن کو سن کر عقلاً عالم حیران ہیں۔

تیسری خصوصیت

شریعت اسلامیہ کا ہر حکم معتدل اور متوسط ہے افراط اور تفریط سے پاک ہے۔

توسط اور اعتدال اس کا طرۂ امتیاز ہے۔

کما قال تعالٰی:

﴿وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا﴾ [1]

ترجمہ: "ہم نے تم کو متوسط اور معتدل امت بنایا۔"

کہ جو افراط اور تفریط دونوں سے پاک ہے۔

نہ تو شریعت موسویہ کی طرح اس میں شدت اور سختی ہے اور نہ شریعت عیسویہ کی طرح سہولت ہے، شریعت اسلامیہ شدت اور خفت کے بین بین ہے۔ "وخیر الامور اوسطھا"

چوتھی خصوصیت

یہ ہے کہ مذہب اسلام تمام انبیاء کرام علیہم السلام کی شریعتوں کا خلاصہ اور لب لباب ہے۔ اور تمام حکماء کی حکمتوں کا عطر ہے۔ اسلام نے کوئی حکمت نہیں چھوڑی کہ جس کی تعلیم نہ دی ہو، کوئی خیر ایسی نہیں چھوڑی جس کا حکم نہ دیا ہو، کوئی شر ایسا نہیں چھوڑا جس سے منع نہ کیا ہو۔

"کما روی عن زید بن ارقم عن النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم قال: ما ترکت من خیر الا وقد امرتکم بہ وما ترکت من شر الا وقد نہیتکم عنہ" [2]

ترجمہ: "زید بن ارقم رضی اللہ تعالٰی عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ: میں نے کوئی خیر اور بھلائی نہیں چھوڑی کہ جس کا تم کو حکم نہ دیا ہو اور کوئی شر اور برائی ایسی نہیں چھوڑی کہ جس سے تم کو منع نہ کر دیا ہو۔"

---

[1] القرآن: ۲/۱۴۳ [2] رواہ الطبرانی، الحدیث

چنانچہ امام ربانی شیخ مجدد الف ثانی قدس اللہ سرہ اپنے مکتوب میں تحریر فرماتے ہیں کہ:

''چونکہ مقرر شدہ است کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جامع جمیع کمالات اسمائی وصفاتی است ومظہر جمیع انہا بر سبیل اعتدال کتابی کہ بروے منزل شدہ است۔ خلاصہ جمیع کتب سماوی است کہ بر سائر انبیاء علی نبینا وعلیہم الصلوٰۃ والتسلیمات منزل شدہ اند۔ والیضاً شریعتے کہ آں سرور راعطا فرمودہ اند زبدہ جمیع شرائع ماتقدم است، واعمالیکہ بمقتضائے ایں شریعت حقہ است منتخب از اعمال شرائع سابقہ است بلکہ از اعمال ملائکہ نیز ''صلوۃ اللّٰہ تعالٰی وسلامہ علی نبینا وعلیہم'' چہ بعضے از ملائکہ مامور برکوع اند وبعضے دیگر بسجود وبعضے بقیام وہمچنیں امم سابقہ بعضے بنماز بامداد مامور بودند وبعضے دیگر بنماز ہائے دیگر۔ دریں شریعت از اعمال امم سابقہ وملائکہ مقربہ خلاصہ وزبدہ آں را انتخاب کردہ مامور ساختہ اند۔ پس تصدیق بایں شریعت واتیان اعمال بمقتضائے آں فی الحقیقت تصدیق است بجمیع شرائع واتیان است باعمال مقتضیات آں شرائع۔ پس لاجرم مصدقان ایں شریعت خیر الامم باشند وہم چنیں تکذیب ایں شریعت وعدم اتیان بمقتضائے آں تکذیب است مر جمیع شرائع ماتقدم راو عدم اتیان است بمقتضائے آنہا وہم چنیں است انکار ازاں سرور علیہ الصلوٰۃ والسلام انکار از جمیع کمالات اسمائی وصفاتی وتصدیق او تصدیق است بجمیع آنہا پس ناچار منکر آں سرور ومکذب ایں شریعت بدترین امم باشد ازینجا است۔ اَلْاَعْرَابُ اَشَدُّ کُفْرًا وَّنِفَاقًا''

شعر:

محمد عربی کہ آبروئے ہر دوسر است
کسے کہ خاک درش نیست خاک بر سر او

''چونکہ یہ ثابت ہو چکا ہے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات بابرکات تمام کمالات اسمائی وصفاتی کی جامع ہے۔ اور ان سب کمالات کا مظہر اور آئینہ وہ

کتاب ہے کہ جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوئی یعنی قرآن کریم جو خلاصہ ہے ان تمام کتابوں کا جو تمام انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام پر نازل ہوئیں۔ اور اسی طرح آپ کو جو شریعت عطا کی گئی وہ تمام شریعتوں کا لباب اور عطر ہے اور جن اعمال اور عبادات کا آپ کی شریعت میں حکم دیا گیا وہ فقط شرائع سابقہ کا انتخاب نہیں بلکہ فرشتوں کے اعمال اور عبادتوں کا بھی انتخاب ہے کیونکہ بعض فرشتے مامور برکوع ہیں، بعضے مامور بسجود ہیں، بعضے مامور بقیام ہیں۔ اسی طرح امم سابقہ میں کسی کو فقط صبح کی نماز کا حکم تھا اور کسی کو دوسری نمازوں کا، مگر اس شریعت میں قیام اور قعود، رکوع اور سجود، ملائکہ اور امم سابقہ کی مختلف عبادتوں کا انتخاب جمع کر دیا گیا، پس اس شریعت پر عمل کرنا حقیقت میں تمام شریعتوں پر عمل کرنا ہے۔ اس شریعت کے اعمال اور عبادات کو بجا لانا تمام شریعتوں کے اعمال اور عبادتوں کو بجا لانا ہے۔ پس اس شریعت غراء کی تصدیق کرنے والے یقیناً خیر الامم ہوں گے۔ اور اس شریعت کی تکذیب کرنے والے تمام شریعتوں کی تکذیب کرنے والے سمجھے جائیں گے۔ اور سرور عالم محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا منکر تمام کمالات کا منکر ہوگا۔ اور آپ کا ماننے والا تمام کمالات کا ماننے والا ہوگا۔ اور جو شخص آپ کی شریعت کو نہ مانے گا وہ بدترین امم ہوگا جیسے اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ”یہ اعراب کفر اور نفاق میں بہت ہی شدید ہیں“ شعر:

محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم جو کہ دونوں جہاں کی عزت ہیں جو شخص ان کے در کی خاک نہیں بنا اس کے سر پر خاک ہو۔“ [1]

پانچویں خصوصیت

اسلام کی یہ ہے کہ دنیا کے تمام شہوت پرست اور ہوس ران اس کے سخت دشمن ہیں۔ اسلام نے نفس کے حقوق واجبہ کا تو پورا لحاظ رکھا ہے لیکن شہوتوں اور نفسانی

[1] مکتوب: ۷۹ ہفتاد ونہم، از دفتر اول

خواہشوں کا لحاظ نہیں رکھا بلکہ اسلام کی بنیاد ہی نفسانی شہوتوں کے خلاف ہے۔ اس لئے کہ اگر شہوتوں کو آزادی دے دی جائے تو پھر عالم کا تمام نظام درہم برہم ہو جائے۔ اور کسی کی جان اور مال، عزت اور عصمت کوئی شئے محفوظ نہ رہے بلکہ یہ دنیا انسانوں کی دنیا نہ رہے حیوانوں اور جانوروں کی دنیا بن جائے۔ افسوس کہ اس کی ابتداء ہو چکی ہے اور دن بدن ترقی پر ہے۔ شہوت پرستوں کے نزدیک دنیا ترقی کی طرف جارہی ہے اور غیرت منداس کو تزلزل اور تباہی سمجھ رہے ہیں۔ چونکہ اس عفیف اور پاکدامن مذہب میں شہوانی اور نفسانی لوگوں کے لئے کوئی پناہ نہیں قدم قدم پر پابندیاں ہیں کسی کے مال کی طرف ناجائز طریقہ سے ہاتھ نہ بڑھاؤ۔ کسی نامحرم کی طرف آنکھ مت اٹھاؤ۔ اس لئے شہوت پرستوں کی نظروں میں اسلام سے بڑھ کر کوئی مذہب مبغوض نہیں۔ لیکن ارباب بصیرت اور شیدایان عفت وعصمت کے نزدیک یہی اسلام کے حق ہونے کی بڑی دلیل ہے۔

قال تعالیٰ: ﴿اَمْ يَقُوْلُوْنَ بِهٖ جِنَّةٌ ۭ بَلْ جَاۗءَهُمْ بِالْحَقِّ وَاَكْثَرُهُمْ لِلْحَقِّ كٰرِهُوْنَ ۝ وَلَوِ اتَّبَعَ الْحَقُّ اَهْوَاۗءَهُمْ لَفَسَدَتِ السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ وَمَنْ فِيْهِنَّ ۭ بَلْ اَتَيْنٰهُمْ بِذِكْرِهِمْ فَهُمْ عَنْ ذِكْرِهِمْ مُّعْرِضُوْنَ ۝﴾[1]

ترجمہ: ”کیا عیاذاً باللہ آپ کے متعلق یہ خیال ہے کہ آپ کو جنون ہو گیا۔ حاشا وکلا آپ کو جنون کیسے ہوسکتا ہے آپ تو حق اور صداقت لے کر آئے ہیں۔ مجنون تو وہ ہے کہ جس کو حق سے نفرت ہو۔ اصل وجہ یہ ہے کہ یہ دین ان کی نفسانی خواہشوں کے خلاف ہے جس کو خدا نے ذرا بھی عقل دی ہے وہ سمجھ سکتا ہے کہ اگر حق لوگوں کی نفسانی خواہشوں کے تابع ہو جائے تو آسمان اور زمین اور ان کے باشندے سب تباہ اور برباد ہو

---

[1] القرآن: ۲۳/۷۰، ۷۱

جائیں۔ بلکہ ہم نے تو انکی ہدایت کے لئے حکمت اور نصیحت کا پیام بھیجا ہے مگر یہ لوگ اپنی نصیحت سے روگردانی کرنے والے ہیں۔"

واذا اتتك مذمتي من ناقص
فهي الشهادة لي باني كامل

ترجمہ: "جب تیرے پاس کسی ناقص العقل کی طرف سے میری مذمت پہنچے تو سمجھ لے کہ یہی میرے کامل ہونے کی دلیل ہے۔"

اذا رضيت عني كرام عشيرتي
فلا زال غضبانا علي لئامها

ترجمہ: "اگر شریف لوگ مجھ سے راضی ہیں تو پھر پروا نہیں خدا کرے یہ کمینے ہمیشہ مجھ سے ناراض ہی رہا کریں۔"

چھٹی خصوصیت

یہ ہے کہ اسلام کی ہر بات قول فیصل ہے، دل لگی اور ہزل نہیں۔ اس کی تمام تعلیم حکیمانہ ہے، شاعرانہ نہیں۔ نصیحت ہی نصیحت ہے کھیل اور تماشا نہیں۔

کما قال تعالیٰ: ﴿اِنَّهٗ لَقَوْلٌ فَصْلٌ ۝ وَّمَا هُوَ بِالْهَزْلِ﴾[1]

ترجمہ: "تحقیق یہ قول فیصل ہے ہنسی اور دل لگی سے اس کو کوئی تعلق اور[2] مس نہیں۔"

﴿يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَآءَتْكُمْ مَّوْعِظَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَشِفَآءٌ لِّمَا فِي الصُّدُوْرِ وَهُدًى وَّرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ ۝﴾[3]

---

[1] القرآن ۸۶/۱۳، ۱۴

[2] چونکہ بالہزل ما نافیہ کی خبر ہے تاکید کے لئے با زیادہ کی گئی ہے اور با اصل میں الصاق کے لئے ہے اس لئے ترجمہ میں الصاق کے معنی کی رعایت کی گئی "فافهم ذلك واستقم"

[3] القرآن: ۱۰/۵۷

ترجمہ: ''اے لوگو! تمہارے پروردگار کی طرف سے تمہارے لئے ایسی کتاب آئی ہے جو سراسر نصیحت ہی نصیحت ہے اور تمہارے باطنی امراض کیلئے شفاء ہے اور ماننے والوں کے لئے عجیب ہدایت اور رحمت ہے۔''

﴿اِنَّهٗ لَقَوْلُ رَسُوْلٍ كَرِيْمٍ ۝ وَّمَا هُوَ بِقَوْلِ شَاعِرٍ قَلِيْلًا مَّا تُؤْمِنُوْنَ ۝ وَلَا بِقَوْلِ كَاهِنٍ قَلِيْلًا مَّا تَذَكَّرُوْنَ ۝ تَنْزِيْلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ﴾ [1]

ترجمہ: ''یہ پیغام اللہ کا ایک محترم رسول لے کر آیا ہے یہ کسی شاعر یا کاہن کا قول نہیں۔ تم لوگ بہت ہی کم یقین کرتے ہو اور بہت ہی کم توجہ کرتے ہو، خوب سمجھ لو یہ اللہ رب العالمین کا اتارا ہوا کلام ہے۔''

﴿وَلَقَدْ جِئْنٰهُمْ بِكِتٰبٍ فَصَّلْنٰهُ عَلٰى عِلْمٍ هُدًى وَّرَحْمَةً لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ۝﴾ [2]

ترجمہ: ''ہم نے اپنے علم کے مطابق ان کو ایک مفصل کتاب دی ہے جو اہل ایمان کے لئے ہدایت اور رحمت ہے۔''

﴿وَذَرِ الَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا دِيْنَهُمْ لَعِبًا وَّلَهْوًا وَّغَرَّتْهُمُ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا﴾ [3]

ترجمہ: ''ایسے لوگوں کو چھوڑ جنہوں نے کھیل اور تماشے کو اپنا دین بنایا اور دنیوی زندگی نے ان کو دھوکہ میں ڈال کر مغرور اور مست بنایا۔''

ساتویں خصوصیت

یہ ہے کہ اسلام کے اصول میں کہیں تناقض اور کسی قسم کا تعارض نہیں۔ اسلام کے دو اصول جو سب سے اہم اور اقدم ہیں وہ توحید اور رسالت ہیں جس کا خلاصہ ''لا

[1] القرآن: ۷۰/۴۰ تا ۴۳ [2] القرآن: ۷/۵۲ [3] القرآن ۶/۷۰

الہ الا اللہ محمد رسول اللہ" ہے۔

دنیا کی اکثر قومیں ان دو اصولوں کی قائل ہیں۔ توحید میں تو کوئی اشکال ہی نہیں۔ یہود اور نصاریٰ بھی توحید کے قائل ہیں۔ اور ہندوستان کے ہندو اور آریہ بھی توحید کے مدعی ہیں۔ لیکن یہود نے حضرت عزیر علیہ السلام کو خدا کا بیٹا کہا اور نصاریٰ نے حضرت مسیح علیہ السلام کو خدا کا بیٹا کہا اور تثلیث کے قائل ہوئے۔ کون نہیں جانتا کہ ابنیت اور تثلیث کا عقیدہ توحید کے سراسر مباین ہے۔

ہندوؤں کی توحید کا یہ حال ہے کہ شجر اور حجر کو معبود اور مسجود بنائے ہوئے ہیں حتیٰ کہ بعض قومیں تو شرم گاہ کی پرستش کرتی ہیں۔ (العیاذ باللہ)

اللہ سبحانہ وتعالیٰ کا اگر حلم نہ ہوتا تو ان گستاخانہ کلمات کے بعد آسمان وزمین کا اپنی جگہ قائم رہنا ناممکن تھا۔ آریہ ہیں کہ خدا تعالیٰ کو واجب بالذات اور قادر مطلق سب کچھ مانتے ہیں لیکن اسی کے ساتھ مادہ اور روح کو بھی قدیم مانتے ہیں اور یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ عیاذاً باللہ خدا تعالیٰ نے نہ مادہ اور روح کو پیدا کیا ہے اور نہ ان کو فنا کر سکتا ہے اور نہ ان کی اقتضاء ذاتی کو بدل سکتا ہے، مسئلہ توحید مذہب کا بنیادی پتھر ہے اسی میں نصاریٰ اور یہود کا تحیر اور تہافت آپ نے دیکھ لیا۔

اسلام کا عقیدہ یہ ہے کہ خدا تعالیٰ وحدہ لاشریک لہ ہے نہ اس کا کوئی شریک اور سہیم ہے اور نہ کوئی اس کا بیٹا اور بیوی ہے۔ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے بندے اور اس کے پیغامبر ہیں۔ وہ قادر مطلق اور خالق کائنات ہے تمام کائنات کو اسی کی قدرت اور ارادہ نے پردہ عدم سے نکال کر وجود کا مستعار خلعت عطا کیا ہے جب چاہے گا اپنی عاریت کو واپس لے لے گا۔ کوئی ذرہ اس کی تخلیق اور تکوین سے باہر نہیں مادہ اور روح بھی اس کی مخلوق ہیں اور جس طرح تمام کائنات کا وجود اس کا عطیہ ہے اسی طرح کائنات کی تمام صفات اور خواص اور آثار بھی اسی کی قدرت اور ارادہ کے تابع ہیں۔ جس طرح وہ کائنات کے وجود کو چھین سکتا ہے اسی طرح ان کی صفات اور

آثار اور خواص کو بھی چھین سکتا ہے اور جس طرح چاہے ان میں تغیر اور تبدل کر سکتا ہے فافھم ذلك واستقم.

مسئلہ رسالت کے بارے میں اسلام کا عقیدہ یہ ہے کہ عصمت، نبوت کے لوازم میں سے ہے نبی اگر معصوم نہ ہو تو اس کی لائی ہوئی شریعت پر کیسے اطمینان ہو۔ یہود اور نصاریٰ کے نزدیک شرک اور بت پرستی اور گناہ کبیرہ بھی نبوت کے منافی نہیں۔ موجودہ توریت اور انجیل سے ثابت ہوتا ہے کہ عیاذاً باللہ انبیاء علیہم السلام نے جھوٹ بھی بولا اور زنا بھی کیا اور گوسالہ پرستی بھی کی وغیرہ ذلک۔ اہل اسلام کے نزدیک یہ سب جھوٹ ہے اور توریت اور انجیل کے محرف ہونے کی ایک بہت بڑی دلیل یہ بھی ہے کہ توریت میں حضرات انبیاء علیہم السلام کی طرف اس قسم کی باتیں منسوب کی گئی ہیں تفصیل اگر درکار ہو تو "ازالة الشكوك" مصنفہ مولانا کیرانوی رحمہ اللہ تعالیٰ کی مراجعت کریں۔ معلوم نہیں کہ نصاریٰ کے نزدیک جب انبیاء علیہم السلام سے جھوٹ صادر ہو سکتا ہے تو پھر ان کی شریعت پر اطمینان کی کیا صورت ہے نبی اور متنبی میں کیا فرق ہے اور علیٰ ہذا ہندو جن کو اوتار اور رشی اور مہاتما مانتے ہیں خود انہیں کی کتابوں میں ان کے شرمناک واقعات مذکور ہیں۔

غرض یہ کہ سوائے اسلام کے ہر مذہب کے اصول باہم مختلف اور متعارض ہیں۔ اور یہ اختلاف اور تعارض اس امر کی بین دلیل ہے کہ یہ مذاہب اللہ کی طرف سے نہیں بلکہ بندوں کے تراشیدہ ہیں۔

كما قال تعالىٰ: ﴿اَفَلَا يَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ ۭ وَلَوْ كَانَ مِنْ عِنْدِ غَيْرِ اللّٰهِ لَوَجَدُوْا فِيْهِ اخْتِلَافًا كَثِيْرًا ۝﴾[1]

تَرجَمَہ: "کیا یہ لوگ قرآن میں تدبر نہیں کرتے۔ اگر یہ قرآن سوائے خدا تعالیٰ کے کسی اور کی طرف سے ہوتا تو ضرور اس میں بہت کچھ

---

[1] القرآن: ۴/۸۲

اختلاف پاتے۔"

اب میں اس تمہید کے بعد تمام ارباب مذاہب کی خدمت میں یہ مختصر تحریر (جس کا نام میں نے "علم الکلام" تجویز کیا ہے) پیش کرتا ہوں۔ ہر شخص کو اپنے مذہب کے اصول اور عقائد معلوم ہیں۔ اصول اسلام کے ساتھ ان کا موازنہ کرے۔ حق کی تلاش اگر دل میں ہے اور خداوند ذوالجلال کے سامنے پیش ہونے کا ڈر دل میں ہے تو دل کو تعصب اور عناد سے پاک کر کے سوچ لے اور خوب اچھی طرح سوچ لے کہ کون سا مذہب عقل سلیم اور فطرت صحیحہ کے مطابق ہے۔ اور کون سا مذہب فلاح دارین اور دائمی نجات کا کفیل ہے۔ اور کس مذہب نے عقائد اور اعمال کی سنگین غلطیوں پر متنبہ کیا ہے اور کس مذہب نے خدا تک پہنچنے کے لئے ایسا راستہ صاف کر دیا ہے کہ چلنے والوں کے لئے کوئی روڑا بھی اٹکا نہیں رکھا، تہذیب اخلاق اور تدبیر منزل اور سیاست ملکیہ اور مدنیہ ہر اعتبار سے کامل اور مکمل ہے اور جامعیت کبری کا وصف اس میں نمایاں اور جلوہ گر ہے۔ جب کبھی کوئی سلیم العقل اور صحیح الفطرت اپنے قلب کو عناد اور تعصب سے پاک کر کے ان امور میں غور کرے گا تو انشاء اللہ العزیز خود اسی کے قلب میں اس کو یہ آواز سنائی دے گی۔ کہ "اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَاللّٰهِ الْاِسْلَامُ" یعنی ایسا کامل اور مکمل مذہب یقیناً اللہ کے نزدیک اسلام ہی ہے۔

اور اللہ تعالیٰ سے دعا کرتا ہوں کہ اے پروردگار عالم! مجھ کو اور میرے والدین اور اساتذہ کو اور میری اولاد اور اہل وعیال اور میرے بھائی بہنوں اور دوست احباب کو اسلام پر استقامت نصیب فرما۔ اور اس ناچیز تحریر کو قبول فرما۔ اور طالبان حق کے لئے مشعل راہ اور شمع ہدایت بنا، آمین ثم آمین۔

ربنا تقبل منا انك انت السميع العليم وتب علينا انك انت التواب الرحيم. فاطر السموات والارض انت وليي في الدنيا والاخرة توفني مسلما والحقني بالصالحين. آمين يا رب العالمين.

بسم اللہ الرحمن الرحیم

وجود باری عزاسمہ

ابتدائے آفرینش سے لے کر اس وقت تک عالم کے کسی خطہ پر کوئی لحظہ اور لمحہ ایسا نہیں گزرا کہ وہاں کے جن وانس اپنے پروردگار کو نہ جانتے ہوں اور اپنے لئے کسی خالق کا اقرار اور اعتراف نہ کرتے ہوں ہر زمانہ میں لاکھوں انسان ایسے گزرے ہیں اور اب بھی ہیں کہ جنہوں نے علم کا نام ونشان بھی نہیں سنا مگر یہ ضرور جانتے ہیں کہ ہمارا ایک خالق اور پروردگار ہے اور جب دنیا کے اسباب و وسائل سے مجبور اور مضطر ہو جاتے ہیں اس وقت خدا کو پکارتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کی مضطربانہ دعا کو سنتا ہے بڑے سے بڑا حادثہ دفعۃً دور ہو جاتا ہے اور تمام مادی اور ظاہری اسباب و وسائل کا یک لخت خاتمہ ہو جاتا ہے۔ اور یکا یک ناامیدی کے بعد امید اور آرزو نظروں کے سامنے آجاتی ہے۔ کما قال تعالیٰ:

﴿اَمَّنْ يُّجِيْبُ الْمُضْطَرَّ اِذَا دَعَاهُ وَيَكْشِفُ السُّوْٓءَ﴾ [1]

ترجمہ: ”کون ہے کہ جو مضطر کی دعا کو قبول کرتا ہے اور اس کی مصیبت کو دور کرتا ہے۔“

برائے سجدۂ محراب ابرو بدلہا ذوق ایماں آفریدند

اور اسی وجہ سے کہ حق تعالیٰ شانہ کی معرفت فطری ہے جو لوگوں کی فطرت اور جبلت میں مرکوز ہے۔ حق جل وعلا ارشاد فرماتے ہیں۔ کما قال تعالیٰ:

﴿فَاَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّيْنِ حَنِيْفًا ۭ فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِيْ فَطَرَ

---

[1] القرآن: ۲۷/۶۲

النَّاسَ عَلَيْهَا ۖ لَا تَبْدِيْلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ ۖ ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ ۙ ﴾ [۱]

ترجمہ: ''اپنے چہرہ کو اللہ کی عبادت کے لئے سیدھا کر ایک طرف ہو کر اور اللہ کی اس فطرت کو لازم پکڑ جس پر اللہ نے لوگوں کو پیدا کیا ہے اللہ کی بنائی ہوئی چیز میں تبدیلی ممکن نہیں یہی دین جو فطرت کے مطابق ہے ٹھیک دین ہے۔''

الغرض وجود باری عز شانہ کا اقرار بدیہی اور فطری امر ہے اور تمام بنی نوع انسان کا اجماعی مسلک ہے اسی وجہ سے حضرات انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کا نصب العین ہمیشہ توحید کی دعوت رہی اور جن کو سرے ہی سے اپنے خالق میں شک پیش آیا۔ ان سے نہایت تعجب سے یہ خطاب فرمایا۔ کما قال تعالیٰ:

﴿قَالَتْ رُسُلُهُمْ اَفِی اللّٰهِ شَكٌّ فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۖ ﴾ [۲]

ترجمہ: ''ان کے رسولوں نے کہا کہ کیا تم کو اللہ کے بارے میں بھی کسی قسم کا کوئی شک اور شبہ ہے کہ جو آسمانوں اور زمینوں کا بنانے والا ہے۔''

حق تو یہ ہے کہ حق تعالیٰ شانہ کا وجود آفتاب اور ماہتاب سے بڑھ کر بدیہی اور روشن ہے کسی دلیل اور برہان کا محتاج نہیں بلکہ اسی کا وجود کائنات کے لئے دلیل اور برہان ہے لیکن مزید اطمینان کے لئے دلیل بھی ذکر کئے دیتے ہیں۔ وھو ھذا۔

کون [۳] شخص ہے کہ یہ نہ جانتا ہو کہ ایک زمانہ وہ تھا کہ ہم پردۂ عدم میں مستور تھے اور عن قریب پھر ایک ایسا ہی زمانہ آنے والا ہے کہ اسی پردۂ عدم میں جا چھپیں

---

[۱] القرآن: ۳۰/۳۰ [۲] القرآن: ۱۴/۱۰

[۳] یہ دلیل حجۃ الاسلام مصنفہ حضرت مولانا محمد قاسم صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ اور شرح عقیدہ اصفہانیہ صفحہ ۱۵ للحافظ ابن تیمیہ قدس اللہ سرہ سے ماخوذ ہے

گے ہمارا وجود دو عدموں میں اس طرح گھرا ہوا ہے جس طرح نورِ زمین شب گزشتہ اور شب آئندہ کی دو ظلمتوں میں محصور ہے زمین پر نور کی یہ آمد ورفت باآواز بلند کہہ رہی ہے کہ یہ نور زمین کا ذاتی نہیں بلکہ مستعار اور عطاء غیر ہے اگر یہ نور زمین کا ذاتی ہوتا تو کبھی زائل نہ ہوتا۔ پس اسی طرح موت وحیات کی کشمکش اور وجود کی آمد ورفت اس امر کی واضح دلیل ہے کہ کائنات کا وجود ذاتی نہیں ورنہ عدم اور زوال کو کبھی قبول نہ کرتا۔ بلکہ جس طرح زمین کی روشنی آفتاب کا فیض ہے اور پانی کی گرمی آگ کا فیض ہے۔ اسی طرح ہمارا وجود بھی کسی ایسی ذات کا فیض اور عطیہ ہوگا کہ جس کا وجود اصلی اور خانہ زاد ہو اور وجود اس ذات کے لئے اس طرح لازم ہو جیسے آفتاب کے لئے نور۔ اور آگ کے لئے حرارت اور چار کے لئے زوجیت اور تین کے لئے فردیت لازم ہے۔ یہ ناممکن ہے کہ آفتاب ہو اور نور نہ ہو، آگ ہو اور حرارت نہ ہو، چار اور پانچ ہوں اور زوجیت اور فردیت نہ ہو۔ اسی موجود اصلی کو اہل اسلام اللہ تعالیٰ اور واجب الوجود اور خدا کہتے ہیں اس آیت میں اسی دلیل کی طرف اشارہ ہے۔

﴿كَيْفَ تَكْفُرُوْنَ بِاللّٰهِ وَكُنْتُمْ اَمْوَاتًا فَاَحْيَاكُمْ ۚ ثُمَّ يُمِيْتُكُمْ﴾ [1]

تَرجَمَہ: ”تم اللہ کا کیسے انکار کرتے ہو حالانکہ تم پہلے موجود نہ تھے پس خدا نے تم کو حیات عطا کی اور پھر تم کو فنا کردے گا۔“

حکیم فرفوریوس کا مقولہ ہے کہ: ”جو امور بداہت عقل سے ثابت ہیں منجملہ ان کے ایک مسئلہ ثبوت صانع کا بھی ہے جتنے حق پسند حکماء گزرے ہیں وہ اس مسئلہ کی بداہت کے قائل ہیں اور جو لوگ ثبوت صانع کی بداہت کے قائل نہیں وہ قابل ذکر نہیں اور نہ زمرہ حکماء میں شمار کئے جانے کے مستحق ہیں۔“

علامہ احمد بن مسکویہ رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ: ”حکماء میں سے کسی سے بھی

---

[1] القرآن: ۲/ ۲۸

یہ منقول نہیں کہ اس نے ثبوت صانع کا انکار کیا ہو اور نہ کسی نے اس کا انکار کیا کہ جو صفات کمال انسان اور بشر میں بقدر طاقت بشری پائی جاتی ہیں جیسے جود وکرم، قدرت وحکمت وہ باری تعالیٰ میں علی وجہ الکمال پائی جاتی ہیں۔ (انتہی کلامہ)

میں کہتا ہوں کہ آج تک کسی عاقل اور سمجھدار نے وجود صانع کا انکار نہیں کیا اور جب بھی کسی نادان نے وجود صانع کا انکار کیا تو عقلاء نے اس کو مہمل اور ساقط الاعتبار گردانا، جو شخص عقلاء عالم کے متفقہ فیصلہ کا انکار کرے اس کو سن لینا چاہئے کہ وہ عقل سے بے بہرہ ہے۔

علامہ احمد بن مسکویہ رحمہ اللہ تعالیٰ نے الفوز الاصغر میں وجود صانع پر دو دلیلیں ذکر فرمائی ہیں:

اول: یہ کہ ہر جسم طبعی کے لئے حرکت ضروری ہے کوئی جسم طبعی ایسا نہیں کہ جو متحرک نہ ہو اور ہر متحرک کے لئے ایک محرک کا ہونا ضروری اور لازمی ہے کہ جس پر تمام حرکات کا سلسلہ ختم ہوتا ہو، وہی محرک اول ان تمام اجسام واعیان کا خالق اور صانع ہوگا۔ اور چونکہ یہ امر بدیہی ہے کہ محرک متحرک کے سوا اور علاوہ ہونا چاہئے اس لئے یہ ثابت ہو گیا کہ وہ محرک اول متحرک نہیں ہوسکتا۔ کیونکہ محرک اول کے لئے یہ ضروری ہے کہ وہ حرکت سے پاک اور منزہ ہو ورنہ اگر محرک اول متحرک ہوگا تو پھر اس کے لئے ایک اور محرک ماننا پڑے گا۔ اور جب ایک اور محرک نکل آیا تو جس کو محرک اول فرض کیا تھا وہ محرک اول نہ رہا اس کی اولیت جاتی رہی۔ نیز اس سے یہ بھی ثابت ہو گیا کہ محرک اول جسم نہیں ہوسکتا۔ اس لئے کہ ہر جسم کے لئے متحرک ہونا لازمی اور ضروری ہے۔

دوم: یہ کہ عالم کا تغیر اور تبدل، فناء اور زوال اس امر کا شاہد عدل ہے کہ عالم کی کسی شئے کا وجود بالذات نہیں، جس شئے کا بھی وجود ہے وہ بالعرض ہی ہے۔ اور تمام حکماء کا اس پر اتفاق ہے کہ جو چیز بھی کسی شئے میں بالعرض پائی جائے گی وہ کسی شئے میں بالذات ضرور پائی جائے گی۔ کیونکہ جو شئے عارضی ہوتی ہے وہ کسی کا اثر ہوتی ہے اور

ہر اثر حرکت ہے لہٰذا ضروری ہوا کہ ان تمام آثار اور حرکات کا سلسلہ ایسے موثر حقیقی اور محرک اول پر جا کر ختم ہو کہ جو کسی کا اثر نہ قبول کرتا ہو بلکہ وہی سب میں موثر ہو اور کوئی اثر اور کوئی متاثر اس موثر حقیقی کے حیطہ تاثیر سے باہر نہ ہو جو بھی موجود ہو وہ اسی کی فیض تاثیر سے وجود میں آیا ہو۔

سب جانتے ہیں کہ اعراض کا وجود ذاتی نہیں بلکہ جواہر اور اجسام کے سہارے سے ہے اگر اعراض کا جواہر سے تعلق منقطع ہو جائے تو تمام اعراض اسی وقت معدوم اور فنا ہو جائیں ایک لحہ کے لئے باقی نہیں رہ سکتے۔ کیونکہ اعراض کا وجود عرضی یعنی ناقص اور ضعیف ہے جواہر کے تابع ہے مگر اعراض کے معدوم ہونے سے جواہر کا معدوم ہونا لازم نہیں۔

پس جس طرح جواہر کے مقابلہ میں اعراض کا وجود محض عارضی ہے۔ اسی طرح واجب الوجود کے مقابلہ میں جواہر اور اجسام کے وجود کو سمجھو کہ کوئی حقیقت نہیں رکھتا۔ اگر ایک لحہ کے لئے اس بے نیاز واجب الوجود کے فیض تاثیر کو ان جواہر اور اجسام سے منقطع فرض کر لیا جائے تو یکلخت تمام کے تمام معدوم ہو جائیں اور فنا کے گھاٹ اتر جائیں کسی جوہر اور جسم کا نام و نشان بھی باقی نہ رہے اسی کی فیض تاثیر سے ان کا وجود قائم ہے ؎

ہمہ نیستند انچہ ہستی توئی پناہ بلندی و پستی توئی
توئی آنکہ یک برقرار ایستی قرار ہمہ ہست بر نیستی

جب یہ ثابت ہو گیا کہ کائنات میں جو بھی وجود ہے وہ اسی کا عنایت کیا ہوا ہے۔ تو یہ بھی ثابت ہوا کہ وجود اس مبدا فیاض کا ذاتی ہوگا کہ جب اس کی ذات کا تصور کیا جائے تو ساتھ ہی ساتھ اس کے وجود کا بھی تصور ہوتا ہو اسی وجہ سے اسی کو واجب الوجود کہتے ہیں۔ (کذا فی الفوز الاصغر)

حدوثِ عالم

یہ مسلم قاعدہ ہے کہ ہر فرع کی انتہا کسی اصل پر اور ہر مستعار کا اختتام کسی معطی پر ہونا چاہئے ورنہ اگر وہ اصل ہی معدوم ہو تو فرع کہاں سے موجود ہو۔ اگر معطی ہی نہ ہو تو عطا کہاں سے آئے۔ عدد کے سلسلہ کو دیکھ لیجئے کہ اول سے لے کر الی غیر النہایۃ چلا گیا ہے مگر تمام سلسلہ کا انقطاع واحد پر ہو جاتا ہے۔ کیونکہ اول ایک اصل ہے اور باقی اعداد اس کی فرع ہیں۔ اعداد کا سلسلہ بدون اول کے کسی طرح نہیں چل سکتا کیونکہ اعداد کے تمام مراتب اپنے وجود میں اول کے محتاج ہیں۔ اور اول ان سب کے لئے اصل ہے۔

آفتاب کو دیکھ لیجئے کہ ہزاروں اور لاکھوں مکانات کو نور عطا کرتا ہے اس لئے عالم اسباب میں تمام روشنیوں کا سلسلہ آفتاب پر ختم ہو جاتا ہے۔

اور یہ ابھی معلوم ہو چکا ہے کہ موجودات عالم میں سے کسی شئے کا وجود اصلی اور خانہ زاد نہیں بلکہ مستعار اور عطاء غیر ہے۔

پس اگر سلسلہ عالم کو قدیم اور غیر متناہی مانا جائے تو فرع کا بدون اصل کے اور عطا کا بدون معطی کے ہونا لازم آتا ہے پس جیسے آفتاب اور آگ پر نور اور حرارت کے تمام سلسلے ختم ہو جاتے ہیں ایسے ہی واجب الوجود پر وجود کے تمام سلسلے ختم ہو جاتے ہیں۔

کما قال تعالیٰ: ﴿وَاَنَّ اِلٰی رَبِّكَ الْمُنْتَهٰى﴾ [1] [2]

شیخ عبدالحق محدث دہلوی رحمہ اللہ تعالیٰ تکمیل الایمان صفحہ ۴ میں لکھتے ہیں۔

---

[1] القرآن: ۵۳/۴۲

[2] ماخوذ از تقریر دلپذیر مصنفہ حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمہ اللہ تعالیٰ

واجب الوجود یعنی وجود وے از ذات وے بود نہ از غیر والا محتاج بود بغیر و ہر چہ چنیں بود خدائی را نشاید و معنی لفظ خدا خود آیندہ است یعنی خود بخود شوندہ البتہ باید کہ منتہائے سلسلہ موجودات بیک ذاتی بود کہ از خود باشد والا ہم چنیں تا بے نہایت رود و ایں معقول نباشد۔

ترجمہ: ”حق تعالیٰ واجب الوجود ہے یعنی اس کا وجود ذاتی ہے کسی غیر سے مستفاد نہیں ورنہ وہ غیر کا محتاج ہوگا اور جو غیر کا محتاج ہو وہ لائق خدائی نہیں اور لفظ خدا خود اس پر دلالت کرتا ہے اس لئے کہ خدا کے معنی خود بخود موجود ہونے والے کے ہیں لہٰذا ضروری ہوا کہ تمام موجودات کا سلسلہ ایسی موجود ذاتی پر ختم ہو کہ جو خود بخود موجود ہو ورنہ اسی طرح یہ سلسلہ الی غیر النہایۃ چلا جائے گا جو سراسر خلاف عقل ہے۔“

جو شئے بھی وجود کے ساتھ موصوف ہوگی۔ دو حال سے خالی نہیں یا تو اس کا وجود اپنی ذاتی اقتضاء سے ہوگا اور کسی غیر اور واسطہ کو اس میں بالکل دخل نہ ہوگا۔ ایسی شئے کو واجب الوجود کہتے ہیں یا اس کا وجود اور عدم دونوں برابر ہوں گے ایسی شئے کو ممکن الوجود کہتے ہیں۔

جب یہ ثابت ہو گیا کہ موجودات کی عقلاً دو ہی قسمیں ہو سکتی ہیں۔ واجب اور ممکن لہٰذا ضروری ہوگا کہ ممکنات کا سلسلہ کسی ایسی ذات پر ختم ہو کہ جس کا وجود بتقضائے ذات ہو اور اسی کو واجب الوجود اور خدا کہتے ہیں۔ اگر آپ واجب الوجود کو نہیں مانتے تو یہ بتلایئے کہ ان ممکنات میں وجود کہاں سے آیا۔ ممکنات تو خود بخود بغیر کسی واجب الوجود کے موجود نہیں ہو سکتیں۔

حدوثِ عالم کی دوسری دلیل

یہ دلیل چند مقدمات پر موقوف ہے۔

پہلا مقدمہ: یہ کہ عالم کی ہر شئے اپنی صفات میں نہایت ناقص اور کمزور ہے۔ انسان باوجود اشرف المخلوقات ہونے کے آج تک روح، عقل، قوت متذکرہ کی حقیقت سے واقف نہ ہوسکا اور نہ یہ منکشف ہوا کہ وہ کس طرح کلیات اور جزئیات کا ادراک کر لیتا ہے۔ اور کس طرح صور اشیاء کو یاد کرتا ہے اور ان کو بھول جاتا ہے۔ اور کس طرح وہ چیزیں اس کو بعد چندے یاد آجاتی ہیں۔

دوسرا مقدمہ: یہ ہے کہ قدیم اور ازلی ہونا حقیقت میں وجود کے اعلیٰ ترین مرتبہ کا نام ہے اور ازلی کہلاتا ہے۔

تیسرا مقدمہ: یہ ہے کہ موصوف کا وجود جس حد تک کامل ہوگا اسی حد تک اس کی صفات بھی کامل ہوں گی۔ اور جس درجہ موصوف کا وجود ناقص ہوگا اسی درجہ صفات بھی ناقص ہوں گی۔ چنانچہ باری عزاسمہ اپنی تمام صفات میں اسی وجہ سے کامل اور اکمل ہے کہ اس کا وجود اصلی اور خانہ زاد، اعلیٰ اور اکمل ہے۔ غرض یہ کہ یہ ناممکن ہے کہ وجود تو کسی شئے کا کامل ہو اور صفات اس کی ناقص رہیں یا وجود ناقص ہو اور صفات کامل رہیں۔

لہٰذا یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ عالم کا وجود تو کامل یعنی قدیم ہو اور صفات ناقص رہیں کیونکہ عالم کا وجود اگر کامل یعنی قدیم ہوتا ہے تو اس کی صفات ایسی ضعیف اور ناقص یعنی حادث ہرگز نہ ہوتیں۔ خلاصہ یہ ہے کہ جس شئے کا وجود اصلی اور خانہ زاد ہوگا تو اس کے تمام اوصاف یقیناً نہایت کامل ہوں گے۔ اس لئے کہ کوئی شئے اپنے لئے باوجود مستقل اور کامل الوجود ہونے کے نقص کو نہیں چاہتی۔

حدوثِ عالم کی تیسری دلیل

نیز کسی ثانی کا وجود بدون اول کے اور ثالث کا بدون ثانی کے اور رابع کا بدون ثالث کے عقلاً محال ہے۔ اعداد کا سلسلہ خواہ کتنا ہی طویل کیوں نہ ہو مگر بدون اول

کے کسی طرح نہیں چل سکتا۔ اول ہی اگر معدوم ہے تو تمام سلسلہ معدوم ہے اس لئے کہ یہ تمام سلسلہ، اول کے پائے جانے پر موقوف ہے۔ جب اصل ہی معدم ہوگئی تو فرع کہاں سے ہو۔

ٹھیک اسی طرح اگر اس عالم کے لئے کوئی ابتداء نہ ہو تو یہ تمام سلسلہ وجود ہی میں نہیں آسکتا اور قرآن عزیز میں بھی اس دلیل کی طرف اشارہ ہے۔

﴿لَقَدْ اَحْصٰهُمْ وَعَدَّهُمْ عَدًّا﴾ [1]

ترجمہ: ”حق تعالیٰ نے ان سب کا احاطہ کر لیا اور سب کو خوب اچھی طرح شمار کیا ہوا ہے۔“

﴿وَاَحَاطَ بِمَا لَدَيْهِمْ وَاَحْصٰى كُلَّ شَيْءٍ عَدَدًا﴾ [2]

ترجمہ: ”حق تعالیٰ ان کے پاس کی تمام چیزوں کو محیط ہے۔“

ہاں! اول اور اصل پائے جانے کے بعد کسی سلسلہ کا الی غیر النہایۃ ممتد ہونا عقلاً جائز ہے جیسا کہ ظاہر ہے۔ اسی وجہ سے[3] اہل اسلام نعمائے جنت کے ابدی ہونے کے قائل ہیں اور ازلیت کے قائل نہیں۔

حدوثِ عالم کی چوتھی دلیل

نیز اگر سلسلہ عالم کو جانب ماضی ازلی اور غیر متناہی مانا جائے تو سوال یہ ہے کہ یہ غیر متناہی سلسلہ کس طرح گزرا اور آج کے دن کی نوبت کس طرح آئی۔ اور غیر متناہی سلسلہ اس وقت معین تک کیسے پہنچا کیونکہ غیر متناہی سلسلہ ختم ہو کر کسی حد تک پہنچنا سراسر خلاف عقل ہے۔

---

[1] القرآن: ۱۹/ ۹۴ [2] القرآن: ۷۲/ ۲۸

[3] كذا قاله ابن حزم فی الملل والنحل ۱/ ۱۸

[4] یہ استدلال امام غزالی رحمہ اللہ تعالیٰ کے استاذ امام الحرمین رحمہ اللہ تعالیٰ کا ہے جس کو امام غزالی رحمہ اللہ تعالیٰ نے احیاء العلوم میں ذکر کیا ہے۔ جلد ۲ صفحہ ۹۲، اتحاف

ہفتہ کی نوبت جمعہ گزرنے کے بعد آسکتی ہے اور رمضان کی نوبت شعبان کے بعد آسکتی ہے، سال دوم جب آئے گا کہ جب سال اول ختم ہو جائے۔

اسی طرح سلسلہ عالم اگر قدیم ہو تو آج کے دن کی نوبت جب ہی آسکتی ہے جب یہ سارا غیر متناہی سلسلہ گزر جائے اور بالکل منقطع ہو جائے اور ظاہر ہے کہ غیر متناہی سلسلہ ختم ہونا سراسر خلاف عقل ہے کیونکہ کسی سلسلہ کو غیر متناہی بھی ماننا اور پھر اس کو کسی حد تک منتہی اور مختتم بھی ماننا بداہۃً دو متضاد چیزوں پر ایمان لانا ہے۔[۱]

حدوثِ عالم کی پانچویں دلیل

عقل اور مشاہدہ دونوں اس امر کی شاہد ہیں کہ عالم کی ہر شئے محدود اور متناہی ہے۔ کوئی زمان اور مکان ایسا نہیں کہ جس کی ابتدا اور انتہا نہ ہو۔ دن اور رات، مہینہ اور ہفتہ، سال اور قرن ہر ایک کی ابتداء اور انتہاء ہے اور علی ہذا ہر مکان کی مسافت اور ساخت محدود اور متعین ہے۔ غرض یہ کہ عالم کے تمام بسائط اور مرکبات محدود اور متناہی ہیں۔ بسائط کا محدود ہونا تو ظاہر ہے اور جو مرکب ہے وہ محدود اور متناہی اجزاء سے مرکب ہے لہٰذا جب عالم کے تمام اجزاء بسائط اور مرکبات محدود اور متناہی ہیں تو عالم بھی ضرور محدود اور متناہی ہوگا اور ضرور اس کی ابتداء اور انتہا ہوگی کیونکہ عالم انہی بسائط اور مرکبات کے مجموعہ کا نام ہے یہ کیسے ممکن ہے کہ اجزاء تو متناہی ہوں اور مجموعہ غیر متناہی ہو جائے۔[۲]

حدوثِ مادّہ وروح کی پہلی دلیل

❶ مادہ اور روح اگر قدیم اور غیر مخلوق اور واجب لذاتہ ہیں اور ان کا وجود اصلی اور ذاتی اور خانہ زاد ہے عطاء نہیں تو سماجی جماعت کو لازم ہے کہ وہ مادہ کو اپنا خدا تسلیم کرے کیونکہ خدا کہتے ہیں اس کو ہی کہ جو خود موجود ہو اس کا وجود دوسرے کا فیض نہ ہو

---

[۱] شرح احیاء العلوم: جلد ۲ صفحہ ۹۱ [۲] ملل ونحل لابن حزم جلد ۱ صفحہ ۱۴

جیسا کہ لفظ خدا خود اس پر دلالت کرتا ہے۔

اور سوامی دیانند ستیارتھ پرکاش کے صفحہ ۲۸ باب اول پر لکھتے ہیں (۹۹) سویمبھوا چونکہ وہ آپ سے ہی ہے کسی نے اس کو کبھی پیدا نہیں کیا اس لئے اس پر ماتما کا نام سویمبھو ہے۔

کسی عدد کا زوج یا فرد ہونا فقط اس پر موقوف ہے کہ وہ برابر کے دو حصوں پر منقسم ہوسکتا ہے یا نہیں عدد کی زوجیت یا فردیت دیگر صفات پر موقوف نہیں۔

آفتاب کا آفتاب ہونا اس کے مصدر نور ہونے پر موقوف ہے اس کے مستدیر یا دیگر صفات کے ساتھ موصوف ہونے پر نہیں۔

آتش کا آتش ہونا فقط اس کے مصدر حرارت ہونے پر موقوف ہے سرخ یا سبز ہونے پر نہیں۔ ٹھیک اسی طرح خدا کا خدا ہونا فقط اس کے خود موجود ہونے پر موقوف ہے۔ صفات کے ساتھ موصوف ہونے پر نہیں۔

نیز مادہ اور روح اگر باوجود قدیم اور واجب الذات ہونے کے خدا نہ ہوئے تو ان کے خدا ہونے سے کون شے مانع ہے۔ دوسرے یہ بتلایئے کہ خدا میں تمام اوصاف کمال پائے جانے کا کیا منشا ہے اور خدا ان اوصاف کمال کے ساتھ کس وجہ سے موصوف ہے اور کیا وہ منشا مادہ اور روح میں پایا جاتا ہے یا نہیں۔

حدوثِ مادّہ وروح کی دوسری دلیل

ہر شئے کے اوصاف اور کمالات وجود کے تابع ہوتے ہیں جس درجہ وجود وسیع اور قوی ہوگا اسی درجہ میں صفات اور کمالات بھی وسیع اور قوی ہوں گی۔ پس اگر مادہ اور روح قدیم اور واجب ہوتے تو ان کی صفات بھی قدیم اور واجب ہوتیں لیکن روح اور مادہ کا شوائب حدوث اور ہر قسم کے نقائص اور عیوب سے ملوث ہونا خود بتلا رہا ہے کہ ان کا وجود اصلی اور ذاتی نہیں اس لئے کہ کوئی شئے کامل الوجود ہو کر کبھی اپنے لئے کسی

قسم کا نقص اور عیب گوارا نہیں کرسکتی مادہ اور روح میں بالفرض اگر کوئی عیب نہ ہوتو ان کا ایک جسمانی قفس میں بند رہنا کچھ کم عیب ہے؟ اگر ان کا وجود اصلی تھا تو یہ حدود اور قیود کہاں سے لاحق ہو گئے۔

اور مادہ اور روح نے باوجود واجب بالذات ہونے کے تقیید اور تحدید کیسے گوارا کی اور باوجود قدیم اور مستقل الوجود ہونے کے ان حدود اور قیود سے کیوں آزاد نہ ہوئے اور کیوں دوسروں کے محکوم اور دست نگر بن گئے۔ جب یہ دونوں اپنے وجود اور بقاء میں خدا کے محتاج نہیں تو صفات اور دیگر عوارض میں کیوں خدا کے محتاج ہوئے۔

اور اگر بالفرض کسی شئے کا باوجود واجب بالذات ہونے کے ناقص اور محدود ہونا جائز رکھا جائے تو عیاذاً باللہ خدا کا بھی باوجود واجب بالذات ہونے کے ناقص اور محدود ہونا جائز ہوگا۔ اس لئے کہ جس طرح آپ کے نزدیک روح اور مادہ واجب بالذات ہیں اسی طرح خدا بھی واجب بالذات ہے۔

پس اگر ایک واجب بالذات کا محدود ہونا اور نقص اور عیب سے آلودہ ہونا جائز ہے تو دوسرے واجب کے لئے عیب اور نقص کا لاحق ہونا کس دلیل سے ناجائز ہے "فَاْتِ بِاٰیَةٍ اِنْ کُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِیْنَ."

وللّٰہ در القائل حیرانم کہ روح بشر را چہ ضرورت پیش آمد کہ خود مسخر او گردید آیا نتواند گفت کہ اے مدعی خداوندی عبث خیال می بندی کہ واجب الوجودی را مسخر گردانی۔ آیا نمی دانی کہ نہ اور او جودے و بقائے دادی و نہ منتے نہادی ترا با وچہ کار۔ اگر گویند کہ ہر چند روح انسان واجب الوجود و فارغ از قیود و بری از تغیر و زوال و مقدس از اندوہ و ملال ست امار واست کہ در و صفے از اوصاف احتیاج بخدا داشتہ باشد و بنا بر آں خود را مسخر نگاشتہ۔

گوئیم حاجت اصلی آنست کہ در وجود و بقائے خود رو دہد۔ چوں دریں ہر دو

امر استغنائے کلی دست داد آں امر زاید موجب اضطرار نتواند بود۔ اھ۔[1]

حدوثِ مادّہ وروح کی تیسری دلیل

نیز اگر تنوعات عالم کی علت مادہ قدیم اور اس کی حرکت قدیمہ ہے تو احوال عالم میں اختلاف کیوں ہے؟ آفتاب اور ماہتاب اور کواکب سیارہ کی روشنی اور حرکت میں فرق کیوں ہے حالانکہ سب افلاک کا اقتضاء طبعی ایک ہے اور علی ہذا بسائط کا اقتضاء طبعی ایک ہے تاہم ان میں بھی ایک بین اور کھلا ہوا اختلاف ہے۔ زمین کہیں سے نرم اور کہیں سے نہایت ہی سخت، کہیں بلند اور کہیں پست۔

مادہ منوی کا ایک مدت تک رحم میں رہ کر علقہ بننا اور پھر ایک میعاد مقرر پر اس کا مضغہ بننا پھر ہڈیوں پر گوشت کا چڑھنا، پھر چند روز کے بعد اس خاکدان کدورت سے ایک جیتے جاگتے ذی ہوش صاحب سمع وبصر انسان کا ظاہر ہونا نہایت ہی تعجب خیز اور حیرت انگیز ہے۔

ایسی عجیب وغریب صنعتوں کو مادہ اور اس کی حرکت کی طرف منسوب کرنا ایسا ہی ہے کہ جیسے کوئی شخص کسی خوش نما مصحف کو دیکھ کر یہ کہے کہ یہ تمام زریں نقوش اور خوش نما حروف مادہ سیاہی اور اس کی حرکت کا نتیجہ ہیں۔ اور کسی کاتب اور خوشنویس کے ارادہ اور اختیار اور حرکت قلم کو اس میں کوئی دخل نہیں، پس اگر عالم کا وجود بدون صانع کے ممکن ہے تو یہ بھی ضرور ممکن ہوگا کہ مکان بدون معمار کے خود بن سکے اور کتاب بدون کاتب کے اور کپڑا بدون بننے والے کے اور زیورات بدون سنار کے خود بخود تیار ہوسکیں۔ وقال تعالٰی:

﴿وَفِیْٓ اَنْفُسِكُمْ ۭ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ ۝﴾[2]

ترجمہ: ”کیا تم اپنے اندر بھی غور نہیں کرتے جس سے اپنے خالق کو

---

[1] خلعت الہنود: صفحہ ۱۴
[2] القرآن: ۵۱/۲۱

پہچان سکو۔"

﴿ یٰٓاَیُّھَا الْاِنْسَانُ مَا غَرَّكَ بِرَبِّكَ الْكَرِیْمِ ۝ الَّذِیْ خَلَقَكَ فَسَوّٰىكَ فَعَدَلَكَ ۝ فِیْٓ اَیِّ صُوْرَةٍ مَّا شَآءَ رَكَّبَكَ ۝ ﴾ [1]

تَرْجَمَہ: "اے انسان کس چیز نے تجھ کو خدائے کریم کے بارہ میں دھوکہ میں مبتلا کر دیا جس نے تجھ کو پیدا کیا۔ پھر تجھ کو ٹھیک بنایا اور پھر تجھ کو معتدل القامۃ کیا اور جس صورت میں چاہا تجھ کو اس صورت میں ترکیب دی۔"

﴿ اَكَفَرْتَ بِالَّذِیْ خَلَقَكَ مِنْ تُرَابٍ ثُمَّ مِنْ نُّطْفَةٍ ثُمَّ سَوّٰىكَ رَجُلًا ۝ ﴾ [2]

تَرْجَمَہ: "کیا تو اس ذات کا انکار کرتا ہے جس نے تجھ کو مٹی سے اور پھر نطفہ سے پیدا کیا اور پھر تجھ کو ایک صحیح سالم انسان بنا دیا۔"

ایک ہی پانی سے نباتات اور اشجار کو سیراب کیا جاتا ہے مگر بایں ہمہ پھلوں میں اختلاف ہے رنگ اور بو میں ہر ایک علیحدہ ہے مزہ بھی ہر ایک کا جدا ہے۔ مادہ ایک ہے اور آثار مختلف ہیں۔ قال تعالیٰ:

﴿ وَهُوَ الَّذِیْٓ اَنْشَاَ جَنّٰتٍ مَّعْرُوْشٰتٍ وَّغَیْرَ مَعْرُوْشٰتٍ وَّالنَّخْلَ وَالزَّرْعَ مُخْتَلِفًا اُكُلُهٗ وَالزَّیْتُوْنَ وَالرُّمَّانَ مُتَشَابِهًا وَّغَیْرَ مُتَشَابِهٍ ﴾ [3]

تَرْجَمَہ: "خدا ہی نے تمہارے لئے مختلف قسم کے باغ پیدا کئے چھتریوں والے اور بغیر چھتریوں والے اور کھجوریں اور مختلف کھانے کی چیزیں اور زیتون اور انار کوئی ملتا جلتا اور کوئی جدا۔"

﴿ هُوَ الَّذِیْٓ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً لَّكُمْ مِّنْهُ شَرَابٌ وَّمِنْهُ

---

[1] القرآن: ۸۲/۶ تا ۸ [2] القرآن: ۱۸/۳۷ [3] القرآن: ۶/۱۴۱

شَجَرٌ فِيْهِ تُسِيْمُوْنَ ۝ يُنْبِتُ لَكُمْ بِهِ الزَّرْعَ وَالزَّيْتُوْنَ وَالنَّخِيْلَ وَالْاَعْنَابَ وَمِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ ۝﴾ [1]

ترجمہ: ”اسی نے تمہارے لئے آسمان سے پانی اتارا اسی سے تمہارا پینا ہے، اسی سے درخت ہے، جس میں تم جانور چراتے ہو اور اسی پانی سے تمہارے لئے کھیتی، زیتون، کھجور، انگور اور ہر قسم کے پھل اگاتا ہے۔ بے شک ان باتوں میں خدا کی وحدانیت کی کھلی دلیل ہے مگر ان کے لئے جو فکر کرتے ہیں۔“

﴿وَفِي الْاَرْضِ قِطَعٌ مُّتَجٰوِرٰتٌ وَّجَنّٰتٌ مِّنْ اَعْنَابٍ وَّزَرْعٌ وَّ نَخِيْلٌ صِنْوَانٌ وَّغَيْرُ صِنْوَانٍ يُّسْقٰى بِمَآءٍ وَّاحِدٍ ۚ قف وَنُفَضِّلُ بَعْضَهَا عَلٰى بَعْضٍ فِي الْاُكُلِ ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ ۝﴾ [2]

ترجمہ: ”اور زمین میں مختلف قطعے ہیں۔ ایک دوسرے سے ملے ہوئے ہیں اور انگوروں کے باغ ہیں اور کھیتیاں ہیں اور کھجوریں ہیں جڑ ملی اور بغیر ملی ان سب کو ایک ہی پانی سے سیراب کیا جاتا ہے مگر ہم اپنے ارادہ اور مشیت سے ایک میوے کو دوسرے میوہ پر فضیلت دیتے ہیں، اس میں نشانیاں ہیں سمجھنے والوں کے لئے۔“

یعنی جب مادہ اور طبیعت ایک ہے تو پھر پھلوں کے مزوں میں کیوں اختلاف ہے۔

حکایت

ایک عالم نے ایک مرتبہ اللہ تعالیٰ سے یہ دعا کی کہ اے اللہ دہریین اور طبیعیین

[1] القرآن: ۱۶/۱۰، ۱۱ [2] القرآن: ۱۳/۴

یعنی مادہ پرستوں کے مقابلہ میں کوئی ایسی دلیل القاء فرما کہ جس میں کوئی فلسفی تشکیک نہ جاری ہو سکے تو خواب میں دیکھا کہ ایک شخص یہ آیت پڑھ رہا ہے۔

﴿مَرَجَ الْبَحْرَيْنِ يَلْتَقِيٰنِ ۝ بَيْنَهُمَا بَرْزَخٌ لَّا يَبْغِيٰنِ ۝﴾[1]

ترجمہ: ''اللہ تعالیٰ نے دو دریا جاری کئے ایک شیریں اور ایک شور ہے۔ ایک دوسرے پر چڑھ نہیں سکتے۔ ناممکن ہے کہ ایک کا پانی دوسرے میں مل جائے۔''[2]

طبیعت اور نیچر کے پرستار بتلائیں کہ پانی کی طبیعت تو اتصال اور اختلاط کو مقتضی ہے پھر وہ کونسی شئے ہے کہ جو آب شیریں کو آب شور کے ساتھ مل جانے سے مانع ہے وہ صرف قدرت ربانیہ اور مشیت الٰہیہ ہے کہ جو دونوں کو ملنے سے مانع ہے۔[3]

حدوثِ مادّہ وروح کی چوتھی دلیل

نیز پرستاران مادہ اس کے قائل ہیں کہ عالم کے تمام تنوعات اور تغیرات سب حادث ہیں اور ماہرین طبقات الارض اس پر متفق ہیں کہ حیوانات اور نباتات کی تمام انواع پہلے موجود نہ تھیں لاکھوں برس پردہ عدم میں مستور رہنے کے بعد وجود اور ظہور میں آئیں۔

پس اگر ان تمام تنوعات اور تغیرات کی علت مادہ اور اس کی حرکت ہیں اور یہ تمام تنوعات اس کے معلول ہیں تو سوال یہ ہے کہ جب علت قدیم ہے تو معلول کیوں حادث ہے۔ عقلاً یہ ناممکن ہے کہ علت تو موجود ہو اور معلول موجود نہ ہو اگر علت کے وجود سے معلول کا وجود لازم اور ضروری نہ ہو تو وہ علت علت نہیں معلول کا وجود علت

---

[1] القرآن: ۵۵/۱۹، ۲۰

[2] کذا فی ترجیح اسالیب القرآن علی اسالیب الیونان: صفحہ ۱۰۵

[3] ماخوذ از رسالہ حمیدیہ للعلامۃ جسر الطرابلسی رحمہ اللہ تعالیٰ

کے تابع ہوتا ہے۔ اگر علت حادث ہوگی تو معلول بھی حادث ہوگا اور اگر علت قدیم ہوگی تو معلول بھی قدیم ہوگا لہٰذا اگر ان تنوعات اور تغیرات عالم کی علت مادہ قدیمہ اور اس کی حرکت قدیمہ ہوتی تو یہ تنوعات اور تغیرات بھی ضرور قدیم ہوتے یہ کیونکر ممکن ہے کہ علت تو قدیم ہو اور معلولات اس کے حادث ہوں۔ آخر جب ان تنوعات اور تغیرات کی علت قدیم تھی تو یہ تمام اشیاء لاکھوں برس کیوں پردہ عدم میں مستور رہیں۔ اور کس چیز نے ان کو موجود ہونے سے روک دیا اور آج ہی کیوں موجود ہوئیں اس سے پہلے کیوں نہ موجود ہو گئیں۔

اور اگر یہ کہا جائے کہ علت قدیمہ تو موجود تھی مگر یہ اتنا طویل زمانہ استعداد کے انتظار میں گزرا کہ معلولات میں استعداد پیدا ہو جائے تو وجود میں آئیں تو ہم سوال کرتے ہیں کہ یہ استعداد اس سے قبل کیوں نہ موجود ہوگئی جب اس استعداد کی علت بھی وہی مادہ قدیمہ ہے جب استعداد کی علت موجود تھی تو استعداد کیوں نہ پیدا ہوئی۔

آپ یہ بھی نہیں کہہ سکتے کہ مادہ نے اپنے ارادہ اور اختیار سے جو زمانہ چاہا وہ مقرر کر دیا اس لئے کہ آپ مادہ کے لئے نہ علم اور شعور کے قائل ہیں اور نہ اس کے لئے کسی قسم کا ارادہ اختیار مانتے ہیں اور اگر بالفرض کوئی سائنس دان مادہ کے لئے علم اور ادراک کا قائل بھی ہو جائے تو پھر دشواری یہ ہے کہ مادہ کے غیر متناہی ذرات میں سے ہر ایک ذرہ کے لئے الگ الگ علم اور ادراک ماننا پڑے گا کہ جو عالم کی بے شمار انواع و جزئیات کی اپنے اپنے اوقات مخصوصہ میں موجود ہونے کی علت بن سکے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ مادہ کے ہر ہر ذرہ میں اتنی قوت موجود ہے کہ وہ عالم کے ان محیر العقول تغیرات کا شعور اور ادراک کر سکے ایک ذرہ بے مقدار کی تو ہستی ہی کیا ہے۔ عالم کے تمام عقلاء اور حکماء ان تغیرات اور تنوعات کے علت دریافت کرنے سے عاجز اور درماندہ ہیں۔ خلاصہ کلام یہ کہ دو ہی صورتیں ہیں یا تو تنوعات عالم کو قدیم مانا جائے لیکن تغیرات اور تنوعات کا حادث ہونا علاوہ اظہر من الشمس ہونے کے مخالف کو بھی

تسلیم ہے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ یہ کہا جائے کہ مادہ بھی حادث ہے اور تنوعات بھی حادث ہیں سب کے سب پردۂ عدم میں تھے کسی ایسی کامل ذات نے ان کو پردہ عدم سے نکال کر وجود کا خلعت عطا کیا ہے کہ جس کے علم اور قدرت کی کوئی حد اور نہایت نہیں اس نے اپنے علم اور اختیار سے جس نوع کے لئے جو وقت مناسب جانا اس وقت اس کو موجود کر دیا اور یہی ہمارا مدعا ہے۔

حدوثِ مادّہ وروح کی پانچویں دلیل

آریوں کے عقیدہ کی بنا پر لازم آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا علم مادہ اور روح کے متعلق کامل اور تام نہ ہو کیونکہ جو شئے ان کے زعم میں اس کے حیطۂ قدرت اور دائرہ تخلیق و تکوین سے باہر ہے اس کا علم تام کیسے حاصل ہو سکتا ہے۔

حق تو یہ ہے کہ مادہ کا حادث ہو، خود اس کی حقیقت ہی میں ذرا غور کرنے سے سمجھ میں آ سکتا ہے اس لئے کہ مادہ محض ایک قوت اور استعداد کا نام ہے جس کی وجہ سے دوسری شئے بالفعل موجود ہو جاتی ہے۔

حدوثِ مادّہ وروح کی چھٹی دلیل

یہ سب کے نزدیک مسلم ہے کہ ہر جسم مادہ اور صورت سے مرکب ہے پس اگر مادہ قدیم اور صورت حادث ہو تو جسم کا حادث اور قدیم سے مرکب ہونا لازم آتا ہے۔

حدوثِ مادّہ وروح کی ساتویں دلیل

عالم کی کسی شئے میں اتنا تغیر اور تبدل نہیں جتنا کہ مادہ میں ہے مادہ کے تغیرات کی کوئی حد اور نہایت نہیں اور ظاہر ہے کہ مادہ شعور اور ادراک، اختیار اور ارادہ سے بالکل بے بہرہ ہے۔ لہٰذا یہ تو ممکن نہیں کہ ان تغیرات کی علت مادہ کا ارادہ بتلایا جائے اس لئے یہی کہا جائے گا کہ کوئی اور ہی علیم وقدیر ہے کہ جس کی قدرت اور مشیت کی

انگلیوں پر یہ بے چارہ عاجز مادہ ناچ رہا ہے جس طرح چاہتا ہے اس کو نچاتا ہے جس صورت میں چاہتا ہے اس کو تبدیل کرتا ہے اور کسی کی مجال نہیں کہ دم مار سکے افسوس ہے کہ اب بھی اس کے حدوث میں شک ہے ؎

کرا زہرہ آنکہ از بیم تو
کشاید زباں جز بہ تسلیم تو
زباں تازہ کردن باقرار تو
نینگیختن علت از کار تو

لہٰذا حق یہ ہے کہ سب سے پہلے مادہ ہی کو حادث ماننا چاہئے کیونکہ مادہ تو تغیر اور تبدل کا محل ہی ہے واجب اور قدیم کی ذات میں تغیر اور تبدل ناممکن ہے کائنات عالم میں مادہ سے بڑھ کر کسی میں تغیر اور تبدل نہیں پایا جاتا معلوم ہوا کہ مادہ سے بڑھ کر کوئی چیز حادث نہیں۔

حدوثِ مادّہ وروح کی آٹھویں دلیل

جس شئے کا وجود اصلی اور ذاتی ہوگا اس میں تغیر اور تبدل بھی ضرور محال ہوگا۔ اس لئے کہ تغیر جب ہی ممکن ہوسکتا ہے کہ جب کسی غیر کو اس کے وجود میں دخل ہو اور ظاہر ہے کہ قدیم اور واجب کے وجود میں کسی کا دخل ممکن نہیں ورنہ واجب واجب نہ رہے گا۔ پس اگر مادہ اور روح واجب اور قدیم ہوتے تو ان میں کسی قسم کا تغیر ناممکن ہوتا۔

حدوثِ مادّہ وروح کی نویں دلیل

عالم کی جو شئے بھی ہے وہ محدود و متناہی ہے اجرام علویہ ہوں یا سفلیہ، بسائط ہوں یا مرکبات سب کے سب محدود اور متناہی ہیں لہٰذا ان کا مادہ بھی محدود اور متناہی ہوگا۔ پس اگر مادہ اور روح واجب ہوتے تو غیر محدود اور غیر متناہی ہوتے کیونکہ واجب

کے لئے یہ ضروری ہے کہ وہ غیر محدود اور غیر متناہی ہو۔

حدوثِ مادّہ وروح کی دسویں دلیل

واجب الوجود کے لئے یہ ضروری ہے کہ اس کی تمام صفات بالفعل ہوں۔ واجب میں کوئی مرتبہ استعداد اور قابلیت کا نہیں ہوتا استعداد اور قابلیت کا اطلاق وہاں ہوتا ہے کہ جہاں کوئی صفت اور کمال بالفعل موجود نہ ہو بلکہ زمانہ آئندہ میں اس کے حصول کی توقع اور اس کے ظہور کا انتظار ہو۔ واجب الوجود کا وجود جس طرح بتقضائے ذات ہوتا ہے اسی طرح اس کی صفات اور کمالات بھی بتقضائے ذات ہوتے ہیں اور ذات کی طرح بالفعل ہوتے ہیں۔ استعداد اور قابلیت خاصہ ممکن کا ہے اور مادہ کی تو حقیقت ہی استعداد اور قابلیت ہے۔ وہ کیسے واجب اور قدیم بن سکتا ہے۔ اور علی ہذا روح کی بھی صفات بالفعل نہیں۔ البتہ روح میں بہت سے کمالات کی استعداد اور قابلیت موجود ہے جو مجاہدہ اور ریاضت سے حاصل ہو سکتے ہیں اور یہی استعداد اور قابلیت اس کے حادث ہونے کی دلیل ہے۔

حدوثِ مادّہ وروح کی گیارہویں دلیل

واجب الوجود کے لئے یہ ضروری ہے کہ وہ بسیط ہو ترکیب اور مقدار سے پاک اور منزہ ہو۔

اور حکماء حال اس پر متفق ہیں کہ مادہ عالم اور بساط عنصریہ میں اجزاء مقداریہ موجود ہیں۔ سو اول تو مرکب ہونا ہی خود دلیل حادث ہونے کی ہے۔ اور دوسرے یہ کہ وہ اجزاء مقداریہ متناہی ہیں اور متناہی ہونا خود واجب الوجود ہونے کے منافی ہے۔

حدوثِ مادّہ وروح کی بارہویں دلیل

صفحۂ کائنات پر علم اور ادراک، فہم اور فراست، قدرت اور ارادہ میں کوئی شئے

انسان سے بڑھی ہوئی نظر نہیں آتی لیکن باایں ہمہ انسان ایک مچھر کا پر بھی نہ بنا سکا۔ مگر نہ معلوم اس بے شعور اور بے جان مادہ سے عالم کے یہ صنائع اور بدائع کس طرح بن سکے۔

حدوثِ مادّہ وروح کی تیرہویں دلیل

واجب الوجود کے لئے عقلاً یہ ضروری ہے کہ اس میں استغناء و بے نیازی کی صفت علی وجہ الکمال موجود ہو۔ لیکن جب اس عالم پر نظر ڈالتے ہیں تو اس صفت کا کہیں نام و نشان نہیں پاتے۔ جدھر دیکھتے ہیں احتیاج اور لاچاری، عاجزی اور درماندگی ہی نظر آتی ہے۔ مادہ بغیر اجزاء مقدار یہ اور روح کے کچھ نہیں کر سکتا اور روح بغیر مادہ کے کچھ نہیں کر سکتی۔ آفتاب کا کام کھیتوں کو پکانا ہے۔ مگر بغیر آب و ہوا کی اعانت اور امداد کے ایک دانہ کو بھی نہیں پکا سکتا۔

روح میں تھوڑی بہت کچھ عقل و شعور ہے لیکن کیا اتنے عقل و شعور سے کہیں وجوب کا مرتبہ حاصل ہو سکتا ہے اور بے چارہ مادہ تو بالکل ہی شعور اور ادراک سے عاری ہے نہ سنتا ہے نہ دیکھتا ہے بالکل اندھا اور بہرا ہے مادہ سے بڑھ کر دنیا میں کوئی شئے فقیر اور محتاج نہیں۔ پھر نہ معلوم کس طرح اس اندھے اور بہرے اور اپاہج کو واجب اور قدیم مان لیا۔ حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام نے آزر سے یہی تو کہا تھا۔

﴿يَآأَبَتِ لِمَ تَعْبُدُ مَا لَا يَسْمَعُ وَلَا يُبْصِرُ وَلَا يُغْنِي عَنْكَ شَيْئًا ۝﴾ [1]

تَرجَمہ: ”اے باپ! اس چیز کی کیوں پرستش کرتے ہو جو نہ سنتی ہے اور نہ دیکھتی ہے اور نہ کچھ کام آتی ہے۔“

---

[1] القرآن: ۴۲/۱۹

حافظ ابن تیمیہ قدس اللہ سرہ اپنے اس شعر کو کثرت سے پڑھا کرتے تھے۔

والفقر لی وصف ذات لازم ابدًا
کما الغنی ابدًا وصف له ذاتی

ترجمہ: ''فقر اور احتیاج میری ذات کا وصف لازم ہے جیسا کہ غنا اور بے نیازی خدا تعالیٰ کا وصف ذاتی ہے۔''

اور اسی مضمون کو اس ناچیز نے ان اشعار میں ادا کیا ہے

تو غنی مطلقی اے ذوالجلال
من فقیر مطلقم بے قیل و قال
تو کریمی من گدائے مطلقم
تو عزیزی من ذلیل مطلقم
فقر و حاجت عین ممکن بے مقال
چوں غنا عین خدائے ذوالجلال

حدوثِ مادّہ وروح کی چودہویں دلیل

جس طرح ممکن اپنے وجود میں واجب سے کمتر ہے اسی طرح یہ بھی ضروری ہے کہ ممکن کی صفات بھی واجب اور قدیم کی صفات سے ادنی اور کمتر ہوں۔

اب عبرت کا مقام یہ ہے کہ وہ مادہ کہ جس کی حرکت سے ہم موجودہ ہوئے اس میں تو شعور اور ادراک اختیار اور ارادہ کا کہیں نام ونشان نہیں اور ہم میں یہ سب صفتیں موجود ہیں۔ کیا یہ بات عقل میں آسکتی ہے کہ جو شخص کسی شئے کا خود مالک نہ ہو وہ دوسروں کو کہاں عطا کرسکتا ہے۔

حدوثِ مادّہ وروح کی پندرہویں دلیل

مادہ اور روح اگر قدیم اور واجب لذاتہ ہوں تو اس کے یہ معنی ہوں گے کہ مادہ اور

روح کا وجود خود بخود ہے اور ان دونوں کو اپنے وجود میں خدا تعالیٰ کی کوئی حاجت اور ضرورت نہیں۔ اب سوال یہ ہے کہ کیا کوئی شئے کسی وقت خدا سے بھی مستغنی اور بے نیاز ہوسکتی ہے۔ وہ خدا ہی کیا ہوا جس کی کسی کو حاجت نہ ہو۔

حدوثِ مادّہ وروح کی سولہویں دلیل

سب جانتے کہ انسان محبّ اور عاشق اسی شئے کا ہوتا ہے جو اس کے پاس نہ ہو اس لئے کہ عشق اور محبت کی بنا حاجت پر ہے اور حاجت کی بنیاد عدم پر ہے لہٰذا اگر روح کا وجود ذاتی ہوتا تو روح خدا پر فریفتہ اور عاشق نہ ہوتی اور یہ بھی سب کو معلوم ہے کہ محبت تین وجہ سے ہوتی ہے۔ جمال کی وجہ سے یا کمال کی وجہ سے یا مال و منال کے سبب سے۔ معلوم ہوا کہ روح اپنی ذات سے جمال اور کمال سب سے عاری ہے۔ اسی بنا پر بعض عارفین نے خوب کہا ہے۔

؎ زندہ معشوق است عاشق مردہ
جملہ معشوق است عاشق پردہ

وجود خداوندی کے انکار سے ترجیح بلا مرجح کا استحالہ

جب یہ ثابت ہوگیا کہ مادہ اور روح اور عالم کی تمام انواع و جزئیات سب کے سب حادث ہیں یعنی عدم سے نکل کر وجود میں آئے ہیں تو بتلایا جائے کہ وہ کون ذات ہے کہ جس نے ان کے وجود کو ان کے عدم پر ترجیح دی اور ان تمام ممکنات اور حادثات کو عدم کی ظلمت اور تاریکی سے نکال کر وجود کی روشنی میں لایا۔ اگر یہ کہا جائے کہ خود بخود عدم سے نکل کر وجود میں آگئے تو یہ ترجیح بلا مرجح ہے جو تمام عقلاء کے نزدیک محال ہے کیا یہ ممکن ہے کہ جس ترازو کے دونوں پلے بالکل برابر اور ہم وزن ہوں کسی قسم کا فرق نہ ہو اور پھر خود بخود بلا کسی وجہ کے ایک پلہ جھک جائے جب تک ان وجوہ اور اسباب میں سے کوئی وجہ نہ پائی جائے جن سے پلہ جھک جاتا ہے، خود

بخود بلا کسی وجہ کے ایک پلہ جھک جانا عقلاً محال ہے اسی کو ترجیح بلا مرجح کہتے ہیں جو عقلاء کے نزدیک محال ہے اور ماہرین فلسفہ جدید تو حوادث عالم میں اتفاقات فطرت کے وجود کے بھی قائل نہیں یعنی جو امور بلا سبب ظاہری کے اتفاقاً پیش آجاتے ہیں ان کے قائل نہیں حالانکہ ان کو اتفاقی محض ظاہر کے اعتبار سے کہا جاتا ہے ورنہ درحقیقت ان کا ظہور کسی نہ کسی سبب اور کسی نہ کسی قانون فطرت کی وجہ سے ہوتا ہے جس کو ہم قصور عقل کی وجہ سے معلوم نہیں کر سکتے۔

پس جب یہ ثابت ہو گیا کہ ممکنات کا خود بخود عدم سے نکل کر وجود میں آنا ناممکن ہے کیونکہ اس صورت میں ترجیح بلا مرجح لازم آتی ہے معلوم ہوا کہ کوئی ذات ایسی ضروری ہے کہ جس نے اپنے ارادہ اور اختیار سے ان کے وجود کو ان کے عدم پر ترجیح دی اور ہر ممکن اور حادث کو ایک عجیب و غریب وجود عطا کیا اسی کو تمام عقلاء خدا اور حضرات انبیاء کی شریعتوں میں اللہ تعالیٰ کہتے ہیں۔ کما قال تعالیٰ:

﴿هَلْ اَتٰى عَلَى الْاِنْسَانِ حِيْنٌ مِّنَ الدَّهْرِ لَمْ يَكُنْ شَيْئًا مَّذْكُوْرًا ۝﴾[1]

ترجمہ: ”بے شک انسان پر ایک وقت ایسا گزرا ہے کہ جس میں وہ کوئی شئے نہ تھا کہ جس کا ذکر کیا جائے۔“

وقال تعالیٰ:

﴿اَمْ خُلِقُوْا مِنْ غَيْرِ شَيْءٍ اَمْ هُمُ الْخٰلِقُوْنَ ۝﴾[2]

ترجمہ: ”کیا خود بخود بن گئے یا خود ہی اپنے بنانے والے ہیں۔“

تعجب کی بات ہے کہ سائنس دانوں نے اس موقعہ پر اپنے ایک مشہور قاعدہ کو چھوڑ دیا۔ وہ یہ کہ ہم بلا مشاہدہ کسی چیز کو نہیں مانتے ہم پوچھتے ہیں کہ آپ نے مادہ اور اس کی حرکت قدیمہ کا کب مشاہدہ کیا ہے اور کون کر سکتا ہے اگر یہ کہیں کہ ہم

---

[1] القرآن: ۷۶/۱ [2] القرآن: ۵۲/۳۵

نے اگرچہ مادہ کی حرکت کا تو مشاہدہ نہیں کیا لیکن اس کے آثار یعنی تنوعات کے مشاہدہ سے موثر پر استدلال کرتے ہیں تو ہم کہیں گے کہ یہی استدلال بعینہٖ اہل اسلام کا ہے کہ جب انہوں نے عالم کے تنوعات میں ایسے عجیب و غریب آثار دیکھے کہ جن کے فہم اور ادراک سے عقل حیران ہے تو سمجھ لیا کہ ان تنوعات کو وجود عطا کرنے والی ضرور ایسی ہستی ہے کہ جو کمال علم اور قدرت اور کمال اختیار کے ساتھ موصوف ہے اور یہ بھی سمجھ لیا کہ ایسے عجیب وغریب تغیرات اور تنوعات کو ایک بےشعور اور بے حس چیز یعنی مادہ کی طرف منسوب کرنا کھلی ہوئی نادانی ہے۔ عجیب تماشہ ہے کہ مادہ میں نہ تو علم اور ادراک ہے اور نہ کسی قسم کا شعور اور احساس ہے بالکل اندھا اور بہرہ اور گونگا سب ہی کچھ ہے مگر اس کی کارسازیاں ایسی عجیب و غریب ہیں کہ جن کی حکمتوں کی کوئی انتہا نہیں عقلاء اور حکماء ان مصنوعات کی حکمتیں بیان کرتے کرتے تھک گئے تمام عقلاء نے مل کر جو کچھ اب تک معلوم کیا اس کو غیر معلوم شدہ کے ساتھ وہ نسبت بھی نہیں جو قطرہ کو دریا کے ساتھ ہو۔ کسی مکان کو دیکھ کر یہ تو معلوم ہو جاتا ہے کہ اس کا بنانے والا کوئی ضرور ہے اور بڑا حکیم اور دانا ہے۔ لیکن یہ ناممکن ہے کہ مکان کو دیکھ کر مکان بنانے والے کی حقیقت اور کنہ اور اس کے تمام اوصاف معلوم ہو جائیں مثلاً یہ کہ اس کا بنانے والا سپید ہے یا سیاہ اس کا قد کتنا لمبا ہے۔ صورت اور شکل اس کی کیسی ہے، کہاں رہتا ہے۔ عقل سے اتنے ہی اوصاف معلوم ہو سکتے ہیں جہاں تک عقل کی رسائی ہے۔

اسی طرح اہل اسلام یہ کہتے ہیں کہ اس کون و مکان کے دیکھنے سے ہم کو یہ تو یقیناً معلوم ہو گیا کہ اس کا بنانے اور پیدا کرنے والا کوئی ضرور ہے اور عقل سے یہ بھی معلوم کر لیا کہ اس زمین و آسمان کا بنانے والا کمال علم اور کمال قدرت وغیرہ کے ساتھ موصوف ہے۔ لیکن اس خداوند ذوالجلال کی حقیقت اور کنہ اور اس کے تمام اوصاف کا ادراک حیطہ عقل سے باہر ہے وہاں تک عقل کی رسائی نہیں۔ اس کے ادراک سے ہم

قاصر اور عاجز ہیں۔

آخر مادہ جس کو آپ تمام کائنات کی اصل مانتے ہیں اس کی حقیقت سے آپ ناواقف ہیں اور فلاسفہ کو خود اس کا اقرار ہے۔ عقل اور حیات سمع اور ابصار جو علم طبیعی کا خاص موضوع ہیں انہیں مسائل میں ماہرین علم طبیعیات حیران اور سرگرداں ہیں بڑی بڑی طویل اور ضخیم کتابیں ان مسائل پر تصنیف کر ڈالیں مگر حقیقت تک رسائی نہ ہوئی۔ ماہرین طبیعیات حقائق اشیاء کے معلوم کرنے کی کوشش میں سرگرم ہیں مگر جس نتیجہ پر پہنچتے ہیں تحقیق اور تجربہ اس کو غلط ثابت کر دیتا ہے۔ اخیر میں مجبور ہو کر ناواقفیت کا اقرار کرتے ہیں پس جب کہ محسوس اور مشاہد چیزوں کی حقیقت معلوم کرنے سے قاصر ہیں تو خداوند ذوالجلال کی حقیقت اور کنہ کیسے معلوم ہو سکتی ہے۔ عقل جب اپنے ہی دائرہ میں قاصر اور ماندہ ہے تو جو شئے عقل سے بالاتر ہو وہاں عقل کی درماندگی اور بے چارگی کا کیا پوچھنا؟

اہل اسلام اور مادہ پرستوں کی ایک دلچسپ مثال

علامہ حسین آفندی طرابلسی رسالہ حمیدیہ میں لکھتے ہیں کہ اہل اسلام اور مادہ پرستوں کی مثال ان دو شخصوں کی سی ہے کہ جو کسی نہایت رفیع الشان محل میں داخل ہوئے جس میں مختلف کمرے اور متعدد نشست گاہیں ہیں اور ہر کمرہ میں اعلیٰ درجہ کے تخت اور بہترین فرش بچھے ہوئے ہیں اور طرح طرح کے ساز و سامان سے آراستہ ہیں۔ ہر چیز اس میں قرینہ سے لگی ہوئی ہے۔ کمروں کے سامنے سیر گاہیں اور طرح طرح کے سرسبز و شاداب چمن بھی ہیں درمیان میں حوضیں اور نہریں بھی جاری ہیں۔ الحاصل یہ دونوں شخص اس محل میں داخل ہوئے اب ایک شخص نے دیکھ کر یہ کہا کہ گو میں نے اس کے بنانے والے کو نہیں دیکھا اور نہ اس کی پوری حقیقت اور کنہ سے واقف ہوں اور نہ اس محل کی صنعتوں کو اچھی طرح سمجھ سکتا ہوں۔ لیکن اتنا ضرور جانتا

ہوں کہ اس کا بنانے والا کوئی بہت ہی بڑا مدبر اور ذی اختیار اور حکمتوں کی رعایت کرنے والا ہے۔ اگرچہ میری عقل نارسا اپنے قصور کی وجہ سے ان حکمتوں کا پورا پورا ادراک نہ کر سکے لیکن اس کے مدبر اور حکیم ہونے میں کوئی شک نہیں اور جو کچھ اس نے بنایا ہے وہ ضرور حکمت اور مصلحت پر مبنی ہے۔

دوسرا شخص چاروں طرف دیکھنے لگا یکایک اس کو ایک پہاڑ کہ جس میں چشمے بھی جاری ہیں نظر آیا کچھ دیر سوچتا رہا اور اس کے بعد یہ کہنے لگا کہ ان سب کی علت یہ ہے کہ قدیم زمانہ سے اس پہاڑ کی جانب سے ایک ہوا چلا کرتی تھی پس وہ ہوا اسی طرح سے لاکھوں سال چلتی رہی اور اس کی وجہ سے مختلف مقامات سے پتھر اور مٹی حرکت کر کے ایک جگہ جمع ہو گئے اور سالہا سال ان پر بارش ہوتی رہی حتیٰ کہ ایک طویل عرصہ کے بعد اس تدریجی اور اتفاقی اجتماع سے یہ محل خود بخود تیار ہو گیا۔ اور وہ پانی کہ جو چشموں سے آتا تھا اس کا راستہ اتفاق سے اس محل میں پڑ گیا جس سے یہ حوضیں اور نہریں جاری ہو گئیں رہا یہ امر کہ یہ ساز و سامان کہاں سے آیا اور کس نے اس کو اس قرینہ سے لگایا۔ سو اس کی وجہ یہ ہے کہ گزشتہ زمانہ میں ایک قافلہ اس پہاڑ پر آ کر اترا تھا اور وہ حسب الاتفاق اپنا ساز و سامان بھول کر چلا گیا اس کے بعد ایک زمانہ تک ہوائیں چلتی رہیں اور رفتہ رفتہ سامان کمروں میں خود بخود آراستہ ہو گیا۔

اب آپ ذرا غور فرمائیں کہ عقل سلیم رکھنے والے حضرات اس شخص کی نسبت کہ جس نے اس تعمیر کو ایک مدبر اور ذی ہوش کی طرف منسوب کیا ہے کیا حکم دیں گے اور اس شخص کی نسبت کہ جو اس تعمیر کو مادۂ ترابی اور اس کی حرکت کی طرف منسوب کرتا ہے کیا فرمائیں گے۔ انتہی۔

﴿اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَذِكْرٰى لِمَنْ كَانَ لَهٗ قَلْبٌ اَوْ اَلْقَى السَّمْعَ وَهُوَ شَهِیْدٌ﴾[1]

---

[1] القرآن: ۵۰/۳۷

ترجمہ: "اس میں سوچنے کی جگہ ہے اس کو جس کے اندر دل ہے یا لگائے کان دل لگا کر"

خلاصہ کلام

یہ کہ مصنوع کو دیکھ کر صانع کا تصور ایک بدیہی اور فطری امر ہے۔ منکرین خدا ذرا بتلائیں تو سہی کہ دنیا میں کوئی ایسا بھی ہے کہ مکان کو دیکھے اور مکان بنانے والے کا اس کو تصور نہ ہو کتاب کو دیکھے اور کاتب کا تصور نہ ہو۔

بلوحے گر ہزاراں نقش پیدا است
نیاید بے قلم زن یک الف راست

عجیب بات ہے کہ دہریہ تو عالم کے تغیرات اور تنوعات کو ایک بے شعور مادہ کی طرف منسوب کر کے حکمت اور دانائی کا مدعی ہے اور جو شخص عالم کے اس عجیب و غریب نظام کو خدائے حکیم اور قادر و توانا کی طرف منسوب کرتا ہے اس کو نادان بتلاتا ہے۔ جو شئے سراسر عقل اور فطرت کی مخالف ہے اس کو تو بلا دلیل منوانا چاہتا ہے اور جو شئے عین عقل اور فطرت کے مطابق ہے اس کا مذاق اڑاتا ہے۔

یہ اندھیر نہیں تو کیا ہے۔ خداوند علیم و قدیر کو چھوڑ کر ایک اندھے، بہرے، گونگے، بے حس، بے شعور، بے تمیز بلکہ مردہ اور بے جان مادہ کے ہاتھ میں نظام عالم کی باگ دے دینا بے وقوفی اور بے تمیزی نہیں تو بتلاؤ پھر کیا ہے۔ جس طرح یہ خدا بے شعور تھا اسی طرح اس کے پرستار بھی بے شعور نکلے۔ بلکہ یوں ہی مناسب ہے۔

خدا تعالیٰ خالق خیر بھی ہیں اور خالق شر بھی

اس مثال میں یہ امر بھی قابل لحاظ ہے کہ اگر اس رفیع الشان محل میں ایک جانب شہ نشین ہے تو دوسری جانب ایک مکان قضائے حاجت کے لئے بھی ہے اور جس طرح اس شہ نشین بنانے کی وجہ سے اس کا بانی قابل تحسین ہے اسی طرح وہ بیت

الخلاء بنانے کی وجہ سے بھی مستحق صد آفریں و تحسین ہے۔ ناپاک صرف اسی جگہ کو کہا جاسکتا ہے اس کے بنانے والے کو ہرگز برا نہیں کہا جاسکتا۔

اگر کوئی خوش نویس دیدہ و دانستہ کوئی لفظ برا لکھے یا کوئی کوزہ گر باختیار خود کوئی کوزہ ترچھا بنائے تو برا صرف اس لفظ اور کوزہ کو کہا جا سکتا ہے لیکن اس خوش نویس اور کوزہ گر کو کوئی برا نہیں کہہ سکتا۔ اسی طرح حق تعالیٰ کو خیر و شر دونوں کا خالق مانا جائے تو اس کی طرف کوئی برائی نہیں منسوب کی جاسکتی برا فقط اس شئے کو کہا جائے گا کہ جس کے ساتھ قائم ہے۔

تماشا کرنے والے پتلیوں سے کبھی اچھا کام لیتے ہیں اور کبھی برا۔ کبھی ان کو بادشاہ اور وزیر بناتے ہیں۔ کبھی ان کو دہقان اور جاروب کش بناتے ہیں کبھی کسی طرح نچاتے ہیں اور کبھی کسی طرح، بہرحال سب یہی کہتے ہیں کہ فلانی پتلی خوب ناچتی ہے اور فلانی بری۔ یہ کوئی نہیں کہتا کہ پتلی والا خوب ناچایا برا ناچا۔ بلکہ اس کا بری طرح نچانا یہ بھی اس کا کمال سمجھا جاتا ہے۔ اس لئے کہ اس کی غرض جو کہ تماشا ہے وہ دونوں صورتوں میں حاصل ہے۔

غرض یہ کہ اس میں کوئی رخ نہیں کہ ایک شئے کسی کے اعتبار سے بری ہو اور دوسروں کے اعتبار سے اچھی مثلاً رہزنوں کو مارنا اور قید کرنا ان کے حق میں گو برا ہے مگر بادشاہ کی سلطنت اور انتظام مملکت کے لئے مستحسن ہی نہیں بلکہ ضروری اور واجب ہے۔ خیر خواہان حکومت کے لئے انعام و اکرام اس درجہ ضروری نہیں جتنا کہ باغیوں اور رہزنوں کا استیصال ضروری ہے۔ آفتاب کا نور ہر ناپاک و پاک چیز پر پڑتا ہے مگر اس سے آفتاب کا نور ناپاک نہیں ہو جاتا بلکہ الٹا اسے بھی منور کر دیتا ہے۔ نور بصر ہر قسم کی چیز پر واقع ہوتا ہے۔

آنکھ جس طرح شیشہ کو دیکھتی ہے اسی طرح توے کو بھی دیکھتی ہے مگر توے کی سیاہی سے آنکھ میں کوئی نقص نہیں آجاتا علم ہر بھلی اور بری چیز کا ہوتا ہے مگر معلوم کے

برے ہونے سے علم کی برائی لازم نہیں آتی۔ معلوم اور مبصر اگر برا ہو تو بصر اور علم کا کیا قصور ہوا بلکہ بصر کا کمال ہی یہ ہے کہ ہر قسم کی چیز کو دیکھ سکے۔ علی ہذا علم کا کمال ہی یہ ہے کہ اس کی وساطت سے ہر بھلی اور بری چیز منکشف ہو جائے اسی طرح اگر حق تعالیٰ کی ایجاد ہر خیر وشر، ایمان اور کفر، مؤمن اور کافر سب ہی پر وارد ہو تو اس سے ایجاد اور موجد میں کوئی نقص نہیں لازم آتا۔

توحید

حقیقی اور خالص توحید کا فخر صرف اسلام کو حاصل ہے کیونکہ بعض تو سرے سے توحید ہی کے قائل نہیں اور اگر توحید فی الصفات کے قائل بھی ہو گئے تو توحید فی العبادۃ سے منحرف ہیں۔ عیسائی تو کھلم کھلا تثلیث (تین خداؤں کے قائل ہیں) یہودی عموماً اگرچہ توحید کے قائل ہیں مگر ایک فرقہ ان میں بھی ایسا گزرا ہے کہ جو نصاری کی طرح حضرت عزیر علیہ السلام کو خدا کا بیٹا مانتا تھا۔ کما قال تعالیٰ:

﴿وَقَالَتِ الْيَهُودُ عُزَيْرٌ ابْنُ اللّٰهِ وَقَالَتِ النَّصٰرَى الْمَسِيحُ ابْنُ اللّٰهِ ذٰلِكَ قَوْلُهُمْ بِأَفْوَاهِهِمْ يُضَاهِئُونَ قَوْلَ الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْ قَبْلُ﴾[1]

تَرجَمَہ: ”یہود نے کہا کہ عزیر اللہ کا بیٹا ہے اور نصاری نے کہا کہ مسیح اللہ کا بیٹا ہے۔ یہ ان کا قول ہے جو اپنے منہ سے کہتے ہیں۔ پہلے کافروں کی مشابہت کرتے ہیں۔“

ہندوؤں میں اوتاروں کا عقیدہ، نصاری کے عقیدہ ابنیت سے بالکل ملتا جلتا ہے آریوں کا فرقہ پیدا ہوا جس نے چاہا کہ ہندوؤں سے شرک کے دھبہ کو دھو دے اور اس بارے میں حقیقتاً بڑی جدوجہد کی لیکن پوری کامیابی نہیں ہوئی۔ البتہ اتنا ہوا کہ

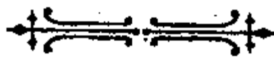
---

[1] القرآن: ۹/۳۰

لاکھوں اور کروڑوں دیوتاؤں اور اوتاروں سے اتر کر صرف تین چیزوں کو قدیم مانا۔ خدا، مادہ، روح اور نصاری کی طرح ایک نئی قسم کی تثلیث ایجاد کی۔

مجوسیوں کا عقیدہ یہ ہے کہ الوہیت یعنی خدائی دو طاقتوں پر منقسم ہے خیر کا خالق یزداں اور شر کا خالق اہرمن ہے۔ یزداں بناتا اور اہرمن بگاڑتا ہے۔ ہر ایک خدا دوسرے کا محتاج ہے دونوں کے اختیارات تقسیم شدہ ہیں۔ وہ خیر میں دخل نہیں دیتا اور یہ شر میں داخل نہیں دیتا۔ دو برابر کی قوتیں ہیں اس صلح اور آشتی سے عالم کا کارخانہ چل رہا ہے۔ باقی ان قوموں کو ذکر کرتے ہوئے ہم کو شرم معلوم ہوتی ہے کہ جنہوں نے فقط شجر اور حجر ہی کو اپنا معبود نہیں بنایا۔ بلکہ شرمگاہوں کو بھی اپنا معبود بنایا۔ "لا حول ولا قوۃ الا باللہ." ؎

آنکہ دو گفت وسہ گفت و بیش زیں
متفق باشند در واحد یقین

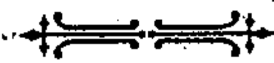


احولی چوں دفع شد یکساں شوند
آں دوسہ گویاں یکے گویاں شوند

خلاصہ یہ کہ صرف ایک مذہب اسلام ہے کہ جو شرک فی الذات اور شرک فی الصفات اور شرک فی العبادت سے بالکل پاک اور منزہ ہے۔

توحید ایک بدیہی اور فطری امر ہے جو لوگ ہزار ہا بتوں کو پوجتے اور سجدہ کرتے ہیں اور لاکھوں بلکہ کروڑوں دیوتاؤں کو مانتے ہیں۔ ان کے دل میں بھی محبت ایک ہی خدا کی ہے۔ کسی وقت اگر دل کی تہہ اور گہرائیوں میں سے کوئی لفظ حمد اور ثناء کا، شکر اور دعاء کا نکلتا ہے تو اسی ایک رب العالمین کے لئے نکلتا ہے اور جب کوئی مصیبت آتی ہے تو اسی ایک خدا کو پکارا جاتا ہے۔ اس وقت نہ کوئی بت یاد آتا ہے اور نہ کوئی دیوتا اور نہ مادہ کا خیال آتا ہے اور نہ روح کا۔ کسی نے کیا خوب کہا ہے ؎

وفی کل شیء له شاهد
یدل علی انه واحد



ہر گیا ہے کہ از زمین روید
وحدہ لا شریک لہ گوید

عالم کا کوئی ذرہ ایسا نہیں کہ جو اس وحدہ لاشریک لہ کو نہ جانتا ہو ؏
بے تعلق نسیت مخلوقے ازو

وہ کون سی شئے ہے کہ جس کی طبیعت اور فطرت میں اس وحدہ لاشریک کا میلان اور انجذاب نہ ہوں اور وہ اس کی تسبیح وتحمید میں نہ جھومتی ہو۔

سروی جنبد بصحن بوستان
در ہوائے قامت دلجوئے تو

اگر طبیعت انسانی پر لذات وشہوات کا حجاب نہ ہوتا تو نہ معلوم کیا کیفیت گزرتی سوائے حضرات انبیاء علیہم السلام اور صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے جن سے ذرا بھی حجاب اٹھا تو ضبط نہ کر سکے بالفرض اگر نفوس انسانیہ پر شہوتوں کا پردہ نہ ہوتا تو یہ سارا عالم ارباب وجد اور اصحاب عشق کی ایک محفل ہوتی جس میں ہر طرف خداوند ذوالجلال کے عشق اور محبت میں تڑپنے والا ہی نظر آتا۔

ہر شخص[1] کی طبیعت میں خداوند ذوالجلال کی محبت کا ہونا اور فطری طور پر خدا کی طرف میلان اور انجذاب کا پایا جانا اس سے معلوم ہے کہ شاید کوئی وقت ایسا گزرا ہے کہ جس میں خداوند ذوالجلال کی کوئی تجلی ان پر ہوئی ہے جس کی وجہ سے دلوں میں خدا کی محبت اس قدر راسخ اور پختہ ہو چکی ہے کہ کسی طرح نہیں نکل سکتی۔ ہزار تکلیفیں پہنچیں مگر دل خدا ہی کی طرف جھکتا ہے بے دیکھے اتنی محبت کا ہونا تقریباً ناممکن ہے۔

[1] عہد الست کا مضمون تقریر دلپسند صفحہ ۸۵ سے لیا گیا ہے

غالباً یہ تجلی اس وقت ہوئی ہے جس وقت کہ بندوں سے عہد الست لیا گیا چونکہ یہ واقعہ فقط ایک لحہ یا دولحہ کے لئے پیش آیا اور پھر اس کو پیش آئے ہوئے بھی ہزار ہا سال گزر گئے اس لئے بھول جانا کچھ مستبعد نہیں۔ البتہ تجلی کا جو مقصد تھا وہ پورا ہو گیا۔ وہ یہ کہ رب العالمین کی محبت فطرت اور جبلت میں پہاڑ سے زیادہ مستحکم اور مضبوط ہو گئی غرض یہ کہ کوئی دل ایسا نہیں جو خدا سے وابستہ نہ ہو۔

سب سے ربط آشنائی ہے تجھے
دل میں ہر ایک کے رسائی ہے تجھے

اسی وجہ سے امام اعظم ابوحنیفہ رحمہ اللہ تعالیٰ کا قول ہے کہ توحید کے وہ لوگ بھی مکلف ہیں کہ جن کو انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کی دعوت نہیں پہنچی اس لئے کہ خداوند ذوالجلال کی معرفت اور اس کی توحید فطری اور بدیہی امر ہے بعثت انبیاء علیہم السلام پر موقوف نہیں عقل بھی اس کا ادراک کر سکتی ہے۔ ہاں وہ احکام اور وہ امور کہ جو بغیر انبیاء کرام علیہم السلام کی بعثت کے محض عقل سے نہیں معلوم ہو سکتے۔ وہاں انسان معذور ہے۔ بالفرض اگر دنیا میں کوئی بھی رسول نہ آتا تب بھی مخلوق پر خدا کا پہچاننا اور ایک جاننا واجب ہوتا۔ لہٰذا جن لوگوں کو حضرات انبیاء علیہم السلام کی دعوت نہیں پہنچی ان پر توحید فرض اور شرک حرام ہے۔ منکر خدا اور مشرک کی کسی صورت میں نجات نہ ہوگی۔ کما قال تعالیٰ:

﴿اِنَّ اللّٰهَ لَا یَغْفِرُ اَنْ یُّشْرَكَ بِهٖ وَیَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ یَّشَآءُ﴾[1]

تَرجَمہ: "تحقیق اللہ تعالیٰ بدون توبہ کے شرک کو معاف نہیں کرتا البتہ شرک سے کم درجہ کے گناہ جس کو چاہے بدون توبہ کے بھی معاف کر دیتا ہے۔"

---

[1] القرآن: ۴/۴۸

اس لئے کہ شرک تمام عقلاء عالم کے نزدیک قبیح ہے۔ حتیٰ کہ جو شرک کرتے ہیں وہ بھی اپنے لئے مشرک کہنا گوارا نہیں کرتے جو مشرکین آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے پیشتر زمانۂ فترت میں گزر گئے ان کا ناری ہونا بکثرت احادیث میں آیا ہے۔

اتمام حجت کے لئے قیامت کے دن ان لوگوں کا امتحان بھی لیا جائے گا جو اس وقت خدا کے فرستادہ کی اطاعت کرے گا وہ نجات پائے گا اور جو سرتابی کرے گا وہ سزا پائے گا (تفصیل کیلئے زرقانی شرح مواہب اور کتب کلامیہ کی مراجعت کی جائے)۔[1]

اور عصر حاضر کے لحاظ سے یہ مسئلہ محض فرضی ہے اس لئے کہ اب عالم میں کوئی آبادی ایسی نہیں رہی کہ جہاں اسلام کی دعوت نہ پہنچی ہو۔ اور بالفرض جس جگہ اسلام کی دعوت نہیں پہنچی اس کا حکم وہ ہے جو ہم نے بیان کیا ہے۔

الحاصل توحید ایک بدیہی اور فطری امر ہے کسی دلیل کی حاجت نہیں مگر اتمام حجت کے لئے کچھ دلائل پیش کرتے ہیں!

توحید کی پہلی دلیل[2]

اہل اسلام کا یہ دعویٰ ہے کہ اگر عالم کے لئے دو یا دو سے زائد صانع ہوں تو کارخانہ عالم بالکل درہم برہم ہو جائے گا اور کوئی شئے بھی وجود میں نہ آئے گی کیونکہ اس میں تو کسی کو کلام نہیں کہ خدا کے لئے کامل الذات والصفات ہونا ضروری ہے خدا وہی ہوسکتا ہے جو ہر قسم کے نقص سے پاک ہو ورنہ خالق اور مخلوق میں کیا فرق ہے۔

[1] اتحاف: جلد ۲ صفحہ ۱۹۲

[2] توحید کی پہلی اور دوسری دلیل حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمہ اللہ تعالیٰ کی تصانیف سے لی گئی اور باقی دلائل توحید امام رازی قدس سرہ کی تفسیر کبیر جلد ۶ صفحہ ۱۰۶ سورۃ الانبیاء سے لئے گئے ہیں۔ اور اتحاف شرح احیاء العلوم جلد ۲ صفحہ ۱۲۷، تا جلد ۲ صفحہ ۱۳۵ میں بھی توحید پر تفصیلی کلام کیا ہے حضرات اہل علم اصل کی مراجعت فرمالیں۔

اس لئے کہ بندے خدا بننے سے اس وجہ سے محروم ہیں کہ ان میں طرح طرح کے نقصانات موجود ہیں۔ وجود ان کا ناقص، قدرت ان کی ناقص، علم ان کا ناقص، پس اگر عیاذاً باللہ خدا بھی ہماری طرح ناقص ہو۔ ہماری ہی طرح مجبور ہو تو اس کو ہم پر خدا بن جانے کا کیا حق ہے۔

پس جب ہر خدا کامل اور مستقل ٹھہرا تو ہر ایک کی تاثیر بھی کامل اور مستقل ہوگی اس لئے کہ خالق کی مثال آفتاب اور ماہتاب اور مخلوق کی مثال زمین کی سی ہے۔ زمین آفتاب سے بقدر آفتاب منور ہوتی ہے اور ماہتاب سے بقدر ماہتاب۔ پس دو صانع ہوں گے اور ہر ایک کی تاثیر کامل ہوگی تو ہر خدا کی طرف سے دو کامل وجود ہر مخلوق کے پیمانہ میں آئیں گے۔ اور ہم دیکھتے ہیں کہ ایک سانچہ میں دو چیزیں اور ایک نیام میں دو تلواریں اور سیر بھر کے پیمانہ میں دو سیر چیز اور ایک جوتے میں ویسے ہی دو قدم اور ایک اچکن میں دو بدن اور ایک مکان میں اس کی مقدار سے دو چند اسباب نہیں سما سکتا اور اگر زبردستی کر کے اس میں ڈال ہی دیا جائے تو وہ سانچہ اور وہ نیام اور وہ اچکن ایک لمحہ کے لئے کسی طرح سالم نہیں رہ سکتے۔

اسی طرح اگر دو خداؤں کی طرف سے پورا پورا وجود ایک مخلوق میں سمانے لگے تو بے شک وہ مخلوق نیست اور نابود ہو جائے گی۔ اور اگر یہ کہا جائے کہ دونوں خداؤں سے مل کر ایک ہی وجود آیا تو پھر حقیقت میں ہر ایک خدا مستقل علت اور مستقل موثر نہ ہوگا بلکہ دو خداؤں کا مجموعہ مل کر موثر ہوگا جس سے ہر ایک کا ناقص اور ناتمام ہونا لازم آئے گا۔ ہاں اگر یہ احتمال ہوتا کہ خدا ناقص بھی ہو سکتا ہے تو یہ کہنا ممکن ہو جاتا کہ جس طرح دو چراغوں کا نور مل کر کامل ہو جاتا ہے اسی طرح دو خدا کے عطا کئے ہوئے وجود بھی مل کر کامل ہو جائیں گے۔ مگر اس کا کیا علاج کہ تمام اہل عقل اس پر متفق ہیں کہ بارگاہ خداوندی میں نقص کا کسی طرح گزر نہیں۔

الحاصل اگر دو خدا کامل الذات اور تام الصفات ہوتے تو یہ کارخانہ عالم بالکل

صفحۂ ہستی سے مٹ چکا ہوتا۔ پس معلوم ہوا کہ تمام عالم کے لئے ایک ہی خدا ہے۔
اور اس آیت میں اسی دلیل کی طرف اشارہ ہے۔ قال تعالیٰ:
﴿لَوْ كَانَ فِيهِمَآ اٰلِهَةٌ اِلَّا اللّٰهُ لَفَسَدَتَا ۚ﴾[۱]
ترجمہ: ''اگر زمین و آسمان میں سوائے خدا کے چند معبود ہوتے تو یقیناً
یہ سب کے سب فنا ہو جاتے۔''[۲]

توحید کی دوسری دلیل

عالم کے موجودہ نظام پر نظر ڈالنے سے ہر فہیم شخص یہ سمجھ سکتا ہے کہ اس عالم کے جس سلسلہ پر نظر ڈالتے ہیں وہ ایک ہی اصل پر جا کر تمام ہو جاتا ہے۔ روشنی کے سلسلہ کو دیکھ لیجئے کہ وہ آفتاب پر پہنچ کر ختم ہو جاتا ہے۔ گرمی کے سلسلہ پر نظر ڈالئے کہ آثار آتش پر پہنچ کر ختم ہو جاتا ہے۔ عدد کے سلسلہ کو دیکھ لیجئے کہ الی غیر النہایہ پھیلا ہوا ہے۔ مگر تمام سلسلہ کا اختتام ایک پر ہو جاتا ہے۔ کیونکہ ایک سب کے لئے اصل ہے جیسا کہ آفتاب تمام روشنیوں کے لئے اور آتش تمام حرارتوں کے لئے اصل ہے موجوں کا سلسلہ پانی پر ختم ہو جاتا ہے، خطوط دائرہ کا سلسلہ مرکز پر ختم ہو جاتا ہے۔ کیونکہ مرکز تمام خطوط کے لئے اصل ہے، حکام کا سلسلہ بادشاہ پر تمام ہو جاتا ہے۔

الحاصل عالم میں کوئی ایسا نہیں کہ جو کسی ایک اصل پر ختم نہ ہوتا ہو۔ پس یہ ناممکن ہے کہ کسی ایک موجود اصلی پر ان موجودات عالم کا سلسلہ تمام نہ ہو ضروری ہے کہ کوئی ایسا موجود ہو کہ جس کا وجود اصلی اور ذاتی ہو اور ان تمام موجودات کا وجود اس کا فیض ہو جیسے ایک آفتاب تمام روشنیوں کی اصل ہے اور باقی اسی کی فرع ہیں حتیٰ کہ نجم و قمر کا وجود بھی اسی سے مستفاد ہے۔[۳]

---

۱ القرآن: ۲۱/۲۲ ۲ تقریر دلپذیر: صفحہ ۲۱، والحصون الحمیدیہ: صفحہ ۲۲
۳ تقریر دلپذیر: صفحہ ۲۳

توحید کی تیسری دلیل

اگر دو خدا فرض کئے جاویں اور ہر ایک کامل قدرت اور کامل اختیار کے ساتھ موصوف ہو اور ایک کا ارادہ کسی شئے کے ایجاد کے متعلق ہو تو سوال یہ ہے کہ دوسرا خدا پہلے خدا کی مخالفت پر قادر ہے یا اس کی موافقت پر مجبور ہے۔

پس اگر دوسرا خدا پہلے خدا کی مخالفت کر سکتا ہے اور پہلے خدا کی تدبیر کو روک سکتا ہے تو یہ دوسرا خدا قادر اور قاہر ہوگا اور پہلا خدا یقیناً عاجز اور قاصر ہوگا۔ اور ظاہر ہے کہ عاجز اور قاصر تو خدا نہیں ہو سکتا۔ لہٰذا خدا وہی ہو سکتا ہے جو ہر طرح سے کامل ہو اور اگر یہ کہا جائے کہ دوسرا خدا پہلے خدا کی کسی قسم کی مخالفت نہیں کر سکتا بلکہ اس کی موافقت پر مجبور اور مضطر ہے تو یہ دوسرا خدا عاجز اور مجبور ہونے کی وجہ سے خدا نہیں رہ سکتا۔ خدا وہی رہے گا کہ جس کی شان "فَعَّالٌ لِّمَا يُرِيْدُ" ہو اور کوئی ذرہ برابر بھی اس کی مخالفت نہ کر سکتا ہو۔[۱]

توحید کی چوتھی دلیل

اگر دو خدا مانے جائیں تو ظاہر ہے کہ الوہیت میں دونوں مشترک اور مساوی ہوں گے۔ اب اس الوہیت کے علاوہ ہر ایک خدا میں کوئی ایسی خاص صفت ہونی چاہئے کہ جس کے ذریعہ سے دونوں میں امتیاز ہو۔ اب دریافت طلب امر یہ ہے کہ پہلے خدا کو دوسرے خدا سے صفت کمال کے ذریعہ سے امتیاز حاصل ہے۔ (یعنی پہلے خدا میں وہ صفت کمال پائی جاتی ہے اور دوسرے خدا میں نہیں پائی جاتی) تو ظاہر ہے

[۱] یہ دلیل برہان تمانع کے نام سے مشہور ہے چونکہ اس دلیل میں ایک خدا کا ارادہ دوسرے خدا کے ارادہ کے مانع اور مزاحم فرض کیا گیا ہے اس لئے یہ دلیل برہان تمانع کے نام سے مشہور ہوئی علماء نے اس دلیل کو مختلف عنوانات اور مختلف تقریروں سے بیان کیا ہے جو اتحاف شرح احیاء العلوم جلد ۲ صفحہ ۱۲۷ میں مذکور ہیں جو تقریر ہم نے ہدیہ ناظرین کی ہے وہ امام غزالی رحمہ اللہ تعالیٰ کی تقریر ہے۔

کہ ایسی صورت میں دوسرا خدا نہیں رہ سکتا۔ کیونکہ صفت کمال سے خالی ہونا ایک عیب ہے جو کہ الوہیت کے سراسر منافی ہے اور اگر پہلے خدا کو دوسرے خدا سے صفت نقص کے ذریعہ سے امتیاز حاصل ہے یا غیر صفت کمال کے ذریعہ سے امتیاز ہے تو اس صورت میں پہلا خدا خدا نہیں رہ سکتا کیونکہ صفت نقص کے ساتھ موصوف ہونا یا صفت کمال سے عاری ہونا شان الوہیت کے بالکل منافی ہے۔

توحید کی پانچویں دلیل

نیز ایک خدا تدبیر عالم کے لئے کافی ہے یا نہیں۔ اگر کافی ہے تو دوسرا خدا بالکل ضائع اور بے کار ہے۔ یعنی بالکل فالتو ہے جس کی کوئی حاجت نہیں۔ اور جس کی کوئی حاجت نہ ہو وہ خدا کیسے ہوسکتا ہے خدا کی شان تو یہ ہونی چاہئے کہ وہ سب سے مستغنی ہو اور تمام عالم اس کا محتاج ہو۔ اور اگر ایک خدا تدبیر عالم کے لئے کافی نہیں تو یہ خدا عاجز ہوگا اور کسی دوسرے خدا کا تدبیر عالم میں محتاج ہوگا۔ اور ظاہر ہے کہ عاجز اور محتاج خدا نہیں ہوسکتا۔

توحید کی چھٹی دلیل

نیز اگر دو خدا فرض کر لئے جائیں تو یہ بتلایئے کہ ایک خدا اپنے اسرار (راز) کو دوسرے خدا سے مخفی رکھ سکتا ہے یا نہیں۔ اگر رکھ سکتا ہے تو دوسرا خدا بے خبر اور جاہل ہونے کی وجہ سے خدا نہ رہے گا۔ اور اگر یہ خدا اپنے اسرار کو دوسرے سے مخفی نہیں رکھ سکتا تو یہ خدا عاجز ہونے کی وجہ سے خدا نہ رہے گا۔

توحید کی ساتویں دلیل

نیز شرکت ایک قسم کا عیب ہے اور یکتائی صفت کمال ہے چنانچہ جب کسی کی مدح کی جاتی ہے تو یہی کہا جاتا ہے کہ آپ یکتائے زمانہ ہیں، بے مثل اور بے نظیر

ہیں۔ اور جب خدا کے لئے ہر قسم کے عیب سے پاک ہونا ضروری ہے تو اس عیب شرکت سے بھی پاک ہونا ضروری ہوگا۔

توحید کی آٹھویں دلیل

اگر خداوند عالم کو حدہ لاشریک لہ نہ تسلیم کیا جائے اور اسی کو کل عالم کے تدبیر کے لئے کافی نہ سمجھا جائے تو پھر عقلاً دو یا چار کی کوئی تحدید نہیں ہو سکتی اس لئے کہ جس دلیل سے آپ دو یا چار صانع اور خدا مانیں گے اسی دلیل سے دوسرا شخص خدا کو زائد عدد میں مان سکتا ہے بلکہ اگر کوئی شخص ایک انسان کی ہر حرکت اور سکون کے لئے جدا جدا خدا مان لے تو آپ اس کو عقلاً روک نہیں سکتے۔ خلاصہ یہ کہ خدا کو ایک نہ ماننا غیر محدود خدا ماننے کے لئے ایک فتح باب ہے ایک عابد کے لئے غیر محدود معبودوں کا ماننا حقیقت میں ایک ذات کو غیر محدود ذوات کی اطاعت کی مالا یطاق تکلیف دینا ہے۔[1]

توحید کی نویں دلیل

اگر دو یا دو سے زائد خدا تسلیم کئے جائیں تو ہر خدا کا اپنے وجود خاص پر دلیل قائم کرنے سے عاجز ہونا لازم آتا ہے اس لئے کہ حدوث عالم مطلق وجود صانع پر دلالت کرتا ہے تعدد صانع پر کسی قسم کی دلالت نہیں کرتا۔ اور اگر بالفرض تعدد صانع پر دلالت کرے بھی تو وہ کسی خاص خدا پر دلالت نہیں کرتا۔ جو دلیل ایک خدا پیش کر سکتا ہے وہی دلیل بعینہٖ دوسرے خدا کے وجود پر قائم ہو سکتی ہے لہٰذا تعدد صانع کی تقدیر پر ہر خدا کے لئے اپنی ذات پر ایسی دلیل قائم کرنے سے کہ جو فقط اسی کی ذات پر دلالت کرے اور دوسرے پر ہرگز دلالت نہ کرے عاجز ہونا لازم آتا ہے۔

توحید کی دسویں دلیل

اگر دو خدا فرض کئے جائیں تو اس صورت میں یا تو ہر ایک دوسرے کا محتاج ہوگا یا

۱۔ قالہ ابو منصور التمیمی کذا فی الاتحاف: جلد ۲ صفحہ ۱۲۹

فقط ایک محتاج ہوگا اور دوسرا مستغنی یا یہ کہ ہر ایک دوسرے سے مستغنی اور بے نیاز ہوگا۔

پہلی صورت میں کوئی بھی خدا نہ رہے گا اس لئے کہ احتیاج اور نیاز مندی سراسر خدائی کے منافی ہے۔

اور دوسری صورت میں جو محتاج ہوگا وہ خدا نہ رہے گا۔ خدا وہی رہے گا کہ جو سب سے مستغنی اور بے نیاز ہو۔ اور وہ ایک ہی ہے۔

اور تیسری صورت میں بھی کوئی خدا نہ رہے گا۔ اس لئے کہ خدا کی شان یہ ہونی چاہئے کہ کوئی اس سے بے نیاز نہ ہو۔ سب اسی کے محتاج اور دست نگر ہوں اس لئے کہ استغناء اور بے نیازی غیر ضروری شئے سے ہوا کرتی ہے۔ پس اگر معاذ اللہ خدا سے بھی استغنا اور بے نیازی ممکن ہے تو معاذ اللہ خدا کا غیر ضروری ہونا لازم آتا ہے جو کہ ایک کھلا ہوا عیب ہے۔ اور خدا کی ذات سب عیبوں سے پاک ہوتی ہے۔ پس اگر دو خدا ہوں اور ہر خدا دوسرے سے مستغنی اور بے نیاز ہو تو پھر ہر خدا کا غیر ضروری ہونا لازم آتا ہے۔ جو کہ سراسر شان الوہیت کے خلاف ہے۔

﴿سُبْحٰنَهٗ وَ تَعَالٰى عَمَّا يَقُوْلُوْنَ عُلُوًّا كَبِيْرًا﴾[1]

ترجمہ: ”وہ پاک ہے اور برتر ہے ان کی باتوں سے بے نہایت۔“



[1] القرآن: ۱۷/۴۳

صفات باری عزاسمہ

قال اللّٰہ تعالیٰ: ﴿اَللّٰہُ لَآ اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ ؕ لَہُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰی﴾[1]

ترجمہ: ''اللہ ہے کہ اس کے سوا کوئی معبود نہیں، اچھے اچھے نام اسی کے ہیں۔''

ذات خداوندی باوجود ایک ہونے کے پھر سب کمالات کے ساتھ موصوف ہے۔ ایک شخص کلکٹری اور مجسٹریٹی دونوں کے کام کرتا ہے اس لئے دو نام ہو گئے ورنہ حقیقت میں وہ ایک ہی ذات ہے ایسے ہی ذات خداوندی بھی بسبب جدا جدا کاموں کے خالق، رازق، سمیع، بصیر کہلاتی ہے۔ غرض یہ کہ صفات کا متعدد ہونا اس کی وحدانیت کے کسی طرح منافی نہیں۔

اور جس طرح ذات خداوندی تمام موجودات کے لئے اصل ہے اسی طرح کمالات خداوندی کمالات مخلوق کے لئے اصل ہیں۔ اور مخلوق میں جو کمال ہے وہ اسی کے کمال کا پرتو اور عکس ہے جیسا کہ مخلوقات کا وجود اسی کے وجود کا پرتو اور عکس ہے۔

آفتاب میں اگر نور نہ ہوتا تو زمین کیسے منور ہوتی۔ آتش میں اگر حرارت نہ ہوتی تو پانی کیسے گرم ہوتا علی ہذا اگر خالق میں کمال نہ ہوتا تو مخلوق میں کہاں سے کمال آجاتا۔

بندوں میں حیات بھی ہے۔[2] علم وقدرت بھی ہے ارادہ اختیار بھی ہے۔ سمع وبصر

---

[1] القرآن ۸/۲۰

[2] کما فصلہ ابن تیمیۃ فی مواضع من شرح العقیدۃ الاصفہانیۃ صفحہ ۲۲، ۷۵، ۷۶

اور کمال بھی ہے اور یہ ساری باتیں باتفاق خوبی وکمال کی سمجھی جاتی ہیں۔

یہ کمالات اگر خالق میں نہ تھے تو مخلوق میں کہاں سے آئے۔ نیز اگر خداوند کریم ان صفات کمالات کے ساتھ موصوف نہ ہو تو مخلوق کا خالق سے اور ممکن کا واجب سے افضل ہونا لازم آتا ہے اس لئے کہ مخلوق میں حیات، علم، قدرت، سمع، بصر سب موجود ہے اب اگر خدا ان صفات سے عاری ہو تو یقیناً مخلوق کو خالق سے افضل کہنا پڑے گا۔ کیونکہ زندہ کا مردہ سے اور عالم کا غیر عالم سے اور قادر کا غیر قادر سے افضل ہونا بالکل ظاہر ہے۔

؎ خشک ابرے کہ بود ز آب تہی
ناید ازوے صفت آبدہی

حیات

پس ضروری ہے کہ اس میں صفت حیات اس درجہ کامل اور اکمل ہو کہ واہمہ موت سے بھی پاک ہو اور تمام عالم کی حیات اسی کی حیات کا پرتو اور فیض ہو حیات اس کے لئے ذاتی اور اصلی اور خانہ زاد ہو اور کیوں نہ ہو اس لئے کہ ایسے بدیع عالم کا ایک میت اور جماد سے صادر ہونا عقل محال سمجھتی ہے اور باقی عالم کی حیات اسی کی بخشش اور عطا کا ثمرہ ہو۔ کما قال تعالیٰ:

﴿اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ اَلْحَیُّ الْقَیُّوْمُ ۚ﴾ [۱]

ترجمہ: ”اس کے سوا کوئی خدا نہیں وہ ہمیشہ زندہ رہنے والا ہے، اور سب کا سنبھالنے والا ہے۔“

کما قال تعالیٰ:

﴿وَهُوَ الَّذِیْۤ اَحْیَاكُمْ ۫ ثُمَّ یُمِیْتُكُمْ ثُمَّ یُحْیِیْكُمْ ؕ﴾ [۲]

[۱] القرآن: ۲/۲۵۵ [۲] القرآن: ۲۲/۶۶

تَرجَمۃ: ''اسی ذات نے تم کو حیات عطا کی اور وہی پھر تم کو مارے گا پھر حیات عطا کرے گا۔''

علم

اور وہ ذات علیم بھی ہے یعنی اس کو ہر ذرہ کی خبر ہے۔ کوئی شئے ایسی نہیں کہ جو اس کو معلوم نہ ہو۔ کما قال تعالیٰ:

﴿اِنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَیْءٍ عَلِيْم.﴾[1]

تَرجَمۃ: ''اللہ تعالیٰ ہر شئے کا جاننے والا ہے۔''

عالم میں جو کچھ ہو رہا ہے یا ہوگا ازل ہی میں ان سب باتوں کا اس کو بالتفصیل علم تھا۔

بر و علم یک ذرہ پوشیدہ نیست
کہ پیدا و پنہاں بنزدش یکیست

اور وہ کیوں عالم نہ ہو جب اسی نے تمام عالم کو پیدا کیا اور وہی اس کو باقی رکھتا ہے اور وہی اس کو تربیت کرتا ہے تو یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ وہ ان چیزوں کا جاننے والا نہ ہو کسی شئے کو موجود کر دینا یا اس کو باقی رکھنا یا اس کی تربیت کرتے رہنا بغیر علم کے محال ہے۔ کما قال تعالیٰ:

﴿اَلَا يَعْلَمُ مَنْ خَلَقَ وَهُوَ اللَّطِيْفُ الْخَبِيْرُ﴾[2]

تَرجَمۃ: ''کیا وہ نہیں جانتا کہ جس نے پیدا کیا حالانکہ وہی ایک ایسی ذات ہے کہ جو باریک بین اور خبردار ہے۔ یعنی اس کا لطیف اور خبیر ہونا ہی اس کے علیم ہونے کی کافی دلیل تھا چہ جائیکہ وہ خالق بھی ہے۔''

علاوہ ازیں علم کی حقیقت صرف اس قدر ہے کہ معلومات عالم کے سامنے موجود

[1] القرآن ۵۸/۷ [2] القرآن ۶۷/۱۴

ہوں کوئی شئے اس سے مخفی نہ ہو۔ اور جہل کی حقیقت یہ ہے کہ معلومات اس کے سامنے موجود نہ ہوں بلکہ غائب اور مخفی ہوں۔ اور یہ ظاہر ہے کہ مصنوع صانع سے غائب نہیں ہوسکتا۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ جن حقائق کو وہ وجود عطا کرتا ہے وہ حقیقتیں اس سے محجوب اور مستور ہوں۔

پس یقیناً عالم کی تمام چیزیں اس معطی وجود کے سامنے بے حجاب اور بے نقاب ہوں گی۔ اور اسی بے حجاب اور بے نقاب ہونے کا نام علم ہے۔ کما قال تعالیٰ:

﴿إِنَّ اللّٰهَ لَا يَخْفٰى عَلَيْهِ شَيْءٌ فِي الْأَرْضِ وَلَا فِي السَّمَآءِ ﴾[1]

وقال تعالیٰ:

﴿وَمَا تَكُوْنُ فِيْ شَأْنٍ وَّمَا تَتْلُوْا مِنْهُ مِنْ قُرْاٰنٍ وَّلَا تَعْمَلُوْنَ مِنْ عَمَلٍ إِلَّا كُنَّا عَلَيْكُمْ شُهُوْدًا إِذْ تُفِيْضُوْنَ فِيْهِ ۚ وَمَا يَعْزُبُ عَنْ رَّبِّكَ مِنْ مِّثْقَالِ ذَرَّةٍ فِي الْأَرْضِ وَلَا فِي السَّمَآءِ وَلَآ أَصْغَرَ مِنْ ذٰلِكَ وَلَآ أَكْبَرَ إِلَّا فِيْ كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ ﴾[2]

ترجمہ: "بے شک اللہ پر کوئی چیز زمین اور آسمان کی پوشیدہ نہیں۔ آپ کی کوئی شان اور کوئی تلاوت اور کوئی عمل ایسا نہیں کہ جس پر ہم حاضر اور مطلع نہ ہوتے ہوں۔ جب کہ تم اس عمل میں مشغول ہوتے ہو اور آپ کے رب سے ایک ذرہ بھی غائب نہیں ہوتا نہ زمین میں اور نہ آسمان میں اور چھوٹی سے چھوٹی اور بڑی سے بڑی کوئی شے ایسی نہیں کہ جو ہمارے یہاں لوح محفوظ میں درج نہ ہو۔"

ایک معمولی گھڑی اور گھنٹہ کو دیکھ کر ہم کو اس کا یقین آجاتا ہے کہ اس کا موجد

---

[1] القرآن: ۳/۵ [2] القرآن: ۱۰/۶۱

ضرور علم ہندسہ کا بڑا حاذق اور ماہر ہوگا کہ جس نے اوقات معلوم کرنے کے لئے یہ عجیب وغریب آلہ ایجاد کیا لہٰذا اس عالم کا نظام شمسی اور قمری دیکھ کر یہ کیسے یقین نہ آئے کہ اس کا بنانے والا بڑا ہی علیم وحکیم ہے۔

قدرت

اور وہ ذات قدرت بھی رکھتی ہے اس قدرت کی وجہ سے جس شئے کو چاہے موجود یا معدوم کرسکتی ہے۔ کسی چیز سے وہ عاجز نہیں جیسا کہ قرآن عزیز میں ہے:

﴿اِنَّ اللّٰہَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ۝﴾ [1]

ترجمہ: ''یقیناً حق تعالیٰ ہر شئے پر قادر ہیں۔''

مخلوقات میں جو کچھ بھی قدرت اور اختیار ہے وہ سب اسی کا فیض اور عطیہ ہے پس یہ کس طرح ممکن ہے کہ مخلوقات تو اپنے افعال میں قادر اور مختار ہوں اور خدا تعالیٰ اپنے افعال میں مجبور اور مضطر ہو ہر سلیم الفطرت جانتا ہے کہ قدرت اور اختیار صفت کمال ہے اور ایجاب اور اضطرار کھلا ہوا عیب ہے۔ قال تعالیٰ:

﴿وَرَبُّكَ یَخْلُقُ مَا یَشَآءُ وَیَخْتَارُ ؕ﴾ [2]

ترجمہ: ''تیرا پروردگار جس چیز کو چاہتا ہے پیدا کرتا ہے اور جس کو چاہتا ہے اختیار کرتا ہے۔''

وہ قادر مختار ہے جس طرح چاہے تصرف کرے۔

﴿لَا یُسْئَلُ عَمَّا یَفْعَلُ وَهُمْ یُسْئَلُوْنَ﴾ [3]

ترجمہ: ''اُسے پوچھا نہ جائے جو وہ کرے اور ان سے پوچھا جائے۔''

کرا زہرہ آنکہ از بیم تو
کشاید زبان جز بہ تسلیم تو

[1] القرآن: ۲/۱۰۹ [2] القرآن: ۲۸/۶۸ [3] القرآن ۲۱/۲۳

زباں تازہ کردن باقرار تو
نینگیختن علت ازکار تو

حضرت مجدد الف ثانی رحمہ اللہ تعالیٰ مکتوبات میں فرماتے ہیں۔

کہ فلاسفہ نے اپنی سفاہت سے ایجاب اور اضطرار ہی کو کمال سمجھا اور حق تعالیٰ شانہ کو ایسا معطل اور بے کار خیال کیا کہ اس سے سوائے ایک مصنوع کے صدور جائز نہ رکھا اور وہ بھی بالایجاب والاضطرار اور تمام حوادث کو عقل فعال کی طرف منسوب کرتے ہیں کہ جس کا وجود سوائے ان کے تخیل اور توہم کے کہیں ثابت نہیں۔

فلاسفہ کو مناسب تھا کہ حوادث اور اضطرار کے وقت عقل فعال سے التجا کرتے اور خدائے ذوالجلال کی طرف رجوع نہ کرتے اس لئے کہ ان کے زعم میں حوادث کا تعلق خدائے ذوالجلال سے نہیں بلکہ عقل فعال سے ہے خدا تعالیٰ تو ان کے نزدیک فاعل بالایجاب ہے۔ مصائب اور آلام کے دفع کرنے کی اس کو قدرت اور اختیار نہیں۔ دو چیزیں اس فرقہ کی خصوصیات سے ہیں۔ اول احکام منزلہ اور اخبار مرسلہ کی تکذیب اور انکار اس فرقہ کا خاص شعار ہے۔ دوم یہ کہ اس فرقہ نے اپنے مطالب واہیہ کے ثابت کرنے میں جس قدر تلبیس اور تلمیع سے کام لیا ہے اس کی نظیر نہیں اور جس درجہ ان کو اپنے مظنون اور موہوم اور خیالی مقاصد کے ثابت کرنے میں خبط لاحق ہوا ہے وہ کسی سفیہ اور نادان کو بھی نہیں ہوا اور علی ہذا اس فرقہ کے تمام متسق اور منتظم دلائل محض لایعنی اور لاطائل ہیں۔

فلسفہ چوں اکثرش باشد سفہ پس کل آں
ہم سفہ باشد کہ حکم کل حکم اکثرست[1]

ایک خدشہ اور اس کا جواب

خدا اگر قادر مطلق ہے تو اپنے فنا کرنے پر کیوں قادر نہیں؟ جواب یہ ہے کہ قادر

[1] کذافی المکتوب: جلد اصفحہ ۳۱۵

کی تاثیر اور قدرت کو اس وقت ناقص کہہ سکتے ہیں کہ جب مقدور میں اثر قبول کرنے کی صلاحیت ہو مگر فاعل کسی وجہ سے اثر نہ کرسکتا ہو شجر اور حجر اور دیگر جمادات اگر نور آفتاب سے منور نہ ہوں تو آفتاب کا کیا قصور ہے آفتاب کی تنویر تو شیشہ اور توے سب ہی پر واقع ہوتی ہے لیکن جب آئینہ پر اس کی تنویر واقع ہوتی ہے تو جگمگانے لگتا ہے۔ توے میں یہ بات نہیں اس لئے کہ اس میں روشن ہونے کی صلاحیت ہی نہیں۔ ٹھیک اسی طرح جب اس کی قدرت کاملہ ممکنات سے متعلق ہوتی ہے تو ممکنات اپنی ذاتی استعداد اور صلاحیت کی وجہ سے اس کا اثر قبول کرتی ہیں۔ اور محالات اور ممتنعات اس وجہ سے کہ ان میں اثر قبول کرنے کی صلاحیت اور استعداد ہی نہیں اگر وہ تحت القدرۃ نہ داخل ہوں تو قدرت خداوندی کا کیا قصور ہوا اور باری تعالیٰ پر چونکہ موت اور فنا کا طاری ہونا اس کے حی و قیوم ہونے کی وجہ سے محال ہے۔ اس لئے اگر اس کی موت ظہور میں نہ آسکے تو اس کی قدرت کاملہ کا کوئی قصور نہیں۔

دوسرا جواب

نیز محل تاثیر کا موثر سے منفصل اور جدا ہونا ضروری ہے۔ ایک شئے خود اپنے اندر کوئی تاثیر نہیں کرسکتی کیونکہ ایک ہی شئے کا قابل اور فاعل ہونا عقلاً محال ہے۔

آفتاب دوسروں کو منور کرتا ہے۔ اس کی شعاعیں زمین کے ہر ہر گوشہ کو روشن کر دیتی ہیں۔ مگر وہ شعاعیں آفتاب کو روشن نہیں کرتیں۔

تیسرا جواب

علاوہ ازیں اگر یہ تسلیم کرلیا جائے کہ آفتاب کی شعاعیں اور اس کے انوار خود آفتاب میں موثر ہو سکتے ہیں۔ تو کیا یہ انوار آفتاب کے تاریک اور مظلم بنانے کے لئے موثر ہو سکتے ہیں۔ ہرگز نہیں۔ اسی طرح خدا کی قدرت کاملہ خدا کو مردہ اور معیوب بنانے کے لئے کارآمد نہیں ہوسکتی۔

چوتھا جواب

یہ ہے کہ حق تعالیٰ کا وجود واجب اور ضروری ہے اور عدم اس کا محال اور ممتنع ہے اور قدرت کا تعلق محالات کے ساتھ ایجاداً (یعنی قدرت اس محال کو موجود کر دے) ہو سکتا ہے اور نہ اعداماً (یعنی قدرت اس محال کو معدوم کر دے) اس لئے کہ محال اس کو کہتے ہیں کہ جس کا عدم حتمی اور لازم ہو اور اس کا وجود میں آنا ناممکن ہو۔ پس اگر قدرت کا محال کے ساتھ اعداماً تعلق ہو تو معدوم کا معدوم کرنا لازم آتا ہے جس سے کوئی فائدہ نہیں اور اگر ایجاد اس کے متعلق ہو تو محال کا موجود ہونا لازم آتا ہے اور کوئی شئے وجود میں داخل ہونے کے بعد محال نہیں رہ سکتی۔ اور علی ہذا قدرت کا تعلق واجبات کے ساتھ نہ ایجاداً ہو سکتا ہے نہ اعداماً۔ ایجاداً تو اس وجہ سے نہیں ہو سکتا کہ موجود کرنا سراسر تحصیل حاصل ہے اور اعداماً اس وجہ سے نہیں ہو سکتا کہ واجب یعنی جس کا وجود ضروری اور حتمی تھا اس کا معدوم کرنا لازم آتا ہے۔ اور معدوم ہونے کے بعد وہ شئے واجب نہیں رہ سکتی۔

الحاصل اس کے قدیر اور مقتدر ہونے میں کوئی شک نہیں۔ اور اگر شک ہو تو کیونکر ہو ایسے حکیمانہ افعال اور مناظر قدرت کو دیکھ کر بھی اگر کوئی بدبخت اس کی قدرت کو نہ مانے تو اس کی مثال اس شخص کی سی ہوگی کہ جو مخمل اور کمخواب کو کہ جو قسم قسم کے نقش و نگار سے مزین ہو دیکھ کر یہ کہے کہ کپڑا کسی مردہ شخص یا اپاہج اور بے دست و پا انسان کا بنایا ہوا ہے۔

پانچواں جواب

نیز یہ سوال کرنا کہ کیا خدا تعالیٰ اپنا مثل بنا سکتا ہے۔ اس سوال کے معنی یہ ہیں کہ کیا خدا تعالیٰ اپنی الوہیت اور وحدانیت کو باطل کر سکتا ہے۔ ظاہر ہے کہ تمام عقلاء کے نزدیک یہ سوال مہمل ہے۔

نیز یہ سوال اسلام کے ساتھ مخصوص نہیں جو لوگ بھی خدائے علیم وقدیر کو مانتے ہیں ان سب پر یہ وارد ہوتا ہے۔

ارادہ

ارادہ کے معنی کسی شئے کے وجود اور عدم کو جو کہ قدرت کے اعتبار سے برابر تھے ان میں سے کسی ایک جانب کو اپنے اختیار سے ترجیح دینے کے ہیں۔ پس جو کچھ ہوتا ہے وہ اسی کے ارادہ سے ہوتا ہے۔ ازل میں جو کچھ ارادہ کرلیا تھا اب اسی کے مطابق ہورہا ہے۔ کما قال تعالیٰ:

﴿فَعَّالٌ لِّمَا يُرِيْدُ ۝﴾[1]

تَرجَمہ: ”جو ارادہ کرتا ہے وہی کر گزرتا ہے۔“

عالم میں اس قسم کا انضباط اور استحکام بدون ارادہ اور اختیار کے پیدا ہونا یقیناً محال ہے خدا کے افعال بدون ارادہ اور اختیار خود بخود مثل حرکت مرتعش کے صادر ہوتے تو عالم میں یہ انضباط اور استحکام اور حسن انتظام ہرگز نہ ہوتا۔ کما قال تعالیٰ:

﴿اِنَّمَآ اَمْرُهٗٓ اِذَآ اَرَادَ شَيْـًٔا اَنْ يَّقُوْلَ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ ۝﴾[2]

تَرجَمہ: ”وہ جب کبھی کسی چیز کا ارادہ کرتا ہے، اسے اتنا فرما دینا (کافی ہے) کہ ہوجا، وہ اسی وقت ہوجاتی ہے۔“

بندہ جس کام کا ارادہ کرتا ہے اسی کے مطابق اعضاء حرکت کرنے لگتے ہیں لیکن یہ کوئی نہیں بتلا سکتا کہ اعضاء کو اس ارادہ کا علم کس طرح ہو جاتا ہے۔ پس جب کہ بندہ ہی کے ارادہ کے تعلق کی کیفیت نہیں بتلائی جاسکتی تو خداوند ذوالجلال کے ارادہ کے تعلق کی حقیقت کون بتلا سکتا ہے۔ بلکہ جو شخص ارادہ کرتا ہے وہ خود اپنے ارادہ کے تعلق کی کیفیت سمجھانے سے قاصر اور عاجز ہے۔

---

[1] القرآن: ۸۵/۱۶ [2] القرآن: ۳۶/۸۲

ثبوت تقدیر

جو کام ارادہ اور اختیار سے کیا جاتا ہے پہلے اس کو سمجھ لیتے ہیں مکان اگر بناتے ہیں تو پہلے اس کا نقشہ تیار کر لیتے ہیں تاکہ مکان کی تعمیر نقشہ کے مطابق ظہور میں آئے۔

اس لئے ضروری ہے کہ اس عالم کا نقشہ بھی خدا کے یہاں پہلے ہی سے ایک پنہاں وجود رکھتا ہو اور اس نقشہ ہی کے مطابق اس وجود ظاہری کا کارخانہ برقرار ہوتا ہو۔ اہل اسلام اسی وجود پنہانی کو تقدیر کہتے ہیں۔

اس مقام پر دو شبہے ہیں۔[۱] پہلا شبہ یہ ہے کہ شر اور برائی کا اس کی مشیت سے واقع ہونا اس کی شان تقدس کے خلاف ہے۔ دوسرا شبہ یہ ہے کہ جب خدا ہی بندہ کے افعال کا خالق ٹھہرا تو برے اعمال میں بندہ کی کیا تقصیر ہوئی ایسی صورت مین بندہ کو سزا دینا کیا ظلم نہ ہوگا۔

معتزلہ

نے اس کی شان تنزیہ اور تقدیس کو قائم رکھنے کے لئے اور ظلم سے بچانے کے لئے یہ کہہ دیا کہ بندہ اپنے افعال کا خود خالق ہے اور خدا بندے کے افعال کا خالق نہیں۔ اور جب بندہ اپنے افعال کا خود خالق ہو گیا تو خدا کے تنزیہ اور تقدیس میں کوئی فرق نہ آیا۔ اور برے افعال کرنے سے بندہ ہی قصوروار رہتا ہے خدا ظالم نہیں ٹھہرتا۔

لیکن[۲] اس کہنے سے بندہ اپنے افعال کا خود خالق ہے اشکال نہیں رفع ہوتا۔ اس لئے کہ اگر افعال بالفرض بندہ ہی کے مخلوق ہوں تو وہ اخلاق اور ملکات اور وہ قدرت

---

[۱] اس مقام پر اصلی یہی دو شبہے ہیں۔ باقی شبہات ان کی فرع ہیں۔ تفصیل کے لئے شرح مقاصد للعلامۃ التفتازانی جلد۲ صفحہ ۱۴۷ تا صفحہ ۱۴۹ جلد۲، وصفحہ ۱۴۱، جلد۲، وصفحہ ۱۴۷ جلد۲، کی مراجعت کریں

[۲] ماخوذ از تقریر دلپذیر صفحہ ۱۰۳

اور اختیار کہ جس کے ذریعہ سے بندہ افعال کرتا ہے وہ بندہ کی مخلوق نہیں۔ اخلاق کو اخلاق اسی وجہ سے کہتے ہیں کہ وہ خلقی ہیں اخلاق جیسے خدا نے بنا دیئے ویسے ہی بن گئے اور ان کو کوئی بدل نہیں سکتا اور انہیں اخلاق پر جزا و سزا کا مدار ہے۔ جیسا تخم ہوتا ہے ویسا ہی پھل درخت کو لگتا ہے۔ اور جب جزا و سزا کا مدار تخم اخلاق پر ہوا۔ اور اخلاق خدا کی مخلوق ٹھہرے تو افعال کو اپنا مخلوق بتلانے سے کیا فائدہ ہوا۔

ہاں اپنے آپ کو خالق کہہ کر کم فہم اور بے ادب ہونا ثابت ہو گیا۔ افسوس کہ ان لوگوں نے جزا و سزا کی حقیقت کو نہ سمجھا جزا و سزا حقیقت میں تخم اخلاق اور اشجار اعمال کے پھل کا نام ہے۔ جیسے انار اور انگور ایک خاص تخم اور خاص درخت کے پھل کا نام ہے۔ درخت کو زمین کا مخلوق کہو یا خدا کا مخلوق پھل بہر حال لگتا ہے۔ ایسے ہی اعمال کو اپنا مخلوق بتلاؤ یا خدا کا، جزاء و سزا بہر حال مرتب ہوتی ہے اس کی کیا ضرورت تھی کہ خدا جیسے خالق کو چھوڑ کر اپنے کو خالق بتلا دیا۔ اگر جزاء و سزا ہی کا راست بٹھلانا تھا تو یہ کہہ سکتے تھے کہ پھل کے اچھے اور برے ہونے کا مدار اگرچہ تخم ہی پر ہے لیکن عرف میں درخت ہی کا پھل کہلاتا ہے ایسے ہی جزاء و سزا اگرچہ اخلاق ہی پر موقوف ہے۔ لیکن عرف میں عمل ہی کی جزاء و سزا کہتے ہیں۔

الحاصل اس فریق نے خدا کی تنزیہ اور تقدیس قائم رکھنے کے لئے بندہ کو خود اپنے افعال کا خالق مان لیا۔ لیکن جب ساتھ ہی ساتھ اخلاق کو خدا کا مخلوق مان لیا تو بندہ کو خالق مان لینے سے کوئی فائدہ نہ ہوا۔ اور قطع نظر اس سے کہ اس مقام پر کوئی فائدہ ہوا یا نہیں۔ بندہ کو خالق افعال ماننے سے اور چند اشکال سر پڑ گئے۔

پہلا اشکال

یہ ہے کہ بندہ کے مخلوقات خدا کی مخلوقات سے بڑھ جائیں کیونکہ بندہ جو خدا کا

لہ ماخوذ از تقریر دلپذیر صفحہ ۱۵ و فتح الباری جلد ۱۳ صفحہ ۴۴۱، باب قول اللہ تعالیٰ: وَاللّٰهُ خَلَقَكُمْ

مخلوق ہے وہ تو ایک ہے اور بندہ کے ایک ہی دن کے افعال اگر دیکھے جائیں تو لاکھوں تک پہنچ جاتے ہیں۔ اور اگر تمام عمر کے افعال کو دیکھا جائے تو اس کا تو کوئی شمار ہی نہیں۔

پس اگر ایک ارب انسان خدا کے پیدا کئے ہوئے ہیں تو ہر انسان کے افعال بھی ایک ارب سے کم نہ ہوں گے۔ اس صورت میں خدا کی مخلوقات کا حاصل جمع ایک ارب ہوتا ہے اور بندہ کی مخلوقات کا حاصل جمع سوارب ہوتا ہے۔ بندہ اگر اپنی عاجزی اور لاچاری اور خدا کی عظمت اور شوکت کا ذرا بھی خیال کرے تو ہرگز اپنے کو خالق نہ بتلائے۔

جو شخص دو اور دو چار اور دو دونی ہونے کا مطلب خوب سمجھ لے گا وہ ہرگز یہ نہیں کہہ سکتا کہ دو دونی پانچ ہوتے ہیں۔ اسی طرح جو خدا کی عظمت اور قدرت اور بندے کے عجز و نیاز کو خوب سمجھ لے گا اس سے یہ کسی طرح ممکن نہیں کہ وہ خدا کو عظیم و قدیر نہ مانے اور اپنے آپ کو خالق بتلائے۔

دوسرا اشکال

یہ کہ افعال[1] اختیار یہ گو انسان کے اختیار میں ہیں مگر یہ اختیار تو اس کے اختیار میں نہیں۔ یہ اختیار تو آپ کے نزدیک بھی اسی کا مخلوق ہے علاوہ ازیں جس جس چیز کی بندہ کو اپنے افعال میں حاجت ہے وہ سب اسی کی پیدا کی ہوئی ہیں۔ ہاتھ اور پیر۔ آنکھ اور زبان وغیرہ حتیٰ کہ یہ خود بندہ اسی کا پیدا کیا ہوا ہے۔ اس پر بھی اگر بندہ اپنے کو خالق کہے تو بعینہ ایسی مثال ہے کہ دو شخص ایک کھیت کی پیداوار پر تکرار کریں اور ایک شخص ان میں سے یہ اقرار کرے کہ یہ کھیت بھی تیرا ہے۔ بیج بھی تو نے ڈالا ہے۔ جوتنے کے لئے بیل بھی تو نے ہی دیئے۔ جو کچھ اس پر صرف ہوا وہ بھی تیرا ہی

وَمَا تَعْمَلُوْنَ ﴿۹۶﴾'' (القرآن: ۳۷/۹۶) ترجمہ: 'اور اللہ نے بنایا تم کو اور جو تم بناتے ہو۔

[1] ماخوذ از تقریر دلپذیر صفحہ ۱۶ ملل و نحل لابن حزم جلد ۳ صفحہ ۴۷

تھا۔ مگر بااین ہمہ پیداوار میری ہے سو ایسے ظالم کا جواب بجز سزا کے اور کیا ہوسکتا ہے ہر شخص یہی کہے گا کہ یہ بالکل غلط کہتا ہے۔

تیسرا اشکال

یہ ہے کہ افعال[1] کفر کا خالق ہونا شان تنزیہ اور تقدیس کے منافی ہے تو معدن کفر اور منبع ضلالت یعنی شیاطین کا خالق ہونا بہ درجہ اولی شان تقدیس کے بہت زائد منافی ہوگا۔

فما هو جوابكم فهو جوابنا۔

ہاں اگر شیاطین کے مخلوق خدا ہونے سے آپ انکار کر دیں تو ممکن ہے کہ آپ اس اشکال سے رہا ہوسکیں لیکن یہ ضرور بتلانا ہوگا کہ شیاطین پھر کس کی مخلوق ہیں اور کون ان کا خالق ہے۔

چوتھا اشکال

یہ ہے کہ اگر آپ[2] کے نزدیک خلق کفر کی نسبت خدا کی طرف اس کی شان کے منافی ہے تو خلق ایمان لامحالہ خیر ہوگا۔

لہٰذا آپ کو مناسب تھا کہ بندہ کو فقط کفر و معصیت کا خالق مانتے اور ایمان و ہدایت کا خالق خدا کو قرار دیتے کیونکہ بندہ کو فقط اس ضرورت سے خالق بتلایا گیا تھا کہ اس کی شان اقدس کی طرف کسی شر کی نسبت لازم نہ آئے اور یہ ضرورت بندہ کو فقط خالق کفر اور خالق معصیت ماننے سے مرتفع ہوسکتی ہے۔ علاوہ ازیں ایک فائدہ یہ ہوگا کہ بندہ کو فقط خالق کفر ماننے سے نسبت خلق الی العبد میں تقلیل ہو جائے گی اور خدا کو خالق ایمان ماننے سے خدا کی جانب میں ایک خیر کا اضافہ ہو جائے گا۔

---

[1] فتح الباری جلد ۱۳ صفحہ ۴۴۱ و ملل و نحل لابن حزم جلد ۳ صفحہ ۶۶ و جلد ۳ صفحہ ۴۷

[2] ملل و نحل لابن حزم جلد ۳ صفحہ ۱۰۲

پانچواں اشکال

یہ ہے کہ اگر بندہ[1] کو خود اپنے افعال کا خالق کہا جائے تو یہ کہنا پڑے گا کہ یہ افعالِ بندہ کے ملک ہیں خدا کی ملک سے خارج ہیں کیونکہ خدا جب ان افعال کا خالق ہی نہیں تو مالک کیسے ہوگا۔

اس صورت میں جزا و سزا کی حقیقت صرف مزدوری اور اجرت رہ جاتی ہے اور بندہ اور خدا کی حیثیت نوکر اور آقا کی سی رہ جاتی ہے۔ جیسے نوکر کی نوکری خدمت کرنے سے آقا کے ذمہ لازم ہو جاتی ہے۔ اسی طرح خدا کی اطاعت کرنے سے خدا کے ذمہ اس کی جزاء واجب ہو جاتی ہے۔

چھٹا اشکال

یہ ہے کہ خدا[2] اور بندہ کی حیثیت آقا اور نوکر کی سی ہوئی تو بندہ کا خدا کے برابر ہونا لازم آئے گا۔ اس لئے کہ نوکر نوکری سے پہلے تو آقا کے برابر ہوتا ہی ہے۔ مگر نوکری کے بعد بھی برابر رہتا ہے۔ کیونکہ جب آقا کی خدمت اور تعظیم مول کی ہے تو اس صورت میں بے شک وہ تعظیم اور نوکری دونوں برابر ہوں گی اس لئے کہ مول کی چیز مول ہی کے برابر ہوتی ہے۔

ساتواں اشکال

یہ ہے کہ جیسا کہ[3] نوکر روپیہ کا محتاج ہوتا ہے اور اسی کی طمع میں خدمت کرتا ہے ایسا ہی آقا نوکر کی خدمت کا محتاج ہوتا ہے اور اسی وجہ سے اپنا عزیز مال صرف کرتا ہے۔

پس اگر خدا اور بندوں میں بھی آقائی اور نوکری کا علاقہ ہو تو بندہ تو محتاج تھا ہی خدا بھی محتاج نکلے گا۔

---

[1] ماخوذ از تقریر دلپذیر صفحہ ۱۰۶ [2] ماخوذ از تقریر دلپذیر صفحہ ۱۰۷

[3] ماخوذ از تقریر دلپذیر صفحہ ۱۰۷

آٹھواں اشکال

یہ ہے کہ بندوں[1] کا رتبہ خدا سے بھی بڑھ جائے۔ اس لئے کہ ایسے دو شخصوں میں کہ ایک پر دوسرے کی اطاعت لازم ہو پانچ قسم کے علاقے ہوتے ہیں۔

نوکری، غلامی، احسان، خدمت، عشق ومحبت۔

پہلی صورت میں دونوں طرف سے مطالبہ ہوسکتا ہے آقا خدمت کا مطالبہ کرسکتا ہے۔ اور نوکر اجرت کا، باقی چار صورتوں میں صرف ایک طرف سے مطالبہ ہوسکتا ہے۔ مالک، محسن، حاکم اور محبوب کو مطالبہ کا حق حاصل ہے۔ مگر مملوک اور مرہون احسان اور محکوم اور عاشق کو کسی مطالبہ کا حق حاصل نہیں۔ اور ظاہر ہے کہ بندوں میں یہ پانچوں قسم کے علاقے پائے جاتے ہیں۔

پس اگر خدا اور بندوں میں صرف آقائی اور چاکری کا علاقہ ہو تو خدا بندوں سے چار علاقوں کے اعتبار سے کم رہا۔ نیز اگر خدا کو خدمت کے مطالبہ کا حق ہے تو بندوں کو اجرت کے مطالبہ کا حق ہے اور ایک درجہ میں بندہ کا اس پر دباؤ ہے۔

﴿سُبۡحٰنَ رَبِّكَ رَبِّ الۡعِزَّةِ عَمَّا يَصِفُوۡنَ ۝﴾[2]

ترجمہ: ”پاک ذات ہے تیرے رب کی وہ پروردگار عزت والا پاک ہے ان باتوں سے جو بیان کرتے ہیں۔“

نواں اشکال

یہ ہے کہ اگر بندہ[3] اپنے افعال کا خالق ہوتا تو اس کو اپنے افعال اور اختیاری سکنات وحرکات کی تمام کیفیتوں کا تفصیلی علم ہوتا اس لئے کہ یہ ناممکن ہے کہ خالق کو اپنی مخلوق کا تفصیلی علم نہ ہو۔ کما قال تعالیٰ:

---

[1] ماخوذ راز تقریر دلپذیر صفحہ ۱۰۷
[2] القرآن: ۳۷/۱۸۰
[3] کذا فی شرح المواقف جلد ۸ صفحہ ۱۴۸

﴿ اَلَا یَعْلَمُ مَنْ خَلَقَ ﴾[1]

ترجمہ: ''کیا جس نے پیدا کیا وہ اپنی مخلوق کو نہیں جانتا۔''

دسواں اشکال

نیز جب خدا تعالیٰ کی قدرت[2] کامل اور غیر متناہی ہے اور بندہ اور اس کی ذات و صفات اور اس کے تمام افعال اور حرکات وسکنات سب ممکن ہیں تو پھر کس چیز نے خدا کی قدرت کاملہ کے تعلق کو بندہ کے افعال سے روک دیا۔ اور کس چیز نے اس کے حیطۂ قدرت اور دائرہ تکوین کو محدود کر دیا۔

﴿ فَتِلْكَ عَشَرَةٌ كَامِلَةٌ. ﴾

دس اشکال تو پورے ہو گئے جو مذہب اعتزال کے باطل کرنے کے لئے کافی اور وافی ہیں۔ بطور علاوہ یعنی رونگے میں کچھ اور بھی لیتے جائیے۔ وہ یہ کہ ایک ادنی حاکم کو یہ گوارا نہیں کہ جس شہر میں وہ حاکم ہے اس کے کسی حکم کی مخالفت کی جائے لیکن معتزلہ کے مذہب پر خدا تو چاہتا ہے کہ بندے ایمان لائیں۔ لیکن بندے علی الاعلان اس کی نافرمانی کر رہے ہیں۔ خدا کی مشیت اور ارادہ ناکام ہے۔

﴿ سُبْحَانَهٗ وَتَعَالٰى عَمَّا يَقُوْلُوْنَ عُلُوًّا كَبِيْرًا. ﴾[3]

ترجمہ: ''وہ پاک ہے اور برتر ہے ان کی باتوں سے بے نہایت۔''

خلاصہ

یہ کہ جس غرض اور ضرورت سے خلق افعال کے قائل ہوئے تھے وہ ضرورت تو رفع نہ ہوئی اور الٹی خرابیاں سر پڑ گئیں۔

جبریہ

فرقہ جبریہ نے دیکھا کہ بندہ کو اپنے افعال کا خالق اور فاعل مستقل قرار دینا تو

---

[1] القرآن: ۶۷/۱۴ [2] کما فی الاتحاف شرح الاحیاء جلد ۲ صفحہ ۱۶۴ [3] القرآن ۱۷/۴۳

سراسر عقل اور نقل کے خلاف ہے خدا تعالیٰ کا خالق الکل ہونا سب کے نزدیک مسلم ہے۔ بندہ کو اپنے افعال کا خالق ماننے کا یہ مطلب ہے کہ حق تعالیٰ خالق الکل نہیں۔ بندہ کے افعال خدا کی خالقیت سے مستثنیٰ ہیں۔

اس لئے فرقہ جبریہ نے خدا کی توحید وتفرید اور تنزیہ وتقدیس کا تو اعتراف کیا۔ لیکن قضاء وقدر کا عقدہ حل کرنے کے لئے یہ قرار دیا کہ بندہ مجبور محض ہے۔ بندہ میں کسی قسم کی قدرت نہیں۔ بندہ کی حرکات وسکنات بعینہٖ ایسی ہی ہیں جیسا کہ ہوا سے درخت کی شاخیں اور پتے حرکت کرنے لگتے ہیں۔ اور اس حرکت میں پتوں اور شاخوں کے ارادہ کو دخل نہیں۔

اس فرقہ کے نزدیک دنیا کے سارے مجرم معذور اور بے قصور ہیں ان کے نزدیک دنیا میں کوئی گناہ اور عیب ہی نہیں۔ جو کچھ ہو رہا ہے وہ سب اللہ تعالیٰ کی مشیت سے ہو رہا ہے۔ بندہ کوئی فعل کرے اس پر کوئی مواخذہ نہیں۔ تمام افعال یکساں اور برابر ہیں نہ کوئی شئے اطاعت ہے اور نہ کوئی شئے معصیت۔

غرض یہ کہ اس فرقہ کے نزدیک حسن اور قبح، خیر اور شر، نیک اور بد کی تقسیم ہی غلط ہے۔ مؤمن اور کافر، حضرت آدم علیہ السلام اور ابلیس، حضرت موسیٰ علیہ السلام اور فرعون، ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور ابوجہل۔ اس فرقہ کے نزدیک سب برابر ہیں۔

اب اہل عقل خود غور کر لیں۔ کہ یہ مذہب کس درجہ عقل سے بعید ہے۔ کیا اہل عقل کے نزدیک انسان کی اختیاری اور ارتعاشی حرکت میں کوئی فرق نہیں۔ کیا پہاڑ پر چڑھنا اور اوپر سے گرنا دونوں برابر ہیں۔ کون نہیں جانتا کہ بلندی پر چڑھنا انسان کا اختیاری فعل ہے اور اوپر سے نیچے گرنا غیر اختیاری امر ہے اگر انسان حقیقت میں شجر اور حجر کی طرح قدرت اور اختیار سے عاری ہے تو پھر دنیاوی کاروبار میں انسان کو امر و نہی کیوں کیا جاتا ہے۔

جس طرح شجر اور حجر کو امر و نہی کرنا خلاف عقل ہے۔ اسی طرح انسان کو بھی امر و

نہی کرنا خلاف عقل ہونا چاہئے۔ اور جس طرح شجر و حجر کی مدح و ذم خلاف عقل ہے اسی طرح انسان کی مدح و ذم بھی عقلاً ممنوع ہونی چاہئے۔ اور نہ کسی جرم پر اس کو سزا ملنی چاہئے اس لئے کہ وہ بالکل مجبور محض ہے۔

معلوم ہوا کہ انسان کو شجر اور حجر کی طرح اختیار اور ارادہ سے عاری سمجھنا سراسر عقل اور بداہت کے خلاف ہے جس کو ذرا بھی عقل ہے وہ تو اس کو مان نہیں سکتا مجنون اور دیوانہ کی بڑ کا کوئی اعتبار نہیں۔

مسئلہ تقدیر کے متعلق اہل حق کی تحقیق

اہل حق نے جب یہ دیکھا کہ نہ فرقہ قدریہ اس عقدہ کو حل کر سکا اور نہ فرقہ جبریہ۔ اس لئے اہل حق متوجہ ہوئے کہ طالبان حق کے سامنے عقل اور نقل کی روشنی میں ایسی تشفی بخش تحقیق پیش کی جائے کہ جس سے قلوب مطمئن ہو جائیں اور خصوصاً پیش کردہ شبہات کا قلع اور قمع ہو جائے۔

اہل حق کہتے ہیں کہ جب یہ ثابت ہو گیا کہ انسان نہ تو خالق اور فاعل مستقل ہے اور نہ شجر اور حجر کی طرح مجبور محض ہے تو یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ نہ جبر محض ہے نہ قدر محض۔ انسان نہ فاعل مستقل ہے اور نہ شجر اور حجر کی طرح مجبور محض ہے۔ ایک بین بین حالت میں ہے۔ بندہ اپنے افعال کا خالق اور فاعل مستقل نہیں۔ فاعل مستقل اور خالق تو ہر شئے کا خدا تعالیٰ ہی ہے لیکن اس قادر مطلق اور مختار کل نے کچھ قدرت اور اختیار اور ارادہ بندہ کو بھی عطا کیا ہے کہ جس سے بندہ اپنے مولیٰ کی اطاعت اور فرمانبرداری کر سکے۔ اسی وجہ سے بندہ کو کاسب کہا جاتا ہے۔ اور اس خدا داد قدرت اور اختیار سے بندہ جو فعل کرتا ہے اصطلاح شریعت میں اس کو کسب کہتے ہیں۔ اور اسی وجہ سے بھلائی اور برائی اس کی طرف منسوب کی جاتی ہے۔ اور اسی کسب پر مدح اور ذم کا مستحق ہوتا ہے۔ اور اسی پر جزاء و سزا ثواب اور عذاب ملتا ہے۔

؎ چلا عدم سے میں ہستی کو بول اٹھی تقدیر
بلا میں پڑنے کو کچھ اختیار لیتا جا

لہٰذا برے افعال کے ارتکاب سے بندہ ہی کو برا کہا جائے گا خالق ہونے کی وجہ سے خدا تعالیٰ کی طرف کوئی برائی منسوب نہیں کی جا سکتی۔ تلوار چلانے والے ہی کو قاتل کہا جاتا ہے۔ تلوار بنانے والے کو نہ کوئی قاتل کہتا ہے اور نہ کوئی برائی اس کی طرف منسوب کی جاتی ہے تلوار کا بنانا تو کمال ہی کمال ہے لیکن اگر اس کا استعمال بے محل ہے تو وہ بلاشبہ معیوب اور مذموم ہے۔ رنگریز کو اسود یعنی سیاہ نہیں کہا جا سکتا جو کپڑا سیاہ رنگ میں رنگ گیا ہے اسی کو سیاہ کہا جائے گا۔ اسی طرح کافر اور گمراہ وہی کہلائے گا کہ جو کفر اور ضلالت کی سیاہی میں رنگین ہے۔ جس نے کفر اور ضلالت کی سیاہی کو پیدا کیا اس کی طرف کوئی برائی منسوب نہیں کی جا سکتی اس خلاق عالم نے تو سیاہ اور سفید کفر اور ایمان ہر قسم کے رنگ پیدا کئے اور تمہارے سامنے کر دیئے اور خوب اچھی طرح بتلا دیا کہ یہ رنگ اچھا ہے اور یہ برا، بھلے اور برے میں امتیاز کے لئے تم کو عقل دی کرنے اور نہ کرنے کی تم کو قدرت دی۔ اس پر بھی اگر کوئی ایمان کے صاف اور سفید رنگ کو چھوڑ کر کفر کی سیاہی اپنے قلب کو لگا لے تو یہ اس کا قصور ہے۔

حکایت

امام اعظم ابوحنیفہ رحمہ اللہ تعالیٰ سے منقول ہے کہ ایک مرتبہ امام موصوف نے امام جعفر صادق رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے یہ دریافت کیا کہ ''اے صاحبزادۂ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم! کیا حق تعالیٰ نے کوئی امر بندوں کے تفویض اور سپرد فرمایا ہے کہ وہ اپنے اختیار سے جو چاہیں کریں؟'' ارشاد فرمایا کہ اللہ عزوجل اس سے پاک اور منزہ ہے کہ اپنی ربوبیت بندوں کے سپرد فرمائے۔ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ تعالیٰ نے عرض کیا کہ کیا اللہ تعالیٰ نے بندوں پر کوئی جبر کیا ہے اور کسی چیز کے کرنے پر ان کو مجبور کیا ہے۔ ارشاد

فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کی شان عدل سے یہ بعید ہے کہ وہ بندوں کو کسی امر پر مجبور کرے اور پھر اس پر ان کو عذاب دے۔ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ تعالیٰ نے عرض کیا کہ پھر کیا صورت ہے۔ تو فرمایا کہ حالت بین بین ہے نہ جبر ہے اور نہ تفویض، نہ اکراہ ہے اور نہ تسلیط۔[۱]

پس جب یہ ثابت ہو گیا کہ بندہ شجر اور حجر کی طرح مجبور نہیں بلکہ خداوند ذوالجلال نے اس کو کچھ اختیار اور ارادہ عطا فرمایا ہے کہ جس سے وہ اپنے سخت سے سخت دنیوی کاروبار چلاتا ہے اور قوانین حکومت کا مکلّف اور پابند سمجھا جاتا ہے بلکہ وہ خود بھی اپنے کو آئین اور دستور کا پابند سمجھتا ہے۔ تو سمجھ لو کہ اسی طرح بندہ احکام الٰہیہ کا بھی مکلّف ہوسکتا ہے۔ اور اسی خداداد اختیار سے جو افعال اس سے صادر ہوں ان پر مدح و ذم ثواب اور عتاب، جزاء اور سزا مرتب ہوسکتی ہے۔ اور اسی خداداد اختیار سے بندہ جو فعل کرتا ہے اسی کا نام اصطلاح شریعت میں کسب ہے۔

لہٰذا یہ شبہ تو کافور ہوا کہ اگر خدا تعالیٰ ہی بندہ کے افعال کا خالق ہو تو ایسی صورت میں بندہ کا کیا قصور اور ایسی صورت میں بندہ کو سزا دینا ظلم ہے۔

جھوٹ بولتا ہے خدا تعالیٰ نے کوئی ظلم نہیں کیا یہ خود ہی ظالم ہے کہ دیدہ و دانستہ اور بہزار رضاء و رغبت باوجود ممانعت کے معصیت کا مرتکب ہوا اور پھر اپنے کو مظلوم بتاتا ہے کیا یہ کھلی ہوئی بے حیائی نہیں کہ جرم خود کرتا ہے۔ اور اس کا بوجھ اور ذمہ داری خداوند قدوس پر رکھنا چاہتا ہے۔

﴿سُبْحَانَهٗ وَتَعَالٰى عَمَّا يَقُوْلُوْنَ عُلُوًّا كَبِيْرًا.﴾[۲]

ترجمہ: ”وہ پاک ہے اور برتر ہے ان کی باتوں سے بے نہایت۔“

پہلا شبہ باقی رہ گیا کہ شر اور برائی کا اس کی مشیت سے واقع ہونا اس کی شان تقدس کے خلاف ہے۔ سو اس کا جواب یہ ہے کہ ہم گزشتہ صفحات میں یہ ثابت کر چکے ہیں کہ خلق قبیح، قبیح نہیں اور ایجاد شر، شر نہیں۔

---

۱ کذا فی المکتوبات المجددیہ   ۲ القرآن ۱۷/۴۳

پاخانہ فی حد ذاتہ بے شک ناپاک اور بہت بری چیز ہے مگر قصر شاہی کے لئے اس کا وجود ضروری ہے۔ قصر شاہی بغیر بیت الخلاء کے غیر مکمل اور ناتمام ہے۔ سیاہ بال اور سیاہ خال اگرچہ فی حد ذاتہ بدنما اور برے ہیں۔ مگر آفتاب اور ماہتاب جیسے چہرہ کی رونق اور دل آویزی کو جس حد تک پہنچا دیتے ہیں۔ غالباً اس سے کوئی بے خبر نہیں۔ معدہ اور امعاء اگرچہ سرتاپا نجاست ہیں مگر اس میں شک نہیں کہ مدار حیات ہیں۔

بہر حال یہ چیزیں گو انفرادی طور پر بری ہیں مگر مجموعہ کے لحاظ سے خیر محض ہیں مجموعہ بدون ان کے بے زیب رہتا ہے جس طرح ایک انسان میں بدون خال اور سایہ بالوں کے حسن نہیں پیدا ہوتا۔ اسی طرح مجموعہ عالم میں بدون کفر اور ضلالت کی سیاہی کے حسن نہیں پیدا ہو سکتا۔ مجموعہ عالم میں حسن جب ہی آ سکتا ہے کہ جب اس میں حسین چہرہ کی طرح ایمان و ہدایت بھی ہو اور سیاہ بالوں اور نجاست معدہ کی طرح کفر و ضلالت بھی ہو۔

ایمان و ہدایت اپنی ذات سے حسین ہیں اور کفر و ضلالت اپنی ذات سے قبیح۔ مگر ایجاد اور خلق دونوں کا حسن اور خیر ہے۔ کیونکہ مجموعہ عالم کے لئے جیسے خیر کی ضرورت ہے ویسے ہی شر کی بھی ضرورت ہے ورنہ مقصد ناقص اور ناتمام رہتا ہے۔ اس لئے کہ ایجادِ[1] عالم سے مقصود حق تعالیٰ کا کوئی اپنا ذاتی نفع اور نقصان نہیں، بنانے سے اس کے کمالات میں کوئی اضافہ نہیں اور نہ بنانے سے کوئی کمی نہیں۔ مقصد صرف اس قدر ہے کہ اپنے کمالات اور صفات کے مظاہر پیدا فرمائے اور اپنی خوبیوں کو ظاہر کرے۔ کہ اس کے کمالات کسی ایک دائرہ میں محدود نہیں۔ بلکہ مختلف قسم کے ہیں۔ اگر وہ رحم و کرم کا مالک ہے تو عقاب و الم کا بھی مالک ہے۔ معز اور مذل بھی ہے، منعم اور منتقم بھی ہے۔ پس اگر بعض صفات کمالیہ کے مظاہر پیدا کئے جائیں اور بعض کے نہ پیدا کئے

[1] ماخوذ از صراط مستقیم مصنفہ مولانا اسمٰعیل شہید رحمہ اللہ تعالیٰ صفحہ ۴۷ و تفسیر غرائب القرآن للعلامۃ النیشاپوری جلد ا صفحہ ۱۴۵ مطبوعہ بر حاشیہ تفسیر ابن جریر طبری رحمۃ اللہ علیہ

جائیں تو مقصد ناتمام رہتا ہے۔ اس لئے ضروری ہوا کہ انعام اور انتقام، اعزاز و اکرام دونوں ہی کے مظاہر پیدا کئے جائیں۔ یعنی مؤمن بھی ہوں اور کافر بھی۔ دار انعام بھی ہو اور دار انتقام بھی۔ ابوبکر اور عمر بھی ہوں ابوجہل اور ابولہب بھی ہوں۔

؎ درکار خانہ عشق از کفر ناگزیر ست
دوزخ کرا بسوزد گر بولہب نہ باشد

پس منکرین کو اس واسطے پیدا کیا تا کہ ان کو عذاب دے اور صفت قہر و غضب کا اظہار ہو۔ اور مؤمنین کو اس لئے پیدا کیا تا کہ ان کو مورد الطاف بنائے اور صفت ترحم کا اظہار ہو۔ اور گنہگاروں کو اس لئے پیدا فرمایا تا کہ صفت عفو اور مغفرت کا اظہار ہو۔

کما قال تعالیٰ:

﴿لِيُعَذِّبَ اللّٰهُ الْمُنٰفِقِيْنَ وَالْمُنٰفِقٰتِ وَالْمُشْرِكِيْنَ وَالْمُشْرِكٰتِ وَيَتُوْبَ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ۝﴾[1]

ترجمہ: ”تا کہ حق تعالیٰ منافقین اور منافقات کو اور مشرکین اور مشرکات کو عذاب دیں اور مؤمنین اور مؤمنات پر توجہ فرمائیں اور بے شک حق تعالیٰ غفور رحیم ہیں۔“

انسان[2] دست قدرت پر ایسا ناچتا ہے جیسا کہ ایک پتلی، پتلی والے کے ہاتھ پر ناچتی ہے، پتلی والا کبھی پتلی سے بادشاہ اور وزیر کا کام لیتا ہے اور کبھی جاروب کشی اور بھنگی کا کام لیتا ہے جو چاہتا ہے اچھا اور برا کام اس سے لیتا ہے مگر پتلی کو انکار کی گنجائش نہیں اور نہ پتلی کو یہ حق ہے کہ پتلی والے سے یہ سوال کر سکے کہ مجھ سے جاروب کش کا کام کیوں لیا اور بادشاہ کا کام کیوں نہیں لیا۔ حالانکہ وہ پتلی بھی پتلی والے کی طرح خدا کی مخلوق ہے پس جب کہ ایک پتلی، پتلی والے سے یہ سوال نہیں کر

---

[1] القرآن ۳۳/۷۳ [2] ماخوذ از تقریر دلپذیر صفحہ ۹۰

سکتی تو مخلوق کو خالق سے سوال اور محاسبہ کا کہاں حق ہو سکتا ہے کہ مجھ کو نالائق و ناہنجار یعنی کافر و بدکار کیوں بنایا اور فلاں کو صالح اور نیک اطوار یعنی مؤمن کیوں بنایا۔

مالک[1] کو اختیار ہے کہ جس تختہ کو چاہے شہ نشین میں لگائے اور جس تختہ کو چاہے بیت الخلاء کے قدمچہ میں لگائے اور جس تختہ سے چاہے قرآن رکھنے کی رحل بنائے، جس لکڑی کو چاہے چھت میں لگائے اور جس کو چاہے چولہے کا ایندھن بنائے۔ نہ یہ کوئی ظلم ہے نہ کسی کو مجال دم زدنی ہے اور نہ کسی تختہ کو کسی قسم کے سوال کا کوئی حق ہے مالک کو اختیار ہے کہ جس لوہے سے چاہے تلوار بنائے اور جس لوہے سے چاہے اپنے گھوڑے کے نعل بنوائے۔

مکان میں[2] راحت اور آرام کے لئے دالان اور قضاء حاجت کے لئے بیت الخلاء بناتے ہیں۔ اگر بیت الخلاء کی زبان ہو اور وہ یہ شکایت کرے کہ میرا کیا قصور ہے کہ جو ہر روز مجھ میں نجاست اور گندگی ڈالی جاتی ہے اور دالان نے کیا انعام کا کام کیا ہے کہ جو فرش اور قالینوں اور گلدستوں سے آراستہ ہے تو اس کا جواب یہی ہوگا کہ تو اسی لائق ہے اور ہم نے تجھ کو اس لئے بنایا ہے اور وہ اسی قابل ہے اور اس کو اسی لئے بنایا ہے۔

علیٰ ہذا القیاس اگر گندگی یہ شکایت کرے کہ میرا کیا قصور ہے کہ جو مجھ کو ہمیشہ بیت الخلاء ہی میں ڈالا جاتا ہے کبھی دالان نصیب نہیں ہوتا سو اس کا بھی یہی جواب ہے۔

ایسا ہی بدوں اور گندوں (کافروں) کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ یہ سوال کر سکیں کہ ہم کو ایسا کیوں بنایا اور ہم کو کیوں دوزخ میں ڈالا جاتا ہے اور اگر یہ سوال کریں تو یہی جواب ہے کہ تم اسی لائق ہو۔ ہم نے تم کو اسی لئے پیدا کیا ہے کہ تم ہماری جہنم کا

---

[1] ماخوذ از صراط مستقیم صفحہ ۴۷

[2] ماخوذ از رسالہ حجۃ الاسلام صفحہ ۲۷ مصنفہ مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمہ اللہ تعالیٰ

ایندھن بنو۔

کما قال تعالیٰ: ﴿ وَلَقَدْ ذَرَأْنَا لِجَهَنَّمَ كَثِيرًا مِّنَ الْجِنِّ وَالْإِنسِ ۖ ﴾ [1]

ترجمہ: ”بیشک ہم نے جہنم کے لئے بہت سے جنات اور انسان پیدا کئے ہیں۔“

ہر یکے را بہر کارے ساختند
میل او را در دلش انداختند

پس الحمد للہ یہ ثابت ہو گیا کہ ایجاد شر شر نہیں کیونکہ خلق اور ایجاد کے معنی اعطاء وجود کے ہیں یعنی کسی شئے کو وجود عطا کرنے کے ہیں۔ خالق کی طرف سے صرف وجود آتا ہے جو کہ نور اور سراسر خیر ہے۔ برائی اور شر جو کچھ ہے وہ اس مخلوق کی ذات ہے اور مخلوق کا خالق سے مباین اور منفصل ہونا ایک کھلی ہوئی بات ہے۔

پس جب کہ مخلوق خالق سے بالکل مباین اور منفصل ہے اب اگر مخلوق فی ذاتہ قبیح ہو تو اس سے خالق یا اس کی ایجاد کی طرف کوئی قبیح منسوب نہیں ہو سکتا۔

کسی کوزہ کا بدنما ہونا کوزہ گر کے بدنما ہونے کو مستلزم نہیں۔ کسی حرف کا بدنما ہونا کاتب کے بدنما ہونے کی دلیل نہیں۔ اس لئے کہ کوزہ، کوزہ گر سے اور حرف کاتب سے ایک منفصل اور جدا چیز ہے۔

رضا بالقضاء

اسی بیان سے یہ اشکال بھی حل ہو گیا کہ جب تمام معصیتیں اسی کی قضاء وقدر سے واقع ہوتی ہیں اور اہل اسلام کے نزدیک رضا بالقضاء بھی لازم ہے تو تمام معاصی پر بھی راضی ہونا لازم اور ضروری ہوگا۔ اس لئے کہ ہم ابھی بتلا چکے ہیں کہ خالق کے

[1] القرآن ۷/۱۷۹

ایجاد اور اس کی مخلوق میں فرق ہے کیونکہ ایجاد خالق کی صفت ہے اور اس کے ساتھ قائم ہے اور مخلوق خالق سے ایک منفصل اور جدا شئے ہے اسی طرح قضاء وقدر اور شئے ہے۔ اور مقضی یعنی جس چیز پر قضا وقدر واقع ہوئی وہ اور شئے ہے۔ تقدیر اور ہے اور مقدر تقدیر سے ایک علیحدہ چیز ہے۔ کیونکہ تقدیر اور قضاء حق تعالیٰ کا ایک فعل ہے۔ اور مقضی اور مقدر اس فعل کا مفعول ہے۔

پس معاصی خود قضا وقدر نہیں بلکہ محل تقدیر اور محل قضاء ہیں۔ لہٰذا تقدیر اور قضاء جو کہ فعل خداوندی ہے اس پر راضی ہونے سے یہ لازم نہیں آتا کہ اس محل تقدیر پر بھی رضا ضروری ہو۔ مثلاً اگر یہ کہا جائے کہ سنکھیہ کا ایجاد کرنا ایک بہت بڑا کمال ہے تو اس ایجاد کے پسندیدہ ہونے سے یہ لازم نہیں آتا کہ سنکھیہ بھی کوئی ایسی محبوب اور پسندیدہ شئے ہو جائے کہ اس کا استعمال جائز ہو جائے۔

ٹھیک اسی طرح ایجاد شر اور تخلیق معصیت کا پسندیدہ ہونا اس کو مستلزم نہیں کہ اس شر اور معصیت کا ارتکاب بھی پسندیدہ ہو۔ اور اسی وجہ سے ارشاد ہے:

﴿وَلَا يَرْضٰى لِعِبَادِهِ الْكُفْرَ﴾[1]

تَرجَمہ: ”اور اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کے کفر پر راضی نہیں۔“

صدور اور خلق کا باہمی فرق

بہر حال ایجاد شر، شر نہیں۔ ہاں صدور شر بے شک شر ہے۔ کیونکہ صدور مصدر سے کسی وصف کے ظاہر ہونے کا نام ہے۔ اور یہ وصف اولاً اور بالذات مصدر میں ہوتا ہے اور دوسری چیزیں اسی کے پرتوہ سے اس وصف کے ساتھ موصوف ہوتی ہیں۔

پس اسی لئے کہ تمام کمالات اور ساری خوبیاں اسی کی ذات میں موجود ہیں اور اسی کے فیض اور پرتوہ سے یہ کمالات مخلوقات میں ظاہر ہوتے ہیں۔ اس وجہ سے اس کو

---

[1] القرآن ۳۹/۷

مصدر کمالات اور مصدر خیر کہا جائے گا۔ مگر مصدر شر نہیں کہہ سکتے۔ اس لئے کہ اس کی ذات شر اور برائی سے بالکل پاک ہے۔

جیسے آفتاب کو مصدر نور اور منبع ضیا کہہ سکتے ہیں مگر مصدر ظلمت نہیں کہہ سکتے اس لئے کہ اس میں نور ہی نور ہے۔ ظلمت کا نام ونشان بھی نہیں۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ اس کی شعاعیں ہر پاک اور ناپاک پر واقع ہوتی ہیں۔

اسی طرح حق تعالیٰ کی ایجاد خیر وشر، ایمان وکفر، ہدایت وضلالت سب ہی پر واقع ہوتی ہے۔ مگر اس کی ذات میں سوائے خیر محض کے اور کچھ نہیں اور اسی وجہ سے جب صدور خیر وشر کا ذکر آتا ہے تو صدور خیر کو حق تعالیٰ کی جانب منسوب کیا جاتا ہے اور صدور شر کو بندہ کی جانب۔ قال تعالیٰ:

﴿مَآ اَصَابَكَ مِنْ حَسَنَةٍ فَمِنَ اللّٰهِ ۫ وَمَآ اَصَابَكَ مِنْ سَيِّئَةٍ فَمِنْ نَّفْسِكَ ؕ﴾[1]

ترجمہ: ”تجھ کو جو کچھ بھلائی پہنچتی ہے وہ اللہ کی جانب سے ہے اور برائی خود تیرے نفس سے پہنچتی ہے۔“

اس آیت میں خیر کو حق تعالیٰ کی طرف منسوب کیا اور کلمۂ مِن کو استعمال کیا یعنی خیر اور حسنہ اللہ کی طرف سے آتی ہے اور شر اور سیئہ خود انسان سے آتی ہے۔ اور حدیث میں ہے۔

”اَلْخَيْرُ كُلُّهٗ فِيْ يَدَيْكَ وَالشَّرُّ لَيْسَ اِلَيْكَ“

ترجمہ: ”ساری بھلائیاں آپ کے قبضہ میں ہیں۔ اور کوئی برائی آپ کی طرف منسوب نہیں کی جاسکتی۔“

اور جس جگہ ایجاد خیر وشر کا ذکر آیا تو دونوں ہی کی ایجاد کو اپنی جانب منسوب فرمایا اس لئے کہ ایجاد خواہ خیر کی ہو یا شر کی بہرحال کمال ہے۔ کما قال تعالیٰ:

---

[1] القرآن: ۴/۷۹

﴿قُلْ كُلٌّ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ ؕ﴾[1]

ترجمہ: ''کہہ دیجئے سب چیزیں اللہ کی پیدا کی ہوئی ہیں۔''

اوراس مقام پر بجائے کلمہ من کے عند کا لفظ استعمال فرمایا ہے۔

اور اسی وجہ سے حضرات فقہاء فرماتے ہیں کہ حق تعالیٰ کو خالق القردۃ والخنازیر کہنا جائز نہیں کیونکہ ان چیزوں کو خلق کے لئے مخصوص کرنے میں اگر استہزاء نہیں تو سوء ادب ضرور ہے اس لئے خالق کل شیء کہنا چاہئے۔ چنانچہ حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اسی ادب کو ملحوظ رکھ کر ''وَاِذَا مَرِضْتُ فَهُوَ يَشْفِيْنِ''[2]

ترجمہ: (اور جب میں بیمار ہوں تو وہی شفا دیتا ہے)۔ میں مرض کو جو کہ ایک ناگوار اور مکروہ شئے تھی اپنی جانب منسوب فرمایا اور شفاء جو کہ ایک مرغوب اور محبوب شئے تھی اس کو خدا کی جانب منسوب کیا اور یہ نہیں فرمایا کہ:

﴿وَاِذَا اَمْرَضَنِيْ فَهُوَ يَشْفِيْنِ﴾

ترجمہ: ''اور وہ جب مجھ کو مریض کرتا ہے تو پھر وہی شفا دیتا ہے۔''

بلکہ یہ فرمایا:

﴿وَاِذَا مَرِضْتُ فَهُوَ يَشْفِيْنِ ۝﴾[3]

ترجمہ: ''جب میں بیمار ہوتا ہوں تو وہ شفا دیتا ہے۔''

اسی طرح حضرت ایوب علیہ الصلوٰۃ والسلام نے شدت مرض کی حالت میں یہ فرمایا۔

﴿رَبِّ اَنِّيْ مَسَّنِيَ الضُّرُّ وَاَنْتَ اَرْحَمُ الرّٰحِمِيْنَ ۝﴾[4]

ترجمہ: ''اے پروردگار مجھ کو تکلیف پہنچی اور بے شک آپ ہی ''ارحم الراحمین'' ہیں۔''

---

۱ القرآن:۴/۷۸ ۲ القرآن ۲۶/۸۰

۳ القرآن:۲۶/۸۰ ۴ القرآن:۲۱/۸۳

اور یہ نہیں فرمایا:

﴿ اَمۡسَسۡتَنِیَ الضُّرَّ فَارۡحَمۡنِیۡ ﴾

ترجمہ: ”آپ نے مجھ کو تکلیف پہنچائی پس آپ رحم فرمایئے۔“

اسی طرح حضرت خضر علیہ السلام نے فرمایا کہ:

﴿ فَاَرَدۡتُّ اَنۡ اَعِیۡبَهَا ﴾ [1]

ترجمہ: ”میں نے اس کے عیب دار بنانے کا ارادہ کیا۔“

اس قول میں عیب کو اپنی جانب منسوب فرمایا اور:

﴿ فَاَرَادَ رَبُّكَ اَنۡ يَّبۡلُغَاۤ اَشُدَّهُمَا وَيَسۡتَخۡرِجَا كَنۡزَهُمَا ۖ رَحۡمَةً مِّنۡ رَّبِّكَ ۚ ﴾ [2]

ترجمہ: ”پس خدا نے چاہا کہ وہ دونوں اپنی جوانی کا زمانہ پائیں اور اپنا دفینہ خدا کی رحمت سے نکال لیں۔“

اس قول میں چونکہ خیر کا ذکر تھا اس لئے اس کو رب العالمین کی طرف منسوب کر دیا اور ”رَحۡمَةً مِّنۡ رَّبِّكَ“ اور ”وَمَا فَعَلۡتُهٗ عَنۡ اَمۡرِیۡ“[3] ترجمہ: ”اور میں نے یہ نہیں کہا اپنے حکم سے۔“ کا اور اضافہ کر دیا۔ اور:

﴿ فَاَرَدۡنَاۤ اَنۡ يُّبۡدِلَهُمَا رَبُّهُمَا خَيۡرًا مِّنۡهُ ﴾ [4]

ترجمہ: ”ہم نے چاہا کہ خدا ان کو بہتر بدل عطا فرمائے۔“

اس میں صیغہ جمع کا استعمال فرمایا۔ اس لئے کہ یہ صورت من وجہ خیر تھی اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کی نظر میں شر تھی یا یہ کہہ لیجئے کہ اس میں کچھ حصہ خیر کا تھا اور کچھ حصہ شر کا۔ کیونکہ شر کو بدل کر خیر پیدا کی گئی اس لئے صیغہ جمع استعمال کیا تاکہ یہ مجموعہ، مجموعہ پر منقسم ہو جائے خیر حق تعالیٰ کی جانب منسوب ہو جائے اور شر حضرت

---

[1] القرآن: ۷۹/۱۸ [2] القرآن: ۸۲/۱۸

[3] القرآن ۸۲/۱۸ [4] القرآن: ۸۱/۱۸

خضر کی جانب۔ اور تبدیل چونکہ خیر محض تھی اس لئے اس کو فقط خدا کی طرف منسوب کیا گیا۔

ایک شبہ[1] اور اس کا ازالہ

شبہ یہ ہے کہ جب ایمان اور کفر، ہدایت اور ضلالت سب کا وہی خالق ہے تو پھر ارسال رسل اور انزال کتب سے کیا فائدہ۔ جس کو ہدایت دینی تھی اس کو ہدایت دے دی ہوتی۔ اور جس کو کافر اور گمراہ بنانا تھا اس کو کافر اور گمراہ بنا دیا ہوتا۔ اس طویل و عریض سلسلہ کے قائم کرنے کی کیا حاجت تھی۔ لیکن یہ سوال بعینہٖ ایسا ہے کہ جب صحت اور مرض بیماری اور تندرستی سب کا وہی خالق ہے تو پھر اطباء اور حکماء کو پیدا کرنے کی کیا ضرورت اور علوم طب اور فن معالجہ کی تعلیم سے کیا فائدہ۔ جس کو عافیت دینی تھی اس کو عافیت دے دی ہوتی اور جس کو موت دینی تھی اس کو موت دے دی ہوتی۔ پس جس طرح خداوند ذوالجلال نے جسمانی زندگی کی صحت اور تندرستی کے سامان پیدا کئے دواؤں اور طبیبوں کو پیدا کیا اسی طرح روحانی زندگانی کے لئے ہدایت کے تمام سامان بندوں کو عطا کئے اطباء روحانی یعنی حضرات انبیاء و مرسلین صلوات اللہ وسلامہ علیہم اجمعین کو مبعوث فرمایا آسمان سے طب روحانی کے صحیفے نازل فرمائے۔ جو چیزیں روح کے لئے مفید یا مضر تھیں ان کو بالتفصیل بتلایا۔

چونکہ یہ عالم، عالم اسباب ہے اس لئے اسباب اور مسببات کا ایک طویل سلسلہ قائم کر دیا۔ پہلے نطفہ اور پھر علقہ اور پھر مضغہ اور پھر جنین ہوا اور علی ہذا مختلف اطوار گزرنے کے بعد وہ ایک کامل انسان بنتا ہے۔ حالانکہ وہ قادر مطلق اگر چاہتا تو ایک ہی آن میں انسان کامل پیدا ہو سکتا تھا۔

علی ہذا انسان کی حیات کے لئے جو اسباب پیدا فرمائے ان میں بھی تدریجی

[1] ماخوذ از صراط مستقیم

رفتار ہے اول تخم کو خاک میں دفن کیا جاتا ہے۔ پھر اس کی آبیاری کی جاتی ہے اور علی ہذا پھر ایک عرصہ کے بعد اس میں کچھ بالیں نمودار ہوتی ہیں اور طرح طرح کی صعوبتوں کے بعد اس میں سے غلہ حاصل ہوتا ہے۔ حالانکہ وہ قادر مطلق اگر چاہتا تو سب کچھ ایک ہی آن میں ہوسکتا تھا۔

اور علی ہذا موت کے لئے بھی اسباب کا ایک طویل سلسلہ پھیلا دیا طرح طرح کے امراض پیدا فرمائے۔ سنکھیہ اور سمی دوائیں بھی پیدا کیں تو کیا کوئی شخص یہ سوال کر سکتا ہے کہ جب خدا کو مارنا ہے تو دفعۃً موت کیوں نہیں آجاتی۔ ان امراض اور آلام کے پیدا کرنے کی کیا ضرورت تھی۔

اور جب خدا کو زندہ کرنا ہے تو اسباب حیات کو اس قدر طول دینے کی کیا حاجت ہے دفعۃً ایک انسان کیوں نہیں پیدا کر دیا جاتا۔ اتنے اطوار اور ادوار میں کیوں وقت خرچ کیا جاتا ہے۔ غالباً آپ اس کا یہی جواب دیں گے کہ بے شک اس کی قدرت نہایت کامل اور وسیع ہے مگر اس کی سنت عالم اسباب میں اسی طرح جاری ہے کہ ہر شئے سلسلہ اسباب و مسببات میں مقید رہے۔ پس اسی طرح روحانی حیات یعنی ایمان و ہدایت اور روحانی ممات یعنی کفر و ضلالت کے لئے بھی ایک سلسلہ اسباب قائم فرمایا۔

اس کے علم ازلی میں یقیناً تھا کہ فلاں شخص سم الفار کھا کر ہلاک ہوگا۔ فلاں شخص فلاں فلاں امراض میں مبتلا ہو کر جان دے گا۔ مگر باوجود اس کے پھر اطباء کو پیدا فرمایا اور سمیات اور تمام ادویہ کے خواص ان کو بتلائے تا کہ وہ سب کو بتلا دیں کہ فلاں شئی مفید ہے اور فلاں مضر۔ اور فلاں نافع ہے اور فلاں مہلک۔

اسی طرح اس کو یہ بھی علم تھا کہ فلاں شخص کفر کر کے ابدالاباد کے لئے ہلاک ہوگا مگر اس نے اپنی حکمۃ بالغہ سے روحانی اطباء یعنی انبیاء و رسل علیہم السلام کو مبعوث فرمایا تا کہ خلق اللہ کو یہ بتلا دیں کہ کفر روحانی حیات کے قطع کرنے میں سم الفار سے کسی

طرح کم نہیں۔

خلاصہ یہ کہ جس طرح تکوینیات میں اسباب اور مسببات کے سلسلہ کا ہونا خلاف عقل نہیں۔ اسی طرح تشریعیات میں بھی اسباب اور مسببات کے سلسلہ کا ہونا خلاف عقل نہیں۔

سلسلہ مجازات

اس علیم وقدیر نے اپنی قدرت وحکمت کے ظاہر کرنے کے لئے تریاق اور سم الفار دونوں کو پیدا کیا۔ موت اور حیات، صحت اور مرض کے اسباب پیدا کئے۔ مقوی دوائیں اور غذائیں بھی اسی نے پیدا کیں۔ زہر اور زہریلے جانور بھی اسی نے پیدا کئے۔ اب اگر کوئی انسان زہر کھا کر ہلاک ہوتا ہے تو کوئی شخص نہیں کہے گا کہ یہ سم الفار کھانے کا انتقام اور بدلہ ہے بلکہ یہ کہا جائے گا کہ یہ زہر کھانے پر اثر مرتب ہوا اس لئے کہ زہر کی خاصیت اور تاثیر ہی یہ ہے کہ اس کے کھانے سے موت آتی ہے۔

زہر کے کھانے یا سانپ کے کاٹنے سے اگر کوئی شخص مر جائے تو کوئی شخص یہ سوال نہیں کرتا کہ خدا تعالیٰ نے کیوں زہر کو پیدا کیا۔ اور اس میں یہ خاصیت اور تاثیر کیوں رکھی۔ اس نے کیوں سانپ کو پیدا کیا اور پھر کس لئے اس میں نیش زنی کا داعیہ پیدا کیا۔

زہر اور زہر کی خاصیت اور اس شخص کا کھانا اور پھر کھا کر ہلاک ہونا سب خدا ہی کی قدرت اور مشیت سے ہے۔ اور کوئی ذرہ برابر ظلم نہیں۔ کوئی شخص اس کو زہر کھانے کا انتقام اور اس کی سزا نہیں سمجھتا بلکہ اس کے فعل کا ثمرہ اور نتیجہ سمجھا جاتا ہے جیسے گلاب کا قلم لگانے سے گلاب پیدا ہوتا ہے۔ اور بید کے تخم سے بید پیدا ہوتا ہے۔

گندم از گندم بروید جو زجو
از مکافات عمل غافل مشو

پس جس طرح یہ ہلاکت بطور انتقام نہیں بلکہ بطور تسبیب و تثمیر اور بطریق خاصیت اور تاثیر ہے۔ اس طرح ہم کہتے ہیں کہ ایمان کی خاصیت حیات اور بقاء ابدی ہے اور کفر کی ذاتی تاثیر ہلاکت ابدی ہے۔ سنکھیہ اگر مادی زہر ہے تو کفر معنوی زہر ہے۔ امرت اگر ظاہری حیات بخشتا ہے تو ایمان معنوی حیات عطا کرتا ہے۔

اور جس طرح اجسام کو بقاء نہیں اسی طرح ان کی راحت و آرام بھی دائمی نہیں اور روح چونکہ ایک ابدی شئے ہے اس لئے اس کی لذت و آرام بھی جاودانی ہے۔ پس جس طرح سم الفار سے موت کا آنا انتقام نہیں بلکہ اس مادی زہر کا اثر اور ثمر ہے اسی طرح کفر سے جہنم میں جانا بھی انتقام نہیں بلکہ کفر جو ایک معنوی زہر ہے اس کا اثر ہے۔

بلکہ سم الفار اور زہر درحقیقت سراپا موت ہے اسی طرح کفر خود آگ ہے۔ سم الفار کا اثر بدون تریاق کے زائل نہیں ہوسکتا اسی طرح کفر جو ایک معنوی زہر ہے اس کے اثر کو زائل کرنے کے لئے بھی ایک تریاق کی ضرورت ہے۔ اور وہ تریاق توبہ اور تجدید ایمان ہے۔

غرض یہ کہ کفر ایک معنوی زہر اور سراپا نار ہے۔ قیامت کے دن ہر شخص اپنے اعمال کو اصلی صورت اور ذاتی تاثیر کے ساتھ نمایاں طور پر مشاہدہ کر لے گا۔ کما قال تعالیٰ:

﴿وَوَجَدُوْا مَا عَمِلُوْا حَاضِرًا ۚ وَلَا يَظْلِمُ رَبُّكَ اَحَدًا﴾[1]

ترجمہ: ''اور جو کچھ کیا ہے اس کو وہاں حاضر پائیں گے اور خدا کسی پر کسی قسم کا ظلم نہیں کرتا۔''

بہرچہ نیک و بد کردی جزا یابی سزا یابی
فمن یعمل یرہ برخواں کہ ایں بینی و آں بینی

[1] القرآن: ۱۸/۴۹

اور اگر یہ کہا جائے کہ جب کفر اسی کی مشیت سے ہوتا ہے اور اسی کی مشیت سے کافر جہنم میں جلتا ہے تو کیا حق تعالیٰ نے ایک شخص کو محض تکلیف پہنچانے کے لئے پیدا کیا اور پھر اس کے لئے کفر بھی مقدر کیا تا کہ وہ صفت قہر وغضب کا مظہر بنے۔ یہ اچھا اظہار صفت ہے کہ جس سے دوسرے تکلیف میں مبتلا ہو گئے۔

لیکن یہ سوال مادیات اور تکوینیات میں بھی جاری ہو سکتا ہے ایک شخص کے لئے یہ مقدر کیا کہ وہ سم الفار کھا کر ہلاک ہو گا تو کیا اس صورت میں اس کو تکلیف نہیں پہنچی تو پھر کیا ضرورت تھی کہ سم الفار پیدا کیا جائے اور پھر یہ بھی مقدر کیا جائے کہ فلاں شخص زہر کھائے گا اور تڑپ کر جان دے گا۔

بہر حال تکلیف اور ایذاء دونوں ہی جگہ ہے، یہاں بھی اور وہاں بھی فرق اتنا ہے کہ ایک جگہ اس نے مضرات اور سمیات مادیہ کا استعمال کیا اور ایک جگہ سمیات معنویہ اور روحانیہ کا۔ مضرات مادیہ سے بچانے کے لئے اطباء اور حکماء کو پیدا کیا اور ان کو طب جسمانی کے قواعد الہام فرمائے اور خدا سے الہام پا کر عامہ خلائق کو جسم کے عوارض ذاتیہ اور اس کے منافع اور مضار بتلائے۔

اور مضرات معنویہ اور سمیات روحانیہ سے بچانے کے لئے روحانی اطباء یعنی انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کو مبعوث فرمایا اور طب روحانی یعنی شریعت ان کو عطا فرمائی۔ ان حضرات نے مبعوث ہونے کے بعد روح کے عوارض ذاتیہ اور اس کے منافع اور مضار سمجھائے۔

بدن چونکہ عارضی ہے اور دیر پا نہیں اس لئے اس کے اسباب اور مبادی پر نتائج مرتب ہونے میں زائد دیر نہیں ہوتی اور ہر آنکھ اس کا مشاہدہ کر لیتی ہے جیسے زہر اور سانپ سے ہلاک ہونا ہر شخص اپنی آنکھ سے دیکھ لیتا ہے۔

اور روح چونکہ ایک طویل الحیاۃ شئے ہے اس لئے اگر اس کے بعض نتائج اور ثمرات قرنہا قرن میں بھی جا کر ظاہر ہوں تو کوئی حرج نہیں اس لئے کہ اس کی طویل

عمر کے لحاظ سے یہ طویل قرن بھی ایک قصیر مدت ہے۔ قال تعالیٰ:

﴿اِنَّهُمْ يَرَوْنَهٗ بَعِيْدًا ۝ وَّنَرٰىهُ قَرِيْبًا﴾[1]

ترجمہ: ”وہ اس دن کو بعید خیال کرتے ہیں اور ہم اس کو قریب ہی دیکھ رہے ہیں۔“

آدمی کی حالت اس شخص کے مشابہ ہے کہ جس نے کسی مخدر چیز کا استعمال کیا ہو وہ اس وقت آگ کی سوزش محسوس نہیں کرتا اور جب اس مخدر کا اثر کم ہو جاتا ہے تب اس کو تکلیف محسوس ہوتی ہے۔ اسی طرح کفر بعینہٖ نار ہے۔ مگر دنیا کے منشیات اور یہاں کے مخدرات یعنی لذائذ اور شہوات اس معنوی نار کے محسوس ہونے سے مانع ہیں عالم آخرت میں پہنچ کر دنیا کی تمام لذائذ کا نشہ کافور ہو جائے گا۔ اور اس معنوی زہر کی تکلیف محسوس ہونے لگے گی۔

الحاصل روحانی سلسلہ کا زہر کفر ہے اور ایمان امرت اور آب حیات ہے اور اعمال صالحہ بمنزلہ مقوی غذاؤں کے ہیں اور اعمال سیئہ بمنزلہ مضرات قابل پرہیز ہیں۔

خلق اور کسب کا فرق

اس میں شک نہیں کہ ہر عمل پر اس کی خاصیت اور تاثیر کے مطابق ثمرہ مرتب ہوتا ہے مگر اس ترتب میں انسان کا کسب اور اس کی سعی ضرور شرط ہے۔

سم الفار کی خاصیت بے شک ہلاکت اور موت ہے لیکن ہلاکت کے لئے سم الفار کا اپنے اختیار سے استعمال کرنا شرط ہے۔ اسی طرح کفر کی خاصیت ابدی ہلاکت ہے مگر ابدی ہلاکت کے لئے شرط یہ ہے کہ کفر کرنے کے لئے اپنے قوائے فکریہ اور قوائے عملیہ کو استعمال کرے، اور خداوند ذوالجلال نے بندہ کو عمل کرنے کی جو قوت اور

---

[1] القرآن: ۷۰/۶، ۷

قدرت عطا کی ہے اس قوت اور قدرت کے استعمال کرنے کا نام اصطلاح شریعت میں کسب ہے۔

امام ابو منصور ماتریدی رحمہ اللہ تعالیٰ شرح فقہ اکبر صفحہ ۱۱ میں خلق اور کسب کا فرق بیان کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

"قال ابوحنيفة واصحابه الخلق فعل الله وهو احداث الاستطاعة فى العبد واستعمال الاستطاعة المحدثة فعل العبد حقيقةً لا مجازاً الى آخره"

ترجمہ: "بندہ میں استطاعت اور عمل کی طاقت کا پیدا کرنا خلق ہے اور یہ اللہ تعالیٰ کا فعل ہے اور استطاعت حادثہ یعنی خدا کی دی ہوئی قدرت کا استعمال کرنا یہ بندہ کا فعل ہے۔"

امام ابوالحسن رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ جو فعل قدرت قدیمہ اور ازلیہ سے صادر ہو وہ خلق ہے اور جو فعل قدرت حادثہ سے صادر ہو وہ کسب ہے۔[۱]

فاعل سے جو فعل صادر ہوتا ہے اس کی دو صورتیں ہیں۔ کبھی وہ فعل اپنے فاعل سے بلا واسطہ صادر ہوتا ہے اور کبھی کسی آلہ اور واسطہ کی وساطت سے ظاہر ہوتا ہے ضارب اور قاتل سے بعض مرتبہ ضرب بلا واسطہ صادر ہوتی ہے اور بعض مرتبہ تیر اور تلوار کے واسطہ سے اس کا ظہور ہوتا ہے اسی طرح افعال الٰہیہ کا ظہور کبھی بلا واسطہ ہوتا ہے۔ اور کبھی بندہ کے ہاتھ سے اس کا ظہور ہوتا ہے۔

لہٰذا جو فعل خدا تعالیٰ سے بلا واسطہ ظاہر ہو وہ خلق ہے اور جو فعل بندہ کے واسطہ سے ظاہر ہو وہ کسب ہے۔ قمر سے جو نور ظاہر ہوتا ہے وہ حقیقت میں نور شمس ہی ہے مگر چونکہ اس کا ظہور قمر کے واسطہ سے ہے اس لئے نور قمر اور نور شمس کے احکام اور ثمرات مختلف ہوگئے۔ کما قال تعالیٰ:

---

[۱] شفاء العلیل

﴿قَاتِلُوْهُمْ يُعَذِّبْهُمُ اللّٰهُ بِاَيْدِيْكُمْ﴾[1]

ترجمہ: ''ان سے قتال کرو حق تعالیٰ تمہارے ہاتھ سے ان کو عذاب دیں گے۔''

اس آیت سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ جو کچھ بندہ کے ہاتھ سے ظاہر ہوتا ہے وہ حقیقت میں اسی کا فعل ہوتا ہے۔ ہمارے جوارح اس کے افعال کے لئے مظہر اور واسطہ ہو جاتے ہیں۔

حقیقت میں وہی عذاب دینے والا ہے مگر ہمارے ہاتھ سے، حقیقت میں وہی دیکھنے والا اور سننے والا ہے۔ وہی حرکت کرنے والا اور چلنے والا ہے۔ مگر ہمارے ہاتھوں سے، ہماری سمع و بصر سے، ہمارے قدم اور پیروں سے۔ یعنی ہمارے ہاتھ، اور پیر اور ہماری سمع و بصر اس کے افعال کے لئے مظاہر اور وسائط ہیں۔

اور اسی وجہ سے کہ یہ جوارح افعال الٰہیہ کے مظاہر ہیں۔ حدیث میں ان جوارح کو خدا کی طرف مجازاً منسوب کر دیا گیا۔

''کما ورد فی الصحیح مرفوعاً لا یزال عبدی یتقرب الی بالنوافل حتی احبه فاذا احببته کنت سمعه الذی یسمع به و بصره الذی یبصر به ویده التی یبطش بها ورجله التی یمشی بها الخ''[2]

ترجمہ: ''جیسا کہ صحیح بخاری میں مرفوعاً روایت ہے کہ بندہ ہمیشہ نوافل سے تقرب حاصل کرتا رہتا ہے یہاں تک کہ میں اس کو محبوب بنا لیتا ہوں۔ پس وہ میرے ہی کان سے سنتا ہے اور میری ہی آنکھ سے دیکھتا ہے اور میرے ہی ہاتھ سے پکڑتا ہے اور میرے ہی پیر سے چلتا ہے۔''

وقال تعالیٰ:

---

[1] القرآن: ۹/۱۴ [2] الحدیث

﴿اِنَّ الَّذِیْنَ یُبَایِعُوْنَكَ اِنَّمَا یُبَایِعُوْنَ اللّٰهَ یَدُاللّٰهِ فَوْقَ اَیْدِیْهِمْ﴾ [1]

ترجمہ: ''جولوگ آپ سے بیعت کرتے ہیں وہ درحقیقت اللہ ہی سے بیعت کرتے ہیں اللہ کا ہاتھ ان کے ہاتھ پر ہوتا ہے۔''

اس آیت میں حق تعالیٰ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے دست مبارک پر بیعت کرنا اپنے ہی دست قدرت پر بیعت کرنا قرار دیا ہے کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا دست مبارک اسی کے دست قدرت کا مظہر ہے۔ وقال تعالیٰ:

﴿مَنْ یُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ﴾ [2]

ترجمہ: ''یعنی رسول اکرم کی اطاعت خداوندی اطاعت کے لئے مظہر ہے۔''

وقال تعالیٰ:

﴿خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمْ﴾ [3]

ترجمہ: ''اے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم! آپ ان کے مالوں میں سے صدقہ وصول کیجئے تاکہ آپ انہیں پاک کردیں۔''

اس آیت میں اخذ صدقات کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب منسوب فرمایا اور دوسری آیت میں اپنی جانب منسوب فرمایا۔ کما قال تعالیٰ:

﴿اَلَمْ یَعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ هُوَ یَقْبَلُ التَّوْبَةَ عَنْ عِبَادِهٖ وَیَاْخُذُ الصَّدَقٰتِ﴾ [4]

ترجمہ: ''کیا انہیں علم نہیں کہ اللہ ہی اپنے بندوں کی توبہ قبول کرتا ہے اور ان سے زکوٰۃ لیتا ہے۔''

---

[1] القرآن:۴۸/۱۰ [2] القرآن ۴/۸۰

[3] القرآن:۹/۱۰۳ [4] القرآن:۹/۱۰۴

ان دونوں آیتوں میں غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ حقیقت میں آخذ صدقات وہی ہے مگر چونکہ ظہور اس کا نبی کریم کے دست مبارک پر ہوا اس لئے ایک مرتبہ نبی کریم کی طرف منسوب کر دیا۔ وقال تعالیٰ:

﴿فَلَمْ تَقْتُلُوْهُمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ قَتَلَهُمْ وَمَا رَمَيْتَ اِذْ رَمَيْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ رَمٰى﴾ [۱]

ترجمہ: ''اے مسلمانو! تم نے ان کو قتل نہیں کیا بلکہ اللہ نے قتل کیا۔ اور اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم! جس وقت آپ نے خاک کی مٹھی پھینکی وہ حقیقت میں آپ نے نہیں پھینکی بلکہ اللہ نے پھینکی۔''

یعنی حقیقت میں قاتل اور فاعل ہم ہی ہیں اور تم محض آلہ اور واسطہ ہو۔ جس طرح تیر اور تلوار تمہارے افعال کے لئے آلہ اور واسطہ ہے۔ اسی طرح تم ہمارے افعال کے لئے مثل تیر کمان کے واسطہ اور مظہر ہو۔ وقال ابو الطیب.

؎ فانت حسام الملك والله ضارب
وانت لواء الدين والله عاقد

آنے والے چونکہ دروازہ سے گزرتے ہیں اس لئے دروازہ ان کے لئے ایک مخرج اور مظہر ہے۔ مگر مولد یعنی پیدا کرنے والا نہیں ہے۔ اسی طرح سے اعضائے انسانی حرکات الٰہیہ اور افعال خداوندی کے لئے دروازے ہیں کہ جن سے افعال الٰہیہ کا خروج اور ظہور ہوتا ہے۔ اگر کوئی شخص دروازہ ہی کو مولد سمجھ بیٹھے تو یہ اس کی نادانی ہوگی۔

معتزلہ نے جب جوارح انسانیہ پر افعال الٰہی کا ظہور دیکھا تو انسان اور اس کے اعضاء ہی کو ان افعال کا خالق بتلا دیا۔ اور جبریہ نے اس مخرج اور مظہر سے قطع نظر کر کے تمام افعال کو اصل کی جانب منسوب کر دیا۔

---

[۱] القرآن: ۸/۱۷

اور اشاعرہ نے ظاہر و باطن دونوں ہی کو ملحوظ رکھا۔ باطن پر نظر کر کے خدا کو خالق بتلایا اور ظاہر پر نظر کر کے بندہ کو کاسب بتلایا۔

جبر اور اختیار کی حقیقت

انسان سے افعال کا صدور دو طرح پر ہوتا ہے ایک یہ کہ انسان کسی شئے کا تصور کرے اگر وہ چیز اس کی طبیعت کے موافق ہوئی تو اس کے قلب میں اس کے کرنے کی خواہش اور رغبت پیدا ہوتی ہے۔ اور پھر نہایت ذوق و شوق کے ساتھ اس کے حاصل کرنے کے لئے حرکت کرتا ہے۔ اور اگر وہ شئے اس کی طبیعت اور منشاء کے خلاف ہوتی ہے تو قلب میں اس کی نفرت اور کراہت پیدا ہوتی ہے اور بصد کراہت و ناگواری اور بہزار نفرت و بیزاری اس کے دفع کرنے کے لئے حرکت کرتا ہے۔ لہٰذا انسان سے جو حرکت شوق اور رغبت یا نفرت اور کراہت کی بناء پر ظہور میں آئے۔ اسی کا نام فعل اختیاری ہے اور جو حرکت بدون کسی شوق اور خواہش کے ظہور میں آئے۔ جیسے حرکت مرتعش[1] تو وہ حرکت جبری اور اضطراری کہلائے گی۔ تمام عقلاء کے نزدیک پہلی حرکت اختیاری ہے اور بندہ سے اس اختیار کی نفی اور انکار ایسا ہی ہے جیسا کہ کوئی یہ کہے کہ انسان نہ سنتا ہے اور نہ دیکھتا ہے پس جس طرح انسان سے سمع اور بصر کا انکار سراسر بداہت اور مشاہدہ کا انکار ہے۔ اسی طرح سے بندہ سے اختیار کی نفی سراسر محسوس اور مشاہد چیز کی نفی کرنا ہے۔ اور جس طرح دنیا میں اس اختیار پر جزاء و سزا مرتب ہو رہی ہے اس طرح آخرت میں بھی اسی اختیار پر ثواب اور عقاب مرتب ہوگا۔

الغرض انسان سے جو فعل اور جو حرکت ظہور میں آتی ہے عقلاء کے نزدیک اس کی دو قسمیں ہیں۔ ایک اختیاری جو شوق اور رغبت سے ہو اور دوسری اضطراری جس میں انسان کی کسی قسم کی خواہش کو دخل نہ ہو۔ جیسے حرکت رعشہ۔

---

[1] مرتعش وہ کہ جس کے ہاتھ اور بدن میں رعشہ ہو گیا ہو

اور ظاہر ہے کہ حق جل وعلیٰ کی قضا وقدر اور حیطہ علم سے کوئی حرکت بھی باہر نہیں۔ جس حرکت کے متعلق جس طرح خدا تعالیٰ نے قضاء وقدر میں لکھ دیا ہے وہ حرکت اسی طرح ظہور میں آئے گی اگر اختیاری لکھ دیا ہے تو بندہ سے اس فعل اور حرکت کا صدور بالاختیار ہوگا۔ اور اگر اضطراری لکھ دیا ہے تو بندہ سے اس فعل اور حرکت کا صدور بلا اختیار ہوگا۔ معلوم ہوا کہ قضا وقدر کے متعلق ہونے سے افعال عبد کی تقسیم پر (کہ بعض افعال اختیاری اور بعض اضطراری ہیں) کوئی اثر نہیں پڑتا۔

یہ شیخ عبدالحق محدث دہلوی رحمہ اللہ تعالیٰ کے کلام کا خلاصہ اور توضیح ہے جو حضرت موصوف نے جبر واختیار کے متعلق تکمیل الایمان صفحہ ۳۴ پر تحریر فرمایا ہے۔

اس تقریر سے یہ شبہ بھی رفع ہوگیا کہ جب قضا وقدر میں ابوجہل کا کفر مقدر ہو چکا تھا کہ ابوجہل ایمان نہ لائے گا۔ تو پھر ابوجہل کا کفر ضروری اور ایمان لانا محال اور ممتنع ہوگا۔ اس لئے کہ علم الٰہی کا غلط ہونا ناممکن اور محال ہے اور جب کفر ضروری ہوا تو پھر بندہ کو ایمان کا کہاں اختیار باقی رہا لہٰذا جبر لازم آیا۔

جواب: یہ ہے کہ بے شک اللہ تعالیٰ کو پہلے سے علم تھا کہ زید فلاں کام اپنے اختیار سے کرے گا اور فلاں کام اس سے بلا اختیار سرزد ہوگا۔ اللہ تعالیٰ کے علم سے اختیار زائل نہیں ہوتا۔ اللہ تعالیٰ تو اختیاری اور اضطراری سب ہی امور کو جانتا ہے نیز یہ کہ اللہ تعالیٰ کے افعال بالاتفاق اختیاری ہیں۔ حالانکہ وہ ازل میں اپنے افعال کو بھی جانتا تھا کہ فلاں وقت فلاں کو یہ شئے عطا کروں گا۔ پس جس طرح علم ازلی کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کا اختیار نہیں جاتا رہا۔ اسی طرح علم ازلی سے بندوں کے اختیار اور ارادہ کا زائل ہونا لازم نہیں آتا۔

توفیق اور استدراج

انسان جب بہیمی جذبات کو کسب کرتا ہے تو ویسی ہی اس کو مدد دی جاتی ہے اور

جو امور اس کے مناسب ہوتے ہیں وہی اس کے لئے آسان کر دیئے جاتے ہیں اور جب ملکی جذبات کو کسب کرنا چاہتا ہے تو پھر ویسی ہی اس کو امداد دی جاتی ہے اور اسی کے مناسب امور اس کے لئے سہل کر دیئے جاتے ہیں۔ قال تعالیٰ:

﴿كُلًّا نُّمِدُّ هٰٓؤُلَآءِ وَهٰٓؤُلَآءِ مِنْ عَطَآءِ رَبِّكَ ۭ وَمَا كَانَ عَطَآءُ رَبِّكَ مَحْظُوْرًا﴾ [1]

ترجمہ: ''ہر ایک کی امداد کرتے ہیں ان کی بھی اور ان کی بھی۔ خدا کی عطا کسی سے روکی نہیں گئی۔''

وقال تعالیٰ:

﴿اِنَّ سَعْيَكُمْ لَشَتّٰى ۝ فَاَمَّا مَنْ اَعْطٰى وَاتَّقٰى ۝ وَصَدَّقَ بِالْحُسْنٰى ۝ فَسَنُيَسِّرُهٗ لِلْيُسْرٰى ۝ وَاَمَّا مَنْۢ بَخِلَ وَاسْتَغْنٰى ۝ وَكَذَّبَ بِالْحُسْنٰى ۝ فَسَنُيَسِّرُهٗ لِلْعُسْرٰى ۝﴾ [2]

ترجمہ: ''بے شک تمہاری کوشش مختلف ہے۔ پس جس نے دیا اور ڈرا اور کلمہ توحید کی تصدیق کی اس کے لئے اعمال صالحہ کو سہل کر دیں گے اور جس نے بخل کیا اور تکذیب کی اس کے لئے برے اعمال میں سہولت پیدا کر دیں گے۔''

ایک شخص اپنے کسب سے ہدایت حاصل کرنا چاہتا ہے تو اس کو ہدایت میں مدد دی جاتی ہے اور جو کفر اور ضلالت کرنا چاہتا ہے تو اس کو اس میں امداد دی جاتی ہے۔ ہدایت میں امداد دینے کا نام توفیق ہے اور کفر و ضلالت میں امداد دینے کا نام استدراج اور امہال ہے۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ عمل پر جزا اور سزا مرتب ہونے کے لئے بندہ کا کسب شرط

[1] القرآن: ۲۰/۱۷ [2] القرآن: ۹۲/۴ تا ۱۰

ہے۔ حکماء کا قول ہے کہ نور قمر بھی حقیقت میں نور آفتاب ہی ہے، مگر دن میں آفتاب بلاواسطہ روشنی ڈالتا ہے اور شب کو قمر اور کواکب کے واسطہ سے لیکن جب آفتاب بلا واسطہ روشنی ڈالتا ہے تو اس کی تاثیر بھی اور ہوتی ہے اور احکام بھی اور۔ اور جب وہی آفتاب شب کو قمر کے واسطہ سے روشنی ڈالتا ہے تو تاثیر اور احکام سب بدل جاتے ہیں حتیٰ کہ نام بھی بدل جاتا ہے۔ چنانچہ دن کی روشنی کو دھوپ اور شب کی روشنی کو چاندنی کہتے ہیں۔ ٹھیک اسی طرح ارادہ الٰہیہ جو بمنزلہ شمس کے ہے۔ کبھی بندہ کے ارادہ میں سے ہوکر گزرتا ہے تو اس کو کسب کہتے ہیں اور کبھی بلاواسطہ عمل پیرا ہوتا ہے تو اس کو خلق کہتے ہیں۔ اور اسی وجہ سے کہ ابوجہل اور ابولہب کو "آمِنُوْا" کا خطاب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی وساطت سے ہوا۔ اس لئے ایمان و ہدایت سے انکار کر سکے ورنہ اگر بلاواسطہ ان کو "کُوْنُوْا مُؤْمِنِیْنَ" کا خطاب ہو جاتا تو وہ یقیناً صدیق بن جاتے۔

لقولہ تعالیٰ:

﴿اِنَّمَآ اَمْرُهٗٓ اِذَآ اَرَادَ شَيْـًٔا اَنْ يَّقُوْلَ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ﴾ [1]

ترجمہ: "جب وہ کبھی کسی چیز کا ارادہ کرتا ہے اسے اتنا فرمادینا (کافی ہے) کہ ہوجا، وہ اسی وقت ہوجاتی ہے۔"

اور اسی وجہ سے کہ عہد الست میں خطاب بلاواسطہ تھا یک لخت سب نے بلیٰ کہہ دیا اور اس عالم میں خطاب حجاب اور واسطہ سے ہوا اس لئے کوئی اس عہد پر قائم رہا اور کوئی نہ رہا۔

بہرحال کفر کی ذاتی تاثیر نار جہنم ہے جیسے سانپ کی ذاتی تاثیر ہلاکت ہے مگر جس طرح ہلاکت کے لئے سانپ کا کاٹنا شرط ہے اسی طرح نار جہنم کے لئے بندہ کا کفر کرنا شرط ہے۔ دیا سلائی میں مادہ آتش گیر موجود ہے مگر آگ کے لئے اس کا رگڑنا شرط ہے۔

---

[1] القرآن: ۸۲/۳۶

لیکن اب ہم ترقی کر کے کہتے ہیں کہ اگر حق تعالیٰ بندہ کے دل میں کفر کا فقط داعیہ ہی رکھ دیتا اور بندہ کے کسب اور ارادہ کو دخل نہ ہوتا بلکہ اضطراراً اس سے کفر صادر ہوتا تب بھی اس کا جہنم میں جانا کوئی ظلم نہ ہوگا کیونکہ تاثیر اسباب میں ارادہ شرط نہیں۔ انسان اگر اپنے قصد اور اختیار سے سنکھیہ کھائے تب بھی مرتا ہے اور اگر سہواً کھائے تب بھی ہلاک ہوتا ہے۔ واللہ اعلم۔

تحقیق مولانا رومی قدس سرہ السامی

مولانائے روم نے جس طرح اس پیچیدہ مسئلہ کو حل فرمایا ہے غالباً اس کی نظیر سینکڑوں اور ہزاروں دفتروں میں بھی نہ ملے گی۔ طرز بیان ایسا دل آویز ہے کہ جس کی کوئی انتہا نہیں طریق استدلال ایسا عجیب وغریب کہ دل میں اثر کرتا چلا جاتا ہے ہم چاہتے ہیں کہ احباب کی خدمت میں اس مسئلہ کے متعلق مولانائے روم کی تحقیق بطور ہدیہ پیش کر دیں۔

منع کردن منکران انبیاء را علیہم الصلوٰۃ والسلام از نصیحت کردن وحجت آوردن بطریقہ جبریاں ونا معقول گفتن انبیاء را علیہم الصلوٰۃ والسلام

قوم گفتند اے نصوحاں[1] بس بود
آنچہ گفتید از دریں دہ کس بود
قفل بر دلہائے ما بنہاد حق
کس نداند بر دبر خالق سبق

[1] ناصحان

نقش ما این کرد آن تصویر گر
این نخواہد شد بگفت و گو دگر
سنگ را صد سال گوئی لعل شو
کہنہ را صد بار گوئی باش نو
خاک را گوئی صفات آب گیر
آب را گوئی عسل شو یا کہ شیر
نار را گوئی کہ نور محض شو
پشہ را گوئی کہ سوئے باد رو
قلب را گوئی کہ عین پاک شو
یا کہ اکسیرے شو و چالاک شو
ہیچ ازاں اوصاف دیگر گوں شوند
آب کے گردد عسل اے ارجمند
قسمتے کردست ہر یک را رہے
کے کہے[1] گردد بجہدت چوں کہے[2]

جواب انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام جبریاں را

انبیاء گفتند کارے[3] آفرید
وصفہائے کہ نتاں[4] زاں سرکشید
وا فرید او وصف ہائے عارضی
کہ کسے مبغوض میگر دد رضی
رنجہا دادست کاں را چارہ ہست

---

[1] اے کوہ [2] اے کاہ [3] اے کہ البتہ [4] مخفف نتواں

آں بمثل لقوہ ودرد سرست
این دواہا ساخت بہر ائتلاف
نیست این درد و دواہا از گزاف
بلکہ اغلب رنجہا را چارہ ہست
چوں بجد جوئی بیاید آں بدست[1]

حاصل جواب یہ ہے کہ بے شک یہ صحیح ہے کہ گمراہی کے قفل حق تعالیٰ نے پیدا فرمائے لیکن ان کے کھولنے کے لئے ہدایت کی کنجی بھی بنائی ہے۔

جو شخص کنجی ہدایت کے ذریعہ سے قفل ضلالت کو کھولنا چاہے وہ سہولت سے قفل کھول سکتا ہے ہاں اگر کوئی بدنصیب کنجی ہی کا استعمال نہ کرے تو قفل خود بخود تو کھلنے سے رہا۔

جس طرح وہ مرض کا خالق ہے۔ اسی طرح وہ دوا کا بھی خالق ہے۔ اگر کوئی مریض باوجود طبیب کے کہنے کے پھر بھی دوا کا استعمال نہ کرے اور یہ کہتا رہے کہ یہ مرض چونکہ خدا کا پیدا کیا ہوا ہے اس لئے نہ میں علاج کروں گا اور نہ کسی دوا کو استعمال میں لاؤں گا تو اس سے زائد کون نادان ہوگا۔ اس نادان کو اتنی خبر نہیں کہ دوا بھی اسی کی پیدا کی ہوئی ہے۔ اور دوا کے استعمال کے بعد صحت اور تندرستی بھی وہی پیدا کرتا ہے۔

پس جس طرح وہ شافی مطلق جسمانی امراض کو ان ظاہری دواؤں کے استعمال سے زائل کرسکتا ہے۔ ٹھیک اسی طرح وہ روحانی امراض کو بھی تریاق ایمان اور اکسیر ہدایت کے استعمال کرنے سے زائل کرسکتا ہے۔

﴿وَمَا ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ بِعَزِيْزٍ﴾[2]

ترجمہ: ''اور اللہ پر یہ کچھ دشوار نہیں۔''

مولانا نے مختلف طریق سے جبریہ کا رد اور بندہ کا مختار ہونا ثابت فرمایا۔

---

[1] از دفتر سوم: صفحہ ۲۵۵ [2] القرآن ۱۷/۳۵

❶ بندہ کا متردد ہونا خود اس کے مختار ہونے کی دلیل ہے تردد اختیاری ہی چیز میں ہوسکتا ہے تردد کا مطلب ہی یہ ہے کہ اس کو یہ سوچ ہے کہ میں کس جانب کو اختیار کروں ؎

در تردد مانده ایم اندر دو کار
این تردد کے بود بے اختیار
ایں کنم یا آں کنم کے گوید او
کہ دو دست و پاش بستت اے عمو
ہیچ باشد این تردد در سرم
کہ روم در بحر یا بالا پرم
ایں تردد ہست کہ موصل روم
یا برائے سحر تا بابل روم
پس تردد را بباید قدرتے
ورنہ آں خندہ بود بر سبلتے

❷ امر و نہی اعزاز و اکرام کے لئے انسان کو مخصوص کر لینا اور پتھروں کو کسی قسم کا امر و نہی نہ کرنا یہ بھی اس کی دلیل ہے کہ انسان مختار ہے اور پتھر مجبور محض ؎

سنگ را ہرگز نہ گوید کس بیا
از کلوخے کس کجا جوید وفا
آدمی را کس نہ گوید ہیں بپر
یا بیا اے کور خوش درمن نگر
گفت یزداں ما علی الاعمیٰ حرج
کے نہد برکس حرج رب الفرج
کس نہ گوید سنگ را دیر آمدی

یا کہ چوبا توچرا بر من زدی
ایں چنیں واجبہا[۱] مجبور را
کس نہ گوید یا زند معذور را
امر و نہی و خشم و تشریف و عتیب
نیست جز مختار را اے پاک جیب

۳ دشمن پر غصہ آنا اور چھت سے اگر کڑی گر جائے اس پر غصہ کا خیال تک بھی نہ آنا یہ بھی اس کی دلیل ہے کہ آپ دشمن کو مختار اور لکڑی کو مجبور سمجھتے ہیں ؂

غیر حق را گرنہ باشد اختیار
خشم چوں مے آیدت برجرم دار
چوں[۲] ہمی خائی تو دنداں بر عدو
چوں ہمی بینی گناہ و جرم ازو
گرز سقف خانہ چوبے بشکند
بر تو افتد سخت مجروحت کند
ہیچ خشمے آیدت برچو سقف
ہیچ اندر کیں او باشی تو وقف
کہ چرا برمن زد و دستم شکست
یا چرا برمن فتاد و کرد پست[۳]

۴ جبر و اختیار کا مسئلہ اس قدر بدیہی ہے کہ جانور بھی اس سے بے خبر نہیں اونٹ کے اگر لکڑی ماری جاتی ہے تو وہ بھی مارنے والے کی جانب توجہ کرتا ہے لکڑی کی طرف توجہ نہیں کرتا۔

کتے کے اگر پتھر مارا جائے تو وہ مارنے والے پر حملہ کرتا ہے پتھر پر حملہ نہیں کرتا۔

---

۱ تکالیف ۲ چرا ۳ دفتر خامس: صفحہ ۳۵۹

جس سے صاف ظاہر ہے کہ اونٹ اور کتا مارنے والے کو مختار سمجھ کر اس سے تعرض کرتے ہیں اور پتھر اور لکڑی کو مجبور محض سمجھ کر اس سے کوئی تعرض نہیں کرتے ؎

گر شتر باں اشترے را میزند
آں شتر قصد زننده مے کند
خشم اشتر نیست بان چوب او
پس ز مختاری شتر بردست بو
ہمچنیں سگ گر برو سنگے زنی
بر تو آرد حملہ گردد منثنی[1]
عقل حیوانی چو دانست اختیار
ایں مگو اے عقل انساں شرم دار[2]

۵ بندہ کا یہ کہنا کہ میرا ارادہ یہ ہے کہ کل کو یہ کروں گا اور پرسوں یہ کروں گا۔ یہ بھی اس کے مختار ہونے کی صریح دلیل ہے۔

؎ ایں کہ فردا آں کنم یا ایں کنم
ایں دلیل اختیار ست اے صنم

۶ انسان کا اپنے کئے ہوئے پر پشیمان اور ندامت ہونا یہ بھی اس کے مختار ہونے کی دلیل ہے۔

؎ واں پشیمانی کہ خوردی از بدی
ز اختیار خویش گشتی مہتدی

۷ بحالت بیماری آہ وزاری کرنا اپنے کئے ہوئے پر پشیمان ہونا۔ گناہوں سے توبہ اور استغفار کرنا۔ آئندہ کے لئے عہد و پیمان کرنا یہ علامتیں اختیار کی ہیں۔ اگر وہ معاصی قدرت واختیار میں نہ تھے تو ان پر یہ شرم اور ندامت حسرت وخجالت کس لئے ہے ؎

[1] سرنگوں [2] دفتر خامس صفحہ ۲۶۰

وقت بیماری ہمہ بیداری ست
وقت بیماری ہمہ بیداری ست
می کنی از جرم استغفار تو
می کنی از جرم استغفار تو
ے کنی نیت کہ باز آیم برہ
ے کنی نیت کہ باز آیم برہ
ے بخشد ہوش و بیداری ترا
ے بخشد ہوش و بیداری ترا[1]

حکایت در جواب سارق جبری واثبات اختیار

آں یکے میرفت بالائے درخت
ے فشاند او میوہ را دز دانہ سخت
صاحب باغ آمد و گفت اے دنی
از خدا شرمیت کہ چہ ے کنی
گفت از باغ خدا بندۂ خدا
گر خورد خرما کہ حق کردش عطا
عا میانہ چہ ملامت ے کنی
بخل برخوان خدا وند غنی

جواب

گفت اے ایبک بیاور آں رسن
تا بگویم من جواب بو الحسن

[1] دفتر اول: صفحہ ۵۴

پس و بستش سخت آں دم بر درخت
میزداو برپشت وساقش چوب سخت
گفت آخر از خدا شرمے بدار
می کشی این بیگنہ را زار زار
گفت کز چوب خدا ایں بندہ اش
میرء اند بر پشت دیگر بندہ خوش
چوب حق و پشت و پہلو آن او
من غلام آلت و فرمان او
گفت توبہ کردم از جبر اے عیار
اختیارست اختیارست اختیار

یہ تو جبریہ کا رد تھا اب قدریہ اور معتزلہ کا رد سنئے کہ جو بندہ کو اپنے افعال کا خالق اور موجد بتلاتے ہیں۔

؎ کرد حق و کرد ماہر دو بیں
کرد مارا ہست واں پیداست ایں

ترجمہ: ”حق تعالیٰ کے فعل اور ہمارے فعل دونوں پر نظر کر اور ہمارے فعل کو بھی موجود اور ہست سمجھ جیسا کہ ظاہر ہے۔“

؎ گر نباشد فعل خلق اندر میاں
پس مگو کس را چرا کردی چناں

ترجمہ: ”اگر مخلوق اور بندہ کا فعل درمیان میں نہ ہو تو پھر کسی کو ہرگز نہ کہنا چاہئے کہ تو نے یہ کام کیوں کیا۔“

؎ خلق حق افعال مارا موجد است
فعل ما آثار خلق ایزدست

ترجمہ: ”حق تعالیٰ شانہ کی صفت تکوین ہمارے افعال کی موجد ہے اور ہمارے افعال اس کی صفت تخلیق کے آثار اور نشان ہیں۔“

ناطقی یا حرف بیند یا غرض
کے شود یکدم محیط دو غرض

ترجمہ: ”متکلم آن واحد میں یا تو فقط حرف اور لفظ کی طرف التفات کر سکتا ہے یا فقط معنی کی طرف ایک آن میں دو چیزوں کی طرف پوری توجہ اور التفات ناممکن ہے۔“

گر بمعنی رفت غافل شد زحرف
پیش و پس یکدم نہ بیند ہیچ طرف

ترجمہ: ”اگر معنی کی طرف توجہ کی تو لفظ اور حرف سے غافل ہو گیا جس طرح ایک آن میں آگے اور پیچھے دونوں طرف نظر کرنا ناممکن ہے۔“

آں زماں کہ پیش بینی آں زماں
تو پس خود کے بہ بینی ایں بداں

ترجمہ: ”جس وقت تو آگے دیکھتا ہے اسی وقت میں پیچھے کیسے دیکھ سکتا ہے اس کو خوب سمجھ لے۔“

چوں محیط حرف و معنی نیست جاں
چوں بود جاں خالق ایں ہر دو آں

ترجمہ: ”جب انسان کی روح بیک وقت لفظ اور معنی دونوں کا احاطہ نہیں کر سکتی تو پھر انکی خالق کیسے ہو سکتی ہے اس لئے کہ خالق کے لئے محیط ہونا ضروری ہے۔“

حق محیط جملہ آمد اے پسر
واندارد کارش از کار دگر

ترجمہ: ''حق تعالیٰ تمام کائنات کو محیط ہے۔ ایک کام دوسرے کام سے اس کو غافل نہیں کرتا لہٰذا وہی بندہ کے افعال کا خالق ہوگا۔''

معلوم ہوا کہ بندہ نہ تو اپنے افعال کا خالق اور فاعل مستقل ہے۔ اور نہ جماد کی طرح مجبور محض ہے۔ اختیار اور اضطرار کے بین بین ہے۔ بندہ کا ہر فعل جبر اور اختیار کی آمیزش سے صادر ہوتا ہے اور یہی اہل سنت والجماعت کا مذہب ہے۔ مولانا بندہ کے اختیار کی حقیقت بیان فرماتے ہیں۔

اشترے ام لاغر وہم پشت ریش
زاختیار ہمچو پالاں شکل خویش

ترجمہ: ''میں اس اختیار کی وجہ سے کہ جو مثل پالان کے مجھ پر رکھا ہوا ہے ایک لاغر اور پشت ریش شتر کی طرح ہوں۔''

ایں کژاوہ گہ شود ایں سو کشاں
آں کژاوہ گہ شود آں سو کشاں

ترجمہ: ''یہ کژاوہ کبھی اس طرف جھکتا ہے اور کبھی دوسری طرف، یہی بندہ کے اختیار کا حال ہے کبھی اس طرف مائل ہے اور کبھی دوسری طرف۔''

بندہ اگر اپنے افعال کا خالق ہوتا تب مکلّف بھی نہ ہوتا۔ اور اگر مجبور محض ہوتا تو تب بھی شجر اور حجر کی طرح امر و نہی کا مکلّف نہ ہوتا۔ اس من وجہ اختیار اور من وجہ اضطرار ہی نے اس کو مکلّف بنایا ہے۔

حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے کسی شخص نے دریافت کیا کہ بندہ مختار ہے یا مجبور؟ فرمایا کہ ایک پیر اٹھالو اور ایک پیر پر کھڑے ہو جاؤ۔ اس نے ایک پیر اٹھا لیا اور دوسرے پر کھڑا ہو گیا۔ فرمایا دوسرا پیر بھی اٹھالو۔ سائل نے عرض کیا کہ یہ تو ممکن نہیں۔ فرمایا کہ بس سمجھ لو کہ بندہ اتنی مقدار میں مختار ہے اور اتنی مقدار میں مجبور

گفت سلطاں بلکہ آنچہ از نفس زاد
ریع تقصیر است و دخل اجتہاد

ترجمہ: ”بادشاہ نے کہا جو عمل بھی نفس سے پیدا ہوتا ہے وہ اس کی تقصیر و کوتاہی کا ثمرہ ہوتا ہے اور اس کے اجتہاد اور کوشش کو اس میں ضرور دخل ہوتا ہے۔“

ورنہ کے آدم بگفتے با خدا
رَبَّنَآ اِنَّنَا ظَلَمْنَآ اَنْفُسَنَا

ترجمہ: ”ورنہ اگر بندہ کی کوشش اور اجتہاد کو تقصیر میں کوئی دخل نہ ہوتا تو حضرت آدم علیہ السلام ”رَبَّنَا ظَلَمْنَآ اَنْفُسَنَا الخ“[۱] ترجمہ: ”اے رب ہمارے ظلم کیا ہم نے اپنی جانوں پر۔“ کہہ کر اپنی تقصیر کا اعتراف کیسے فرماتے۔“

خود بگفتے ایں گناہ از بخت بود
چوں قضا ایں بود حزم ماچہ سود

ترجمہ: ”بلکہ یہ کہتے کہ یہ گناہ تو قسمت اور تقدیر سے تھا۔ جب قضا ہی ایسی تھی تو ہماری احتیاط کیا نفع دیتی۔“

ہمچو ابلیسے کہ گفت اَغْوَیْتَنِیْ
تو شکستی جام وما را میزنی

ترجمہ: ”جیسے ابلیس نے اغویتنی کہا کہ تو نے ہی ہمارا جام توڑا اور تو ہی ہم کو مارتا ہے۔“

بل قضا حق است و جہد بندہ حق
ہیں مباش اعور چو ابلیس خلق

---

[۱] القرآن ۷/۲۳

ترجمہ: ''بلکہ قضا اور تقدیر بھی حق ہے۔ اور بندہ کا کسب اور اس کی کوشش بھی حق ہے۔ ابلیس لئیم کی طرح یک چشم مت بن کہ صرف قضا پر نظر کرے اور اپنے کسب واختیار سے آنکھ بند کر لے۔''

بر قضا کم نہ بہانہ اے جوان
جرم خود را چوں نہی بر دیگراں

ترجمہ: ''قضا پر بہانہ مت رکھو اپنا جرم دوسروں پر کیوں ڈالتے ہو۔''

خوں کند زید و قصاص او بعمرو
می خورد بکر و براحمد حد خمر

ترجمہ: ''خون تو کرے زید اور قصاص لیا جائے عمرو سے شراب تو پئے بکر اور حد خمر جاری ہو احمد پر۔ اسی طرح گناہ تو کریں آپ اپنی کوشش اور جدوجہد سے اور بہانہ رکھیں قضا وقدر پر۔''

درچہ کردی جہد کاں با تو نگشت
توچہ کاریدی کہ نامد ریع کشت

ترجمہ: ''تو نے کس کام میں کوشش کی تھی کہ اس کا نتیجہ تجھ کو حاصل نہ ہوا تو نے کب کاشت کی تھی کہ اس کا ثمر تجھ کو نہ ملا ہو۔''

یعنی جس کام میں بھی تو نے کوشش کی اس کا نتیجہ اور ثمرہ تجھ کو ضرور ملا۔

اسی طرح اپنے برے اور اچھے اعمال کے اخروی نتائج اور ثمرات کو بھی سمجھو۔

فعل تو کاں زاید از جان وتنت
ہمچو فرزند است بگیرد دامنت

ترجمہ: ''جو فعل کہ تیری جان اور تن سے پیدا ہوتا ہے وہ قیامت کے دن فرزند کی طرح تیرا دامن گیر ہوگا۔''

فعل رادر غیب صورت می کنند
فعل دزدی را نہ دارے میزنند

ترجمہ: ''ہر فعل کی عالم غیب میں ایک صورت بناتے ہیں۔ کیا فعل سرقہ (چوری) کے لئے دار (پھانسی) نہیں بناتے۔''

دار کے ماند بدزدی لیک آں
ہست تصویر خدائے غیب داں

ترجمہ: ''حالانکہ دار (پھانسی) فعل سرقہ کے ظاہراً بالکل مشابہ نہیں۔ بلکہ خدائے غیب داں کی بنائی ہوئی ایک صورت ہے جو معناً فعل سرقہ کے مشابہ ہے۔''

دردل شحنہ چو حق الہام داد
کایں چنیں صورت بسازد بہر داد

ترجمہ: ''حق تعالیٰ نے کوتوال کے دل میں الہام فرمایا کہ عدل اور انصاف کے لئے ایسی ہی صورت بنائے۔''

تا تو عالم باشی و عادل قضا
نامناسب چوں دہد داورا سزا

ترجمہ: ''تاکہ تو عالم اور عادل بن جائے پس رب العالمین کیسے ظلم کر سکتا ہے اور اس کی قضا کیسے نامناسب سزا دے سکتی ہے۔''

چونکہ حاکم ایں کند اندر گزیں
چوں کند احکم ایں حاکمیں

ترجمہ: ''پس جس طرح دنیا میں ایک مجازی حاکم کی یہ سزا عین عدل وانصاف ہے تو اس احکم الحاکمین کی جزا کیسے عدل اور انصاف کے خلاف

ہوسکتی ہے۔ ”اِنَّ اللّٰہَ لَا یَظْلِمُ مِثْقَالَ ذَرَّۃٍ“[1] ترجمہ: ”اللہ تعالیٰ تو ذرہ برابر بھی ظلم نہیں فرماتا۔“

چوں بکاری جو نروید غیر جو
قرض تو کردی زکہ خواہی گرو

ترجمہ: ”جب جو بوؤ گے تو سوائے جو کے اور کچھ نہ پیدا ہوگا جیسا تخم ہوگا اسی کے مطابق اس کا ثمر اور نتیجہ ہوگا۔ قرض تو نے کیا پھر رہن کی خواہش کس سے کرتے ہو۔“

گندم[2] از گندم بروید جو زجو
از مکافات عمل غافل مشو

ترجمہ: ”گندم سے گندم اور جو سے جو پیدا ہوتا ہے پس جزائے اعمال سے غافل مت رہو جیسا عمل ہوگا ویسی ہی اس کی جزا ہوگی۔“

جرم برخود نہ کہ تو خود کاشتی
باجزاء و عدل حق کن آشتی

ترجمہ: ”جرم اپنا سمجھو کہ تو نے خود بویا تھا۔ حق تعالیٰ شانہ کے عدل اور انصاف اور اس کی جزاء سے دوستی رکھو۔“

متہم کن نفس خود را اے فتا
متہم کم کن جزائے عدل را

ترجمہ: ”اپنے نفس کو متہم سمجھو، حق تعالیٰ کے سراپا عدل جزاء کو متہم مت سمجھو۔“

توبہ کن مردانہ سر آورد برہ
کہ فمن یعمل بمثقال یرہ

---

[1] القرآن ۴/۴۰

[2] یہ شعر مثنوی میں اس جگہ نہیں ہے محض مناسبت کی وجہ سے یہاں لکھ دیا گیا ہے۔

ترجمہ: ”مردوں کی طرح اس فاسد عقیدے سے توبہ کرو۔ اور اس کی بارگاہ بے نیاز میں سر تسلیم خم کر دو اس لئے کہ جو شخص ذرہ برابر بھی عمل کرے گا قیامت کے دن اس کو اسی طرح دیکھے گا۔“ [ا]

تمثیل

یک مثل اے دل پئے فرقے بیار
تابدانی جبر را از اختیار

اے دل ایک مثال بیان کرتا ہوں کہ جبر واختیار کا فرق معلوم ہو سکے

دست کو لرزاں بود از ارتعاش
وآنکہ دستے راتو لرزائی زجاش
ہر دو جنبش آفریدہ حق شناس
لیک نتواں کرد ایں باآں قیاس

یعنی ہاتھ کی ایک ارتعاشی اور اضطراری حرکت ہے اور ایک اختیاری اور ارادی حرکت ہے۔ دونوں حرکتیں حق تعالیٰ شانہ کی پیدا کی ہوئی ہیں مگر ایک کو دوسرے پر قیاس نہیں کر سکتے ہر شخص جانتا ہے کہ ارتعاشی حرکت میں بندہ کے اختیار وارادہ کو دخل نہیں۔ اور جب ہاتھ کو اپنے ارادہ سے حرکت اور جنبش دی جائے تو وہ حرکت اختیاری حرکت سمجھی جاتی ہے ۔

زاں پشیمانی کہ لرزا نیدیش
مرتعش را کے پشیماں دیدیش

یہی وجہ ہے کہ اختیاری حرکت پر کبھی پشیمانی اور ندامت ہوتی ہے مگر ارتعاشی

[ا] مثنوی دفتر ششم: جلد ۶ صفحہ ۴۰

حرکت والا کبھی نادم اور پشیمان نہیں دیکھا گیا۔ انسان نادم اس فعل پر ہوتا ہے کہ جس کو اپنے اختیاری و ارادہ سے کیا ہو۔ اضطراری فعل پر کبھی نادم نہیں ہوتا۔ پس انسان کا اپنے افعال پر نادم اور پشیمان ہونا اس کے مختار ہونے کی دلیل ہے۔

الحاصل مخلوق خداوندی ہونا جبر اور اضطرار کو مستلزم نہیں۔ ورنہ حرکات اختیاریہ اور حرکات اضطراریہ اور حرکات انسانیہ اور حرکات جمادیہ میں کوئی فرق نہ ہونا چاہئے۔ اس لئے کہ سب حرکات اسی کی مخلوق ہیں۔ مگر بااین ہمہ کسی عاقل کے نزدیک انسان کی اختیاری حرکت ارتعاشی حرکت اور شجر وحجر کی حرکت کے مشابہ نہیں۔ "فافهم ذلك واستقم."

پیش قدرت خلق جملہ بارگہ
عاجزاں چوں پیش سوزن کارگہ

ترجمہ: "قدرت الٰہی کے سامنے تمام مخلوق اس طرح عاجز ہے جس طرح کپڑے کا کارخانہ سوئی کے سامنے۔"

زاری باشد دلیل اضطرار
خجلت باشد دلیل اختیار

ترجمہ: "ہماری یہ زاری دلیل اضطرار کی ہے۔ اور شرمندگی دلیل اختیار کی"

گر نبود اختیار ایں شرم چیست
ویں دریغ و خجلت و آرزم چیست

ترجمہ: "اگر اختیار نہ ہوتا تو یہ شرم اور حسرت اور ندامت اور ذلت کیوں ہوتی۔"

در ہر آں کارے کہ میل ستت بداں
قدرت خود راہمی بینی عیاں

ترجمہ: ”جس کام میں تیری خواہش ہوتی ہے اس میں اپنی قدرت اور اختیار کو خوب ظاہر دیکھتا ہے۔“

در ہر آں کارے کہ میلت نیست و خواست
اندر آں جبری شوی کایں از خداست

ترجمہ: ”اور جس کام میں تیری خواہش نہیں ہوتی اس کام میں تو جبری بن جاتا ہے اور کہتا ہے کہ یہ خدا کی جانب سے ہے۔“

انبیاء درکار دنیا جبری اند
کافراں در کار عقبےٰ جبری اند

ترجمہ: ”انبیاء دنیا کے کام میں مجبور ہیں اور کافر آخرت کے کام میں مجبور۔“

انبیاء راکار عقبےٰ اختیار
جاہلاں را کار دنیا اختیار

ترجمہ: ”انبیاء آخرت کے کام پسند کرتے ہیں۔ اور نادان دنیا کے کام پسند کرتے ہیں۔“

کافراں چوں جنس سجین آمدند
سجن دنیا را خوش آئیں آمد ند

ترجمہ: ”کافر چونکہ جنس سجین سے ہیں اس لئے ان کو سجن دنیا اچھی معلوم ہوئی۔“

انبیاء چوں جنس علیین بدند
سوئے علیین بجان و دل شوند

ترجمہ: ”انبیائے کرام چونکہ علیین سے ہیں اس لئے وہ علیین ہی کی طرف جان و دل سے چلتے ہیں۔“

توفیق میان ایں دو حدیث کہ اَلرِّضَاءُ بِالْکُفْرِ کُفْرٌ
وحدیث دیگر کہ مَنْ لَمْ یَرْضَ بِقَضَائِیْ وَلَمْ یَصْبِرْ
عَلٰی بَلَائِیْ فَلْیَطْلُبْ لَہٗ رَبًّا سِوَائِیْ

دے سوالے کرد سائل مر مرا[1]
زاں کہ عاشق بود او بر ماجرا
گفت نکتہ الرضا بالکفر کفر
ایں پیمبر گفت و گفت اوست مہر[2]
باز فرمود اوکہ[3] اندر ہر قضا
مر مسلماں را رضا باید رضا
نے قضائے حق بود کفر او نفاق
گر بدیں راضی شوم گردد شقاق
ورنیم راضی بود آں ہم زیاں
پس چہ چارہ باشدم اندر میاں
گفتمش ایں کفر مقضی نے قضاست
ہست آثار قضا ایں کفر راست
پس قضا را خواجہ از مقضی بداں
تا اشکالت رفع گردد در زماں

[1] برمناظرہ
[2] سند۔ (اور اس مضمون کی تشریح کے لئے علم الکلام کے ابتدا میں وہ مضمون دیکھئے کہ جو اس عنوان کے تحت درج ہو چکا ہے کہ خدا تعالیٰ خالق خیر بھی ہیں اور خالق شر بھی)
[3] صلی اللہ علیہ وسلم

راضیم از کفر زاں رو کہ قضاست
نے ازاں روکہ نزاع و خبث ماست
کفر از روئے قضا خود کفر نیست
حق ما کافر مخواں ایں جا مائیست
کفر جہل ست و قضائے کفر علم
ہر دو یک باشند آخر خلم و حلم
زشتئ خط زشتئ نقاش نیست
بلکہ ازوے زشت را بنمود نیست
قوت نقاش باشد آں کہ او
ہم تواند زشت کردن ہم نکو[1]

مثال در بیان معنی اَنْ تُؤْمِنَ بِالْقَدْرِ خَیْرِہٖ وَشَرِّہٖ

کرد نقاشے دو گونہ نقشہا
نقشہائے صاف[2] و نقش بے ریا
نقش یوسف کرد حور خوش سرشت
نقش عفریتاں[3] و ابلیسان زشت
ہر دو گونہ نقش استادی اوست
زشتی او نیست آں رادی[4] اوست
خوب را در غایت خوبی کشد
حس[5] عالم چاشنی ازوے[6] چشد

---

[1] دفتر سوم: صفحہ ۱۵ [2] مؤمن [3] دیواں [4] حکیمی
[5] ادراک [6] ازخدا

زشت را در غایت زشتی کند
جملہ زشتی بابگردش برتند
تا کمال دانشش پیدا شود
منکر استا دیش رسوا شود
ورنہ تاند زشت کردن ناقص ست
زیں سبب خلاق گبر[1] و مخلص[2] ست[3]

سمع وبصر

یعنی وہ ذات پاک ہر چیز کو دیکھتی ہے اور ہر آواز کو سنتی ہے حتیٰ کہ قلب کے خطرات بھی اس کی نظر سے مخفی نہیں۔ قال تعالیٰ:

﴿اِنَّهٗ بِكُلِّ شَیْءٍۢ بَصِیْرٌ﴾[4]

ترجمہ: "بے شک وہ ہر شے کو دیکھنے والا ہے۔"

﴿اِنَّ اللّٰهَ سَمِیْعٌ عَلِیْمٌ﴾[5]

ترجمہ: "یقیناً اللہ سننے والا اور جاننے والا ہے۔"

﴿اِنَّ اللّٰهَ هُوَ السَّمِیْعُ الْبَصِیْرُ﴾[6]

ترجمہ: "حقیقۃً اللہ ہی سننے والا اور دیکھنے والا ہے۔"

الحاصل وہ سمیع بھی ہے اور بصیر بھی اور کیوں نہ ہو اس لئے کہ جب مخلوق اس صفت کمال سے موصوف ہے سو اگر خالق اس صفت کمال سے عاری ہے تو مخلوق[7] کا خالق سے بھی اکمل اور بہتر ہونا لازم آتا ہے نیز سمع[8] اور بصر سے خالی ہونا ایک عیب ہے کہ جس کا بارگاہ خداوندی میں گزر ہی محال اور ناممکن ہے اور اسی وجہ سے کہ سمع

[1] کافر [2] مسلمان [3] دفتر دوم: صفحہ ۲۲۵ [4] القرآن: ۶۷/۱۹
[5] القرآن: ۲/۱۸۱ [6] القرآن: ۴۰/۲۰
[7] کمافی شرح العقیدۃ الاصفہانیہ صفحہ ۷۵ [8] کمافی شرح العقیدۃ الاصفہانیہ صفحہ ۶۵

اور بصر کا نہ ہونا عیب ہے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بتوں کی عبادت کرنے والوں سے یہ فرمایا کہ:

﴿لِمَ تَعْبُدُ مَالَا يَسْمَعُ وَلَا يُبْصِرُ وَلَا يُغْنِىْ عَنْكَ شَيْئًا﴾ [۱]

ترجمہ: ”(اے آزر) کیوں ایسی شئے کی پرستش کرتے ہو کہ جو نہ سنتی ہے اور نہ دیکھتی ہے اور نہ تمہارے لئے کچھ کارآمد ہے۔“

نیز اگر خالق ان صفات کمال سے عاری ہے تو مخلوق میں سمع و بصر کا کمال کہاں سے آ گیا۔ قال تعالیٰ:

﴿وَهُوَ الَّذِىْٓ اَنْشَاَلَكُمُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَالْاَفْئِدَةَ ؕ قَلِيْلًا مَّا تَشْكُرُوْنَ﴾ [۲]

ترجمہ: ”اور وہ (اللہ) وہی تو ہے جس نے تمہارے لئے کان اور آنکھیں اور دل بنائے (لیکن) تم لوگ بہت ہی کم شکر ادا کرتے ہو۔“

تکلم

یعنی اس کی ایک صفت کلام بھی ہے جس سے چاہتا ہے کلام کرتا ہے کیونکہ گونگا ہونا عیب اور نقص ہے اور ذات خداوندی ہر عیب سے پاک ہے۔ قال تعالیٰ:

﴿وَاتَّخَذَ قَوْمُ مُوْسٰى مِنْۢ بَعْدِهٖ مِنْ حُلِيِّهِمْ عِجْلًا جَسَدًا لَّهٗ خُوَارٌ ؕ اَلَمْ يَرَوْا اَنَّهٗ لَا يُكَلِّمُهُمْ وَلَا يَهْدِيْهِمْ سَبِيْلًا ۘ اِتَّخَذُوْهُ وَكَانُوْا ظٰلِمِيْنَ﴾ [۳]

ترجمہ: ”حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قوم نے ان کے زیورات سے ایک گوسالہ بنا لیا۔ جس میں ایک آواز بھی تھی۔ کیا ان لوگوں نے اس کو نہیں دیکھا کہ نہ تو وہ ان سے کلام کرتا ہے اور نہ کسی امر میں ان کی

---

[۱] القرآن: ۱۹/۴۲ [۲] القرآن: ۲۳/۷۸ [۳] القرآن: ۷/۱۴۸

رہنمائی کرتا ہے۔ خواہ مخواہ اس کو معبود بنا لیا۔ اور تھے بھی وہ بہت غیر منصف۔"

اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ جو ذات صفت کلام سے عاری ہو اس کو خدا بنانا انتہا درجہ کا ظلم ہے۔ لہٰذا قرآن عزیز میں اس صفت کو خدا کے لئے ثابت کیا گیا۔ کما قال تعالیٰ:

﴿وَكَلَّمَ اللّٰهُ مُوْسٰى تَكْلِيْمًا﴾ [1]

ترجمہ: "اللہ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کلام فرمایا۔"

اور جس طرح اس کا وجود دوسروں کے وجود کے مشابہ نہیں اسی طرح اس کا کلام دوسروں کے کلام کے مشابہ نہیں اور جس طرح خداوند ذوالجلال کی صفت علم اور صفت قدرت وغیرہ بے چون و چگون اور قدیم اور غیر مخلوق ہیں۔ اسی طرح اس کی صفت کلام بھی قدیم اور غیر مخلوق اور بے چون و چگون ہے۔

جاننا چاہئے کہ کلام الٰہی کا اطلاق دو معنی پر ہوتا ہے۔ اول یہ کہ کلام، اللہ تعالیٰ کی ایک صفت قدیمہ ہے جو اس کی ذات کے ساتھ قائم ہے اور بسیط ہے۔ دوم وہ کلمات جس کا حق سبحانہ وتعالیٰ نے تکلم فرمایا۔ قرآن کو اسی معنی میں کلام الٰہی کہا جاتا ہے۔ یہ کلمات بھی قدیم اور مجرد عن المادۃ ہیں اس لئے کہ پروردگار عالم سے ان کا ظہور اور صدور ہوا ہے اور جو شئے قدیم سے ظاہر اور صادر ہوگی وہ بھی قدیم ہوگی۔ ہمارے الفاظ اور حروف اور ہماری آواز ان کلمات الٰہیہ کے لئے بمنزلہ آئینہ کے ایک مظہر اور تجلی گاہ ہیں۔

اگر کسی شئے کا عکس آئینہ میں پڑے تو اصل شئے کو عکس کے عوارض سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ اسی طرح ہماری قرأت اور کتابت میں جو حدوث کے لوازم پائے جاتے ہیں کلمات الٰہیہ کو ان سے کوئی تعلق نہ ہوگا۔ قدیم اپنے قدم پر رہے گا حادث اپنے

[1] القرآن: ۴/۱۶۴

حدوث پر رہے گا۔ حدوث اور امکان کے تمام عوارض بندہ کی طرف متوجہ ہوں گے اور خدا اور اس کا کلام ان سب سے منزہ اور مقدس ہوگا۔ اِدھر تنزیہ و تقدیس ہوگی، اُدھر تشبیہ و تمثیل ہوگی۔ اِدھر وجوب اور قدم ہوگا۔ اُدھر حدوث اور امکان ہوگا۔

دوسرے عنوان سے اس کو یوں سمجھو کہ الفاظ اور عبارات معانی کے لئے بمنزلہ آئینہ کے ہیں۔ معانی الفاظ میں حلول کئے ہوئے نہیں ہوتے۔ اور نہ الفاظ اور عبارات معانی کے لئے محل اور ظرف ہیں بلکہ الفاظ معانی کے لئے مظہر اور تجلی گاہ اور ایک آئینہ ہیں لفظ اور معنی میں ظاہر اور مظہر ہونے کا علاقہ ہے حال اور محل، ظرف اور مظروف جیسا علاقہ نہیں۔ کوئی شخص یہ نہیں سمجھا سکتا کہ معانی، الفاظ کے آئینہ میں کس طرح عکس افگن اور جلوہ گر ہیں۔ فقط اجمالاً اتنا جانتا ہے کہ الفاظ اور عبارات معانی کے ظاہر کرنے کا ایک آئینہ ہے۔ اور الفاظ و عبارات کی صفات اور کیفیات سے معانی کو کوئی تعلق نہیں۔

اسی طرح ہماری زبانیں اور ہمارے کتابی نقوش کلمات قدسیہ کے لئے ایک آئینہ ہیں حدوث اور امکان کے تمام عوارض ہماری زبان اور کتاب کی طرف متوجہ ہوں گے اور اس کا کلام پاک، ان تمام عوارض سے پاک اور منزہ ہوگا۔

تنبیہ

یہ جو کچھ عرض کیا گیا بہت مختصر اور مجمل ہے حضرات اہل علم کے اشارہ کے لئے لکھ دیا۔ تفصیل اگر درکار ہو تو تفسیر روح المعانی کے مقدمہ کی مراجعت کریں اور اس ناچیز نے بھی اس مسئلہ کی توضیح اور تفصیل کے لئے عربی میں ایک رسالہ لکھا ہے انشاء اللہ تعالیٰ ہدیہ ناظرین ہوگا۔

قدم اور بقاء، ازلیت اور ابدیت

یعنی اللہ تعالیٰ قدیم ہے حادث نہیں، باقی ہے زوال اور فناء کا اس کی بارگاہ میں

گزر نہیں۔ ازلی اور ابدی ہے نہ اس کی کوئی ابتداء ہے اور نہ انتہا، وہی سب سے اول ہے اور وہی سب سے آخر۔ نہ کوئی اس سے پہلے ہے اور نہ کوئی اس کے بعد۔ قال تعالیٰ:

﴿هُوَ الْاَوَّلُ وَالْاٰخِرُ وَالظَّاهِرُ وَالْبَاطِنُ ۚ﴾ [1]

ترجمہ: "وہی ہے سب سے پہلا اور سب سے پچھلا اور باہر اور اندر۔"

(اور اگر خدا قدیم اور ازلی نہ ہوتا تو حادث ہوگا اور صانع وموجد کا محتاج ہوگا اور جو محتاج ہو وہ خدا نہیں)۔ [2]

نیز واجب الوجود اس کو کہتے ہیں کہ جس کا وجود ذاتی اور اصلی ہو اور جس کا وجود اصلی اور ذاتی ہوگا اس کا عدم یقیناً محال ہوگا اور جس کا عدم محال ہو وہی قدیم اور ازلی ہے۔ [3]

جب یہ ثابت ہوگیا کہ وہ حدوث اور امکان سے پاک اور منزہ ہے تو ثابت ہو گیا کہ وہ قدیم بالذات اور ازلی ہے اور جب یہ ثابت ہوگیا کہ اس کو فناء اور زوال نہیں تو ثابت ہوا کہ وہ باقی ہے اور ابدی ہے۔ قال تعالیٰ:

﴿كُلُّ شَيْءٍ هَالِكٌ اِلَّا وَجْهَهٗ﴾ [4]

ترجمہ: "سوائے خدا کے ہر چیز فانی ہے۔"

وقال تعالیٰ:

﴿كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ ۝ وَيَبْقٰى وَجْهُ رَبِّكَ ذُو الْجَلٰلِ وَالْاِكْرَامِ ۝﴾ [5]

ترجمہ: "سب فنا ہو جائیں گے اور صرف خداوند ذوالجلال کی ذات

---

[1] القرآن: ۵۷/۳ [2] قالہ الامام الغزالی رحمہ اللہ تعالیٰ فی الاحیاء: جلد ۱ صفحہ ۹۴

[3] قالہ السبکی فی شرح عقیدۃ ابن الحاجب کذا فی الاتحاف: جلد ۲ صفحہ ۹۷

[4] القرآن: ۲۹/۸۸ [5] القرآن: ۵۵/۲۶، ۲۷

بابرکات باقی رہے گی۔''

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد مبارک ہے:

''کَانَ اللّٰہُ وَلَمْ یَکُنْ مَّعَہٗ شَیْءٌ''

ترجمہ: ''سب سے پہلے اللہ کی ذات تھی اور اس کے ساتھ کچھ نہ تھا۔''

اور یہی تمام اہل اسلام کا اجماعی عقیدہ ہے اسی وجہ سے امام غزالی رحمہ اللہ تعالیٰ نے فارابی اور ابن سینا کی تکفیر کی ہے کہ یہ لوگ عقول اور نفوس اور ہیولی اور صورت اور سموات کے قدیم ہونے کے قائل ہوئے ہیں۔[1]

آریوں کے نزدیک بھی مادہ اور روح خدا تعالیٰ کی طرح ازلی اور ابدی ہے۔ چونکہ خدا تعالیٰ کا معدوم ہونا اور وجود کا ذات خداوندی سے جدا ہونا سب عقلاء کے نزدیک محال اور ناممکن ہے۔

اس لئے صوفیہ کرام کی ایک جماعت وجود کو خدا کا عین ذات قرار دیتی ہے۔ اس لئے کہ خدا تعالیٰ کو معدوم نہیں کہا جا سکتا بخلاف ممکنات کے کہ وہاں یہ کہا جا سکتا ہے کہ فلاں شئے موجود ہے اور فلاں شئے معدوم یا یہ شئے پہلے معدوم تھی اب موجود ہوگئی اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ممکنات کا وجود عین ذات نہیں بلکہ غیر ذات ہے جیسے نور آفتاب کے حق میں عین آفتاب ہے اور زمین کے حق میں زائد اور عارضی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ عالم حادث ہے کہ اس کا وجود ذاتی نہیں بلکہ عارضی ہے۔[2]

احاطہ

وہ سب کو محیط ہے کوئی شئے اس کے احاطہ سے باہر نہیں۔

﴿اَلَآ اِنَّہٗ بِکُلِّ شَیْءٍ مُّحِیْطٌ.﴾[3]

---

[1] مکتوبات امام ربانی: جلد ۱ صفحہ ۳۱۵

[2] تفصیل الکلام فی کون الوجود زائد وغیرہ فی الاتحاف: جلد ۲ صفحہ ۹۴ — [3] القرآن: ۴۱/۵۴

ترجمہ: ”بے شک حق تعالیٰ سب کو محیط ہے۔“

﴿وَلِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ. وَكَانَ اللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ مُّحِيْطًا ﴾ ؎۱

ترجمہ: ”آسمان اور زمین کی تمام چیزیں اسی کی ملک ہیں۔ اور وہی سب کو محیط ہے۔“

حضرت مجدد سرہندی رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ حق تعالیٰ شانہ تمام اشیاء کو محیط ہے اور سب کے ساتھ اس کو قرب اور معیت ہے مگر وہ ایسا احاطہ اور ایسا قرب و معیت نہیں کہ جو ہمارے فہم قاصر میں آسکے بلکہ جو اس کی شان کے شایاں ہو۔ اپنے کشف اور شہود سے جو معلوم کرتے ہیں وہ اس سے بھی منزہ اور مقدس ہے۔

ممکن کو اس ذوالجلال کی ذات و صفات اور افعال کی حقیقت میں غور کرنے سے سوائے جہالت اور حیرت کے کیا حاصل ہو سکتا ہے۔ بس اس کو ایمان بالغیب لانا چاہئے کہ وہ محیط ہے اور ہم سے قریب ہے۔ اور ہمارے ساتھ ہے اگرچہ ہم اس کی حقیقت کے ادراک سے قاصر ہیں۔

؎ ہنوز ایوان استغناء بلند است
مرا فکر رسیدن ناپسند است ؎۲

وجود کا موجودات کو محیط ہونا، روح کا ذی روح کو محیط ہونا، عقل کا معقولات کو محیط ہونا۔ قدرت کا مقدورات کو محیط ہونا سب عقلاء کو مسلم ہے۔ مگر اس احاطہ کی حقیقت اور کنہ کے ادراک سے سب قاصر ہیں۔ اسی طرح اگر ہم اس ”لَيْسَ كَمِثْلِهٖ“ اور بے چون وچگون کے ”اَلَا اِنَّهٗ بِكُلِّ شَيْءٍ مُّحِيْطٌ“ ہونے پر ایمان لائیں اور اس کی حقیقت کو اسی کے علم محیط کے سپرد کریں تو کیا استبعاد ہے۔ اسی طرح اس کا قرب اور اس کی معیت حق ہے مگر وہ کیف اور این سے پاک ہے ؎

؎۱ القرآن: ۴/ ۱۲۶ ؎۲ انتہی کلامہ مکتوبات: جلد ۱ صفحہ ۳۱۳، مکتوب: صفحہ ۲۶۶

اتصالے بے تکیف بے قیاس
ہست رب الناس را باجان ناس
قرب بے چوں است عقلت رابہ تو
نیست از پیش و پس سفل و علو
نور چشم و مردمک در دیدہ است
از چہ رہ آید بغیر شش جہت
جاں بتو نزدیک تو دوری از و
قرب حق راچوں بدانی اے عمو
آنکہ حق است اقرب از حبل الورید
تو فگندی تیر فکرت را بعید
بے تعلق نیست مخلوقے ازو
آں تعلق ہست بیچوں اے عمو

یعنی جس طرح عقل کو انسان کے ساتھ بے چون وچگون اور بدون سفل وعلو ایک تعلق اور اتصال ہے اور نور چشم کو چشم سے اور جان کو جسم سے بے چون وچگون اور بدون جہت کے قرب اور تعلق حاصل ہے۔ اسی طرح حق تعالیٰ شانہ کو اپنی مخلوق سے ایسا قرب اور تعلق ہے کہ وہم اور قیاس میں نہیں آسکتا اور کیف اور این سب سے منزہ ہے۔

غناء وصمدیت

وہ ہر شئے سے مستغنی اور بے نیاز ہے کسی شئے کی اس کو حاجت نہیں۔ ہر شئے اپنے وجود اور بقاء میں اسی کی محتاج ہے۔ کما قال تعالیٰ:

﴿اِنَّ اللّٰهَ لَغَنِیٌّ عَنِ الْعٰلَمِیْنَ ۝﴾ [1]

[1] القرآن: ۲۹/۶

تَرجَمۃ: ''بلاشبہ اللہ تعالیٰ سب سے بے نیاز ہے۔''

﴿ اَللّٰهُ الصَّمَدُ ۝ ﴾ [۲]

تَرجَمۃ: ''وہ تو سب سے مستغنی ہے اور سب اس کے محتاج ہیں۔''

آریوں کے نزدیک حق تعالیٰ اپنی تخلیق اور تکوین میں مادہ اور روح سے مستغنی اور بے نیاز نہیں۔

تخلیق وتکوین

وہ سب کا خالق ہے کوئی شئے ایسی نہیں کہ جو اس کی تخلیق اور تکوین سے مستثنیٰ ہو۔ اپنی مشیت اور اختیار سے پیدا کرتا ہے۔ اپنے ارادہ سے وجود عطا کرتا ہے۔ وجود کا مستعار خلعت جب چاہتا ہے واپس لے لیتا ہے کسی شئے کا وجود اصلی اور خانہ زاد نہیں۔ سب اسی کا عطیہ ہے۔ قال تعالیٰ:

﴿ اِنَّمَآ اَمْرُهٗٓ اِذَآ اَرَادَ شَيْئًا اَنْ يَّقُوْلَ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ ۝ ﴾ [۳]

تَرجَمۃ: ''جب وہ کبھی کسی چیز کا ارادہ کرتا ہے اسے اتنا فرما دینا (کافی ہے) کہ ہو جا، وہ اسی وقت ہو جاتی ہے۔''

جس طرح نور زمین اصلی اور خانہ زاد نہیں محض آفتاب کا فیض ہے جب چاہے اپنی شعاعوں سے اس کو منور کرے اور جب چاہے اپنی شعاعوں کے فیض سے اس کو محروم کر دے۔

﴿ ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ ۚ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ فَاعْبُدُوْهُ ۚ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ وَّكِيْلٌ ﴾ [۴]

تَرجَمۃ: ''اللہ ہی تمہارا رب ہے اس کے سوا کوئی معبود نہیں وہی سب چیزوں کا خالق ہے پس اسی کی عبادت کرو۔''

[۲] القرآن:۱۱۲/۲ — [۳] القرآن:۳۶/۸۲ — [۴] القرآن:۶/۱۰۲

﴿وَرَبُّكَ يَخْلُقُ مَا يَشَآءُ وَ يَخْتَارُ ۗ مَا كَانَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ ۗ﴾ ۱

تَرجَمۃ: ''اور وہی ہر چیز کا کارساز ہے۔ اللہ ہی جو چاہتا ہے اپنے اختیار سے پیدا کرتا ہے لوگوں کو اختیار نہیں۔''

پس جس طرح نور زمین آفتاب کا ایک پرتوہ اور عکس ہے حرکت طلوعی میں عطا کرتا ہے اور حرکت غروبی میں ضبط کر لیتا ہے۔ اسی طرح تمام کائنات کا وجود اسی کے وجود ازلی کا ایک پرتوہ اور عکس ہے اور یہ پرتوہ اور عکس بھی اسی کے ارادہ اور مشیت کے تابع ہے۔

جب ارادہ کرتا ہے تو نور وجود کے عکس سے سبع سموات اور ارضین کو منور کر دیتا ہے ﴿اَللّٰهُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ﴾ ۲ تَرجَمۃ: ''اللہ روشنی ہے آسمانوں اور زمین کی۔'' اور جب چاہتا ہے تو یہ معمولی عکس اور پرتوہ بھی مخلوقات سے چھین لیتا ہے جس طرح زمین اصل حقیقت کے لحاظ سے مظلم اور تاریک ہے اسی طرح تمام حقائق امکانیہ اپنی ذات سے سراسر اعدام ہیں۔ اصل حقیقت کے لحاظ سے زینت وجود سے بالکل محروم ہیں۔ جس طرح زمین آفتاب کے لئے ایک آئینہ ظلمت ہے۔ اسی طرح تمام عالم واجب جل مجدہ کے سامنے ایک آئینہ عدم ہے جس میں واجب الوجود کا وجود ازلی اور صفات کمالیہ منعکس ہو رہی ہیں۔

اس وجود ازلی کے انعکاس ہی نے اعدام (یعنی حقائق امکانیہ) کو وجود ممکن کے ساتھ موصوف کر دیا ہے اگر ان اعدام میں یہ وجود ازلی منعکس نہ ہوتا تو یہ ممکنات اعیان ثابتہ اور موجودات خارجیہ نہ کہلا سکتیں۔ لہٰذا یہ عدمات ان حقائق امکانیہ کے لئے بمنزلہ مادہ کے ہیں اور یہ عکوس اور ظلال بمنزلہ صورت کے ہیں اور ان کے مجموعہ کا نام اعیان ثابتہ اور موجودات خارجیہ ہے۔

---

۱ القرآن: ۲۸/۶۸ ۲ القرآن ۲۴/۳۵

کل ما فی الکون وھم او خیال
او عکوس فی المرایا او ظلال

اور اسی مضمون کو حضرت خواجہ باقی باللہ رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں ؎

بشناس کہ کائنات رو در عدم اند
بل در عدم ایستادہ ثابت قدم اند
این کون معلق از خیال و وہم است
باقی ہمگی ظہور نور قدم اند
پناہ بلندی و پستی توئی
ہمہ نیستند آنچہ ہستی توئی

اس مضمون کی اگر زائد تفصیل درکار ہو تو مکتوبات مجددیہ اور تفہیمات الٰہیہ کی مراجعت فرمائیں۔

حضرت یوسف علیہ السلام جب عزیز مصر ہو گئے تو لڑکپن کے ایک دوست ملنے کے لئے آئے۔ ملاقات ہوئی۔ ہر ایک نے اپنے حالات اور واقعات سنائے۔ جب یہ ہو چکا تو یوسف علیہ السلام نے فرمایا: بتلاؤ ہمارے لئے کیا سوغات اور تحفہ لائے ہو

بعد قصہ گفتنش گفت اے فلاں
ہیں چہ آوردی تو مارا ارمغاں
دیدن یاراں تہیدست اے کیا
ہست بے گندم شدن در آسیا

مہمان نے کہا کہ میں نے بہت غور کیا کہ آپ کے لئے کوئی ایسی پیش کش لے چلوں جو آپ کی شان کے شایان ہو لیکن کوئی چیز آپ کی شایان شان نہ ملی۔ صرف ایک چیز لایا ہوں۔ یہ کہہ کر بغل سے ایک آئینہ نکالا اور کہا یہ لایا ہوں تا کہ اس میں آپ اپنے جمال بے مثال کا مشاہدہ کریں اور جب دیکھیں تو مجھ کو یاد کریں۔

اسی طرح سمجھو کہ حدیث میں آیا ہے۔ "اِنَّ اللّٰہَ جَمِیْلٌ یُحِبُّ الْجَمَالَ" ترجمہ: "بے شک اللہ تعالیٰ خوبصورت ہے اور خوبصورتی کو پسند کرتا ہے۔" پس جمال کبریائی کے لئے بھی مخلوق کی طرف سے کسی آئینہ کا تحفہ چاہئے۔ پس اس مخلوق نے اپنے خالق کردگار کی بارگاہ میں اپنے عدم اور نیستی اور اپنی ذلت اور خواری کا آئینہ پیش کیا۔ تاکہ اس آئینہ نیستی میں اس واجب الوجود کی ہستی کا اور اس آئینہ ذلت وخواری میں اس ذوالجلال والاکرام کی عزت وجلال کا عکس موہوم مشاہدہ کیا جاسکے۔ ہستی اور کمال کا آئینہ نیستی اور نقص ہی ہوسکتا ہے صنعت طب کا جمال، مرض یعنی عدم صحت ہی کے آئینہ میں دیکھا جاسکتا ہے۔

عارف رومی فرماتے ہیں ؎

گفت یوسف ہیں بیاور ارمغاں
او زشرم این تقاضا زد فغاں
گفت من چند ارمغاں جستم ترا
ارمغانے در نظر نامد مرا
حبہ را جانب کاں کے برم
قطرہ را سوئے عماں چوں برم
لائق آں دیدم کہ من آئینہ
پیش تو آرم چو نور سینہ
تابہ بینی روئے خوب خود دراں
اے تو چوں خورشید و شمع آسماں
آئینہ آور دمت اے روشنی
تا چوبینی روئے خود یا دم کنی
آئینہ بیروں کشید او از بغل

خوب را آئینہ باشد مشتغل
آئینہ ہستی چہ باشد نیستی
نیستی بگزیں گر ابلہ نیستی
ہستی اندر نیستی بتواں نمود
مالداراں بر فقیر آرند جود
نیستی و نقص بر جائیکہ خاست
آئینہ خوبی جملہ ہستہا است
چونکہ جامہ چست دوزیدہ بود
مظہر فرہنگ درزی چوں شود
نا تراشیدہ ہمی باید جذوع
تا در دگر اصل سازد یا فروع
کے شود چوں نیست رنجورؒ و نزار
آں جمال صنعت طب آشکار
نقصہا آئینۂ وصف کمال
وآں حقارت آئینہ عزوجلال
زانکہ ضد را ضد کند پیدا یقین
زانکہ باسرکہ پدید است انگبینؒ

میری غرض اس مضمون کے نقل کرنے سے یہ ہے کہ ناظرین یہ خوب سمجھ جائیں کہ تمام عالم کا یہ نام نہاد وجود سایہ اور عکس سے زائد حقیقت نہیں رکھتا اصل حقیقت اس کی سراسر عدم ہے۔ لہٰذا عالم کا ہر ہر جز اور ہر ہر ذرہ اصل ذات سے عدم ہے فقط اس نورالسموات والارض کی تجلی سے اس آئینہ عدم (یعنی عالم) میں ایک معمولی سی چمک

۱؎ بخار ۲؎ مثنوی مولانا روم دفتر اول: جلد ا صفحہ ۲۸۸

پیدا ہوگئی جس کو وجود حادث کہتے ہیں۔ خدا کی قدرت کا کرشمہ دیکھئے کہ آج وہ آئینۂ عدم اس عکس اور ظل کو حقیقت اور اصل خیال کرتا ہے اور اپنے عدم اصلی کا اس قدر شدومد سے انکار کرتا ہے کہ جس کی کوئی انتہا نہیں۔ اور اپنی اصل فطرت اور مادہ کو ازلی اور قدیم بتلاتا ہے۔ کما قال تعالیٰ:

﴿اَوَلَا یَذْکُرُ الْاِنْسَانُ اَنَّا خَلَقْنٰهُ مِنْ قَبْلُ وَلَمْ یَكُ شَیْئًا﴾ ۱؎

ترجمہ: ”کیا انسان یاد نہیں کرتا کہ ہم نے اسے پیدا کیا حالانکہ وہ پہلے کچھ بھی نہ تھا۔“

سماجی جماعت کو اپنے اس خیال پر بہت اصرار ہے کہ عدم محض سے کوئی شئے پیدا نہیں ہوسکتی۔ لیکن یہ محض ایک تخیل اور توہم ہے جس کا منشاء صرف اس قدر ہے کہ آپ نے نیست سے ہست ہونے کا کبھی مشاہدہ نہیں کیا۔

سماج کا یہ استدلال اگر اس کے نزدیک صحیح ہے تو یہ کہیں گے کہ سماج نے ابتداء عالم میں جوان آدمیوں کا زمین سے دفعۃً پیدا ہونا کب دیکھا ہے۔ اور بغیر کانوں کے سننا اور بغیر آنکھوں کے دیکھنا کب آپ کے مشاہدہ میں آیا ہے۔ پس جس طرح حق تعالیٰ آپ کے نزدیک بغیر آنکھ کے سب کو ٹھیک ٹھیک دیکھتے ہیں اور بغیر کان کے سب کی باتیں سنتے ہیں۔ ٹھیک اسی طرح بدون مادہ اور روح کی اعانت کے وہ عدم محض سے موجود کرتے ہیں اگر عدم محض سے موجود ہونا کبھی آپ کے مشاہدہ میں نہیں آیا تو بغیر آنکھ کے دیکھنا اور بغیر کان کے سننا کب آپ کے مشاہدہ میں آیا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ ہر شئے کی تین حالتیں ہوتی ہیں۔ ابتدائی، درمیانی، انتہائی۔ ہر حالت دوسری حالت سے بالکل جدا اور ممتاز ہے۔ ہر حالت کے احکام علیحدہ اور جداگانہ ہیں۔ ایک کو دوسرے پر قیاس کرنا سخت نادانی ہے۔

۱؎ القرآن: ۱۹/ ۶۷

آپ نے دنیا کی صرف درمیانی حالت کو دیکھا ہے ابتدائی حالت آپ کی نظروں سے غائب ہے اور نہ کوئی درمیانی ابتداء کی حالت کا مشاہدہ کرسکتا ہے ع

پشہ کے داند کہ بستاں از کیست

مچھر یہ کب بتلاسکتا ہے کہ یہ باغ کب سے ہے موسم بہار میں مچھر پیدا ہوتا ہے اور جب ہی ختم ہو جاتا ہے۔

درمیانی حالت میں اگر ایک شئے دوسری شئے سے مل کر بنتی ہے تو اس سے یہ لازم نہیں کہ ابتداء میں بھی تکوین اور تخلیق اسی طرح ہوئی ہو۔

ہر چیز آلات سے بنتی ہے مگر آلات کے لئے آلات نہیں ہوتے ان کو بنانے والے نے بدون آلات ہی کے بنایا ہے۔ اور اگر یہ کہا جائے کہ ہستی اور نیستی ایک دوسرے کی ضد ہے ایک ضد دوسری سے کس طرح ظہور پذیر ہوسکتی ہے؟

تو اس کا جواب یہ ہے کہ جس طرح وہ علیم وقدیر حی سے میت اور لیل سے نہار کو نکال سکتا ہے اسی طرح وہ علیم وقدیر نیست سے ہست بھی کرسکتا ہے۔ قال تعالٰی:

﴿اِنَّ اللّٰهَ فَالِقُ الْحَبِّ وَالنَّوٰى ؕ يُخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَمُخْرِجُ الْمَيِّتِ مِنَ الْحَيِّ ؕ ذٰلِكُمُ اللّٰهُ فَاَنّٰى تُؤْفَكُوْنَ ۝﴾[1]

ترجمہ: ”بے شک اللہ ہی دانہ کو پھاڑ کر درخت نکالنے والا ہے اور وہی زندہ کو مردہ سے اور مردہ کو زندہ سے نکالتا ہے یہی تمہارا خدا ہے۔ پس تم کہاں بہک رہے ہو۔“

﴿فَالِقُ الْاِصْبَاحِ ۚ وَجَعَلَ الَّيْلَ سَكَنًا وَّالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ حُسْبَانًا ؕ ذٰلِكَ تَقْدِيْرُ الْعَزِيْزِ الْعَلِيْمِ ۝﴾[2]

ترجمہ: ”اور وہی صبح کو نکالنے والا ہے اور اسی نے رات کو آرام کیلئے اور

[1] القرآن:۶/۹۶ [2] القرآن:۶/۹۷

شمس کو حساب کے لئے بنایا ہے۔ یہ خدائے غالب اور علیم کا انداز ہے۔"

﴿وَجَعَلْنَا الَّيْلَ وَالنَّهَارَ اٰيَتَيْنِ فَمَحَوْنَآ اٰيَةَ الَّيْلِ وَجَعَلْنَآ اٰيَةَ النَّهَارِ مُبْصِرَةً﴾ [2]

ترجمہ: "لیل ونہار کو ہم نے اپنی قدرت کی دونشانیاں بنائی ہیں۔ رات کی نشانی کو بے نور اور دن کی نشانی کو منور بنایا ہے۔"

﴿وَهُوَ اللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ؕ لَهُ الْحَمْدُ فِي الْاُوْلٰى وَالْاٰخِرَةِ وَلَهُ الْحُكْمُ وَاِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ۝﴾ [2]

ترجمہ: "وہی خدا ہے اس کے سوا کوئی معبود نہیں اسی کے لئے دنیا اور آخرت میں ستائش ہے اور اسی کی حکومت ہے اور مرنے کے بعد تم سب اسی کی طرف لوٹائے جاؤ گے۔"

﴿قُلْ اَرَءَيْتُمْ اِنْ جَعَلَ اللّٰهُ عَلَيْكُمُ الَّيْلَ سَرْمَدًا اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ مَنْ اِلٰهٌ غَيْرُ اللّٰهِ يَاْتِيْكُمْ بِضِيَآءٍ ؕ اَفَلَا تَسْمَعُوْنَ ۝ قُلْ اَرَءَيْتُمْ اِنْ جَعَلَ اللّٰهُ عَلَيْكُمُ النَّهَارَ سَرْمَدًا اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ مَنْ اِلٰهٌ غَيْرُ اللّٰهِ يَاْتِيْكُمْ بِلَيْلٍ تَسْكُنُوْنَ فِيْهِ ؕ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ ۝﴾ [3]

ترجمہ: "اے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم آپ فرمادیجئے کہ بتلاؤ تو سہی کہ اگر خدا قیامت تک کے لئے رات ہی کو باقی رکھے تو اللہ کے سوا کون ہے کہ جو تمہارے لئے روشنی پیدا کر دے پس کیا تم اس حق بات کو سنتے نہیں اور فرمادیجئے کہ بتلاؤ اگر خدا ہمیشہ دن ہی کو باقی رکھے تو خدا کے سوا وہ کون سا معبود ہے جو تمہارے آرام کے لئے رات کو پیدا کر دے پس کیا خدا کی اس کھلی ہوئی نشانی کو تم دیکھتے نہیں۔"

---

[1] القرآن: ۱۷/۱۲ [2] القرآن: ۲۸/۷۰ [3] القرآن: ۲۸/۷۱، ۷۲

﴿ وَاللّٰهُ اَخْرَجَكُمْ مِّنْ بُطُوْنِ اُمَّهٰتِكُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ شَيْئًا وَّجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَالْاَفْئِدَةَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴾ [۱]

ترجمہ: ''اللہ ہی نے تم کو تمہاری ماں کے پیٹ سے نکالا تم اس وقت کچھ بھی نہیں جانتے تھے پھر اللہ تعالیٰ نے تمہارے لئے کان اور آنکھ اور دل بنا دیئے تا کہ تم خدا کی ان نعمتوں کا شکر کرو۔''

﴿ هَلْ اَتٰى عَلَى الْاِنْسَانِ حِيْنٌ مِّنَ الدَّهْرِ لَمْ يَكُنْ شَيْئًا مَّذْكُوْرًا ۝ اِنَّا خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ نُّطْفَةٍ اَمْشَاجٍ ۖ نَّبْتَلِيْهِ فَجَعَلْنٰهُ سَمِيْعًا بَصِيْرًا ۝ ﴾ [۲]

ترجمہ: ''کیا انسان پر ایسا زمانہ آیا ہے کہ اس وقت انسان کوئی شئے نہ تھا۔ پھر ہم نے اس کو عورت اور مرد کے مخلوط نطفہ سے پیدا کیا اور پھر اس کو سننے والا اور دیکھنے والا بنا دیا۔''

خلاصہ یہ کہ انسان میں ابتداءً کوئی علم اور کمال نہ تھا بعد میں حق تعالیٰ نے اس کو صدہا علوم اور کمالات سے نوازا پس جس طرح یہ اوصاف نیستی سے نکل کر ہستی میں قدم رکھتے ہیں۔ اسی طرح ذات انسانی بھی عدم سے نکل کر وجود میں آتی ہے۔

کما قال تعالٰی: ﴿ اَوَلَا يَذْكُرُ الْاِنْسَانُ اَنَّا خَلَقْنٰهُ مِنْ قَبْلُ وَلَمْ يَكُ شَيْئًا ۝ ﴾ [۳]

ترجمہ: ''کیا انسان یاد نہیں کرتا کہ انسان کو ہم نے پیدا کیا اور حالانکہ پہلے کچھ نہ تھا۔''

قال تعالٰی: ﴿ الَّذِيْ جَعَلَ لَكُمْ مِّنَ الشَّجَرِ الْاَخْضَرِ نَارًا فَاِذَآ اَنْتُمْ مِّنْهُ تُوْقِدُوْنَ ۝ ﴾ [۴]

---

[۱] القرآن:۱۶/۷۸ [۲] القرآن:۷۶/۱،۲ [۳] القرآن:۱۹/۶۷ [۴] القرآن:۳۶/۸۰

ترجمہ: ”خدا ہی نے تمہارے لئے سبز درخت سے آگ پیدا کی پس اس سے تم آگ سلگاتے ہو۔“

قال تعالیٰ: ﴿اِنَّا جَعَلْنٰهَا فِتْنَةً لِّلظّٰلِمِيْنَ ۝ اِنَّهَا شَجَرَةٌ تَخْرُجُ فِيْٓ اَصْلِ الْجَحِيْمِ ۝﴾ [1]

ترجمہ: ”بے شک ہم نے اس درخت کو کافروں کی آزمائش کے لئے بنایا ہے وہ جہنم کی جڑ میں نکلتا ہے۔“

سہارن پور کے کمپنی باغ میں بکثرت ایسے درخت موجود ہیں کہ جن کی نشو ونما صرف آگ سے ہوتی ہے۔ پس جو علیم وقدیر ایک ضد سے دوسری ضد کی تربیت کر سکتا ہے ایک ضد کو دوسری ضد سے باقی رکھ سکتا ہے۔ کیا وہ نیست سے ہست نہیں کر سکتا۔ چنانچہ مولانائے روم قدس سرہ السامی فرماتے ہیں ؎

در عدم ہستی برادر چوں بود
ضد اندر ضد چوں مکنوں شود

اے برادر! عدم سے ہستی کیسے ممکن ہے۔ ایک ضد دوسری ضد میں کس طرح مخفی اور پوشیدہ ہو سکتی ہے ؎

یخرج الحی من المیت بداں
کہ عدم آمد امید عابداں

اس سوال کا جواب یہ ہے کہ جس طرح حق تعالیٰ مردہ کو زندہ سے نکالتا ہے اسی طرح نیست سے ہست کرتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ عدم یعنی فناء عابدوں کی انتہائی آرزو ہے ؎

پس خزانہ صنع حق باشد عدم
کہ بر آرد زو عطاہا دمبدم

---

[1] القرآن: ۳۷/۶۳،۶۴

اسی طرح سمجھ کہ صنع خداوندی کا خزانہ عدم اور نیستی ہے کہ اسی پردۂ عدم سے قسم قسم کی عطائیں ظاہر کرتا ہے [2]

مبدع آمد حق و مبدع آں بود
کہ بر آرد فرع بے اصل و سند

وجہ اس کی یہ ہے کہ حق تعالیٰ اس عالم کا مبدع اور مخترع ہے۔

کما قال تعالیٰ: ﴿بَدِيعُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ﴾ [1]

اور مبدع اس کو کہتے ہیں کہ جو بے آلہ اور بے مادہ اور بغیر کسی اصل اور سند کے نیست سے ہست اور نابود سے بود کرتا ہو۔

[2] قطرۂ کو در ہوا شد یا کہ ریخت
از خزینہ قدرت تو کے گریخت

ترجمہ: ”کوئی قطرہ گر جائے اور کوئی کسی ہوا میں اڑ جائے مگر خزانہ قدرت سے کہاں بھاگ سکتا ہے۔“

گر در آید در عدم یا صد عدم
چون بخوانیش او کند از سر قدم

ترجمہ: ”ایک نہیں بلکہ عدم کے سو پردوں میں بھی اگر چلا جائے تو جس وقت تیرے بلانے کا ادنی اشارہ ہوگا اسی وقت سر کے بل حاضر ہوگا۔“

صد ہزاراں ضد ضد رامی کشد
باز شان حکم تو بیروں می کشد

ترجمہ: ”لاکھوں ضدیں اپنی ضد کو مار ڈالتی ہیں۔ لیکن تیرا حکم پھر ان کو باہر کھینچ لاتا ہے۔“

---

[1] القرآن: ۲/ ۱۱۷ [2] مثنوی دفتر پنجم: جلد ۵ صفحہ ۹۱

از عدمہائے سوئے ہستی ہر زماں

ہست یارب کارواں درکارواں

ترجمہ: ''نیستی سے ہستی کی طرف ہر لمحہ اور ہر لحظہ قافلے آ رہے ہیں ہر وقت نئی نئی مخلوق عدم سے وجود میں آتی رہتی ہے۔''

خاصہ ہر شب جملہ افکار و عقول

نیست گردد جملہ در بحر نغول[1]

ترجمہ: ''خاص کر رات کے وقت تمام فکریں اور عقلیں غفلت کے دریائے عمیق میں جا کر نیست و نابود ہو جاتی ہیں۔''

باز وقت صبح آں اللہیاں

برزنند از بحر سر چوں ماہیاں

ترجمہ: ''پھر صبح کے وقت وہی اللہ والے یعنی افکار و عقول پھر دریائے نیستی سے مچھلیوں کی طرح سر باہر نکالتے ہیں۔''[2]

الغرض یہ دعویٰ کرنا کہ کسی شئے کا نیست سے ہست ہونا محال ہے محض استبعاد ہے جس طرح اعراض اور کیفیات کا نیست سے ہست ہونا محض ممکن ہی نہیں بلکہ مشاہدہ سے معلوم ہے۔ اسی طرح جواہر کا بھی عدم محض سے وجود میں آنا بھی ممکن اور واقع ہے۔ اگر جواہر کا عدم سے وجود میں آنا اس وجہ سے محال ہے کہ ایک ضد دوسری ضد سے کیسے نکل سکتی ہے تو یہ وجہ تو اعراض اور کیفیات میں بھی پائی جاتی ہے حالانکہ وہاں عدم محض سے وجود میں آنا سب کے نزدیک مسلم اور مشاہد ہے البتہ مادہ اور روح کو ہم نے عدم سے وجود میں آتے ہوئے مشاہدہ نہیں کیا۔ اور نہ ہماری عقل حق سبحانہ و تعالیٰ کے احداث اور خلق کی کیفیت کا ادراک کر سکتی ہے کہ وہ خداوند عالم کس طرح نیست سے ہست کرتا ہے اور ظاہر ہے کہ ہمارا کسی شئے کے تصور اور ادراک سے عاجز

---

[1] عمیق [2] مثنوی دفتر اول: صفحہ ۱۶۷

رہنا اس کے محال ہونے کی دلیل نہیں ہوسکتی۔ طبعیات اور فلکیات کے بڑے بڑے ماہر اور محقق گزر گئے جن چیزوں کی حقیقت پر انہوں نے کلام کیا وہ ان چیزوں کے مقابلہ میں جن پر کوئی کلام نہیں کیا اتنی حقیقت اور نسبت بھی نہیں رکھتیں جو ایک قطرہ کو دریا کے ساتھ ہو۔ پھر جن چیزوں پر کلام کیا وہ بھی یقینی نہیں۔ ہر جگہ بیسیوں اشکال اور احتمال ساتھ لگے ہوئے ہیں۔

عالم کے عدم محض سے پیدا ہونے پر علامہ احمد بن مسکویہ رحمہ اللہ تعالیٰ کا استدلال

علامہ احمد بن مسکویہ رحمہ اللہ تعالیٰ الفوز الاصغر فصل عاشر صفحہ ۳۰ میں لکھتے ہیں۔

''جو لوگ نظر اور فکر کے عادی نہیں اور ان ہی محسوسات کے دائرہ میں محدود ہیں وہ یہ خیال کرتے ہیں کہ جس طرح ایک معمار بغیر اینٹ اور گارے کے کوئی مکان نہیں بنا سکتا اور کوئی نجار (بڑھئی) بغیر لکڑی اور تختوں کے کوئی تخت نہیں بنا سکتا اور ہر صانع اپنی صنعت میں مادہ کا محتاج ہے۔ اسی طرح ''عیاذا باللہ'' خدا تعالیٰ بھی اپنی ایجاد میں مادہ کا محتاج ہے اور اس خیال کو اس قدر ترقی ہوئی کہ جالینوس بھی اسی کا قائل ہو گیا مگر حکیم اسکندر نے اس کے رد میں ایک مستقل کتاب لکھی جس میں یہ ثابت کیا کہ تمام کائنات کسی چیز سے پیدا نہیں ہوئیں بلکہ عدم محض سے وجود میں آئی ہیں۔ ہم چاہتے ہیں کہ اس مضمون کو مختصر اور واضح طریق سے بیان کریں۔

یہ امر سب کے نزدیک مسلم ہے کہ جب مادہ کوئی جدید صورت اختیار کرتا ہے تو پہلی صورت بالکل معدوم ہو جاتی ہے اس لئے کہ اگر بالفرض پہلی صورت معدوم نہ ہو تو صرف دو احتمال ہیں۔

ایک یہ کہ پہلی صورت جسم سے علیحدہ ہونے کے بعد کسی دوسرے جسم کو لاحق ہو جائے لیکن یہ سراسر مشاہدہ کے خلاف ہے۔ خمیر یا موم کو ہم جب کسی دوسری شکل میں

تبدیل کردیتے ہیں تو پہلی شکل قطعاً کسی جسم کو جا کر نہیں لگ جاتی۔

دوسرا احتمال یہ ہے کہ اس جسم میں جدید صورت کے ساتھ پہلی صورت اور پہلی شکل بھی باقی رہے سو یہ احتمال اس لئے باطل ہے کہ اس میں اجتماع ضدین لازم آتا ہے مثلاً فرض کیجئے کہ پہلی صورت مستدیر تھی اور دوسری مستطیل۔ پس یہ کیسے ممکن ہے کہ ایک شئے ایک ہی حالت میں مستطیل بھی ہو اور مستدیر بھی، مسطح بھی ہو اور مدور بھی۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ ایک جسم میں متضاد شکلیں جمع ہوسکیں۔

غرض یہ کہ آپ کو طوعاً وکرہاً یہ تسلیم کرنا ہوگا کہ پہلی صورت بالکل معدوم ہوگئی اور اس جدید صورت نے یقیناً عدم محض سے نکل کر عالم وجود میں قدم رکھا ہے۔

اس تقریر سے تمام صورتوں اور شکلوں اور تمام کیفیات اور اعراض کا حادث ہونا اور ان کا عدم محض سے وجود میں آنا بخوبی ثابت ہوگیا۔ رہا مادہ سو وہ کسی حالت میں بھی صورت سے خالی ہو کر موجود نہیں ہوسکتا۔ مادہ جس حالت میں بھی ہوگا کوئی نہ کوئی صورت اس کے لئے ضرور ہوگی۔ خلاصہ یہ کہ مادہ اور صورت دونوں متلازم ہیں۔

پس جب یہ ثابت ہوگیا کہ صورت حادث ہے اور عدم محض سے وجود میں آتی ہے اور ساتھ ہی ساتھ یہ ثابت ہو چکا کہ مادہ کسی حالت میں بھی صورت سے علیحدہ ہو کر موجود نہیں ہوسکتا۔ پس ضرور ہے کہ مادہ بھی ضرور صورت کی طرح حادث ہو اور عدم محض سے وجود میں آیا ہو۔ ورنہ اگر مادہ قدیم ہو تو صورت کا بھی قدیم ہونا لازم آئے گا اس لئے کہ ملزوم (مادہ) کا قدیم ہونا لازم (صورت) کے قدیم ہونے کو مستلزم ہے۔ مثلاً چار میں اور زوجیت میں تلازم ہے پانچ میں اور فردیت میں لزوم ہے۔ جب سے زوجیت ہے اسی وقت سے چار بھی ہیں یہ ناممکن ہے کہ چار ہوں اور زوجیت نہ ہو۔ پانچ ہوں اور فردیت نہ ہو۔ علی ہذا یہ بھی ناممکن ہے کہ زوجیت ہو مگر چار یا چار کے ہم معنی (یعنی برابر کے دو حصوں پر منقسم ہونے والا) کوئی عدد نہ ہو۔ یا مثلاً آفتاب ہوگا تو دن ضرور ہوگا آفتاب کا بغیر دن کے اور دن کا بغیر آفتاب کے پایا

جانا محال ہے۔

اسی طرح یہ بھی ناممکن ہے کہ مادہ ہو اور اس کو کوئی صورت اور کسی قسم کی شکل لاحق نہ ہو یا صورت ہو مگر مادہ نہ ہو۔ غرض یہ کہ دونوں متلازم ہیں۔ اور متلازمین کے لئے یہ ضروری ہے کہ دونوں کا وجود ایک ہی وقت سے شروع ہو، ٹھیک اسی طرح مادہ کا وجود بھی اسی وقت سے ہونا چاہئے جس وقت سے کہ صورت کا وجود ہے اور صورت کا وجود ظاہر ہے کہ ازلی اور قدیم نہیں۔ پس مادہ کا وجود کہاں سے ازلی اور قدیم ہو سکتا ہے۔ ضروری ہے کہ وہ بھی صورت کی طرح عدم محض سے وجود میں آیا ہو اس لئے کہ مادہ بسیط ہے اس سے پہلے کوئی اور شئے نہ تھی کہ جس کی نسبت یہ کہا جائے کہ یہ مادہ اس سے پیدا ہوا کیونکہ اس صورت میں مادہ کے لئے مادہ ہونا لازم آتا ہے۔ نیز یہ ناممکن ہے کہ قدیم اپنے وجود میں حادث کا محتاج ہو۔ پس اگر مادہ باجود قدیم ہونے کے صورت حادثہ کا محتاج ہو تو اس کا یہ مطلب ہوگا کہ قدیم حادث کا محتاج ہے۔

۲ بلکہ ہر شئے اپنے عدم ہی سے وجود میں آتی ہے جو کچھ بھی ظاہر ہوتا ہے وہ اپنی ضد ہی سے نکل کر ظاہر ہوتا ہے۔

حیوان غیر حیوان یعنی منی سے اور منی غیر منی یعنی دم سے اور دم غیر دم یعنی غذا سے اور غذا غیر غذا یعنی نباتات سے اور نباتات غیر نباتات یعنی عناصر اربعہ سے پیدا ہوتے ہیں بغیر صورت دموی کے فنا ہوئے، صورت حیوانی کا پیدا ہونا محال ہے۔ علی ہذا صورت غذائی اور صورت نباتاتی کا بغیر صورت عنصری کے فنا ہوئے پیدا ہونا محال ہے۔ غرض یہ کہ ہر وجود عدم کو مقتضی ہے۔

پس جس طرح ہر دور میں وجود سے پہلے ایک عدم ہے ٹھیک اسی طرح بسائط اور ذرات کے دور میں بھی وجود سے پہلے ایک بسیط عدم ہونا چاہئے کہ جس سے بسائط اور ذرات نمودار ہوئے ہوں۔

۳ نیز ایجاد عدم ہی سے ہوا کرتی ہے دو موجود چیزوں کے ملا دینے کا نام ایجاد نہیں

اس کو ترکیب کہتے ہیں۔ ایجاد کے معنی وجود عطا کرنے کے ہیں اور ظاہر ہے کہ وجود معدوم ہی کو عطا کیا جاتا ہے موجود چیز کو وجود عطا کرنا تحصیل حاصل ہے۔ معلوم ہوا کہ ایجاد اسی کو کہتے ہیں کہ نیست کو ہست کیا جائے ہست کو ہست کرنا بداہۃً محال ہے اور ہست کو ہست کے ساتھ ملانے اور ربط دینے کا نام ترکیب اور تصویر ہے۔ لہٰذا حکیم جالینوس اور دیگر مادیین کا یہ کہنا کہ ہر موجود کسی موجود ہی سے پیدا ہوتا ہے سراسر غلط ہے۔ اگر ہر موجود کسی موجود ہی سے پیدا ہوتا ہے تو اللہ تعالیٰ کی صفت ابداع کے کوئی معنی نہ ہوں گے کیونکہ ابداع کے معنی ایجاد الشیء لا من شیء یعنی نیست سے ہست کرنے کے ہیں۔"[1]

عارف رومی فرماتے ہیں ؎

ہست مطلق کار ساز نیستی ست
کارگاہ ہست کن جز نیست چیست

ترجمہ: "ہست مطلق (یعنی واجب الوجود) کہ ایجاد ہمیشہ معدوم ہی سے متعلق ہوتی ہے تخلیق اور تکوین کا کارخانہ سوائے نیستی اور عدم محض کے اور کیا ہے۔"

برنوشتہ ہیچ بنویسد کسے
یا نہالے کارد اندر مغرسے

ترجمہ: "لکھے ہوئے کاغذ پر کون لکھتا ہے اور بوئی ہوئی زمین میں کون تخم ڈالتا ہے۔"

کاغذے جوید کہ آں بنوشتہ نیست
تخم کارد موضعے کہ کشتہ نیست

ترجمہ: "لکھنے کے لئے ایسا ہی کاغذ تلاش کیا جاتا ہے جس پر کچھ لکھا

---

[1] الفوز الاصغر: صفحہ ۳۰

ہوا نہ ہو اور کاشت کے لئے وہی زمین دیکھی جاتی ہے کہ جس میں کچھ بویا نہ گیا ہو۔"[1]

جملہ استاداں پئے اظہار کار
نیستی جویند و جائے انکسار

ترجمہ: "ماہرین فن کمال ظاہر کرنے کے لئے نیستی اور عدم ہی کو تلاش کرتے ہیں کہ جس جگہ وہ کمال نہ ہو وہاں اپنا کمال دکھلائیں۔"

لاجرم استاد استاداں صمد
کار گاہش نیستی ولا بود

ترجمہ: "اسی طرح اس خداوند بے نیاز کی کارگاہ تکوین اور کارخانۂ تخلیق بھی نیستی اور عدم ہی ہوگا۔"

ہر کجا ایں نیستی افزوں تراست
کار حق او کار گاہش آں سرست

ترجمہ: "جس جگہ عدم اور نیستی (یعنی فنا) جس قدر زیادہ ہوگی اسی قدر صنع خداوندی اور فیضان ربانی (یعنی انوار وتجلیات) بھی زیادہ ہوگا۔"[2]

ایں جہاں از بے جہت پیدا شدہ
کہ زبیجائی جہاں را جاشدہ
باز گرد از ہست سوئے نیستی
گر تو از جاں طالب مولیتی
جائے دخل است ایں عدم از وے مرم
جائے خرج است ایں وجود بیش و کم

---

[1] مثنوی: صفحہ ۱۶۸، دفتر پنجم [2] مثنوی دفتر ششم: جلد ۶ صفحہ ۱۲۹

زانکہ کان و مخزن صنع خدا
نیست غیر نیستی در الجلا

عالم کو اگر نیست سے ہست نہ مانا جائے اور یہ کہا جائے کہ عالم مادہ سے بنا ہے تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ خدا تعالیٰ اپنی تکوین و تخلیق میں مادہ کا محتاج ہے۔ تکوین عالم کے لئے اس کا ارادہ کافی نہیں ورنہ اگر اس کا ارادہ کافی ہے تو پھر مادہ کا وجود محض فالتو اور بے کار ہے۔

حدوث عالم پر دوبارہ نظر

الحاد پسند طبیعتوں نے جو بہتر سے بہتر اور قوی سے قوی حجت قدم عالم کے لئے اختراع کی ہے وہ یہ ہے کہ اگر عالم کو حادث مان لیا جائے تو آفرینش عالم سے پہلے خدا کی شان تخلیق اور تکوین کا معطل اور بے کار ہونا لازم آتا ہے۔

جواب

حقیقت یہ ہے کہ کسی صفت کا وجود اس کے اظہار پر موقوف نہیں مثلاً کاتب اور شاعر جس حالت میں کتابت سے فارغ ہے اس حالت میں بھی وہ کاتب اور شاعر ہے۔ تلوار جس وقت نیام میں ہے اس وقت بھی قاتل ہے۔ سنکھیہ جس وقت شیشی میں ہے اس وقت بھی مہلک ہے لیکن اس قتل اور ہلاک کا ظہور تلوار کے چلانے اور سنکھیہ کے استعمال پر موقوف ہے۔

کیا تلوار اسی وقت تک قاطع کہلائے گی جس وقت تک وہ گردن پر چل رہی ہے اور جب اس کا تعلق گردن سے منقطع ہو جائے تو کیا وہ وصف قطع کے ساتھ موصوف نہ رہے گی کیا کوئی خوشنویس اور اعجاز رقم اسی وقت تک کاتب کہلائے گا جب تک قلم ہاتھ میں لے کر لکھ رہا ہے اور جب قلم اور کاغذ سے اس کا تعلق منقطع ہوا تو وصف کتابت سے بھی محروم ہو گیا۔

کیا کوئی مقرر اور خوش بیان اسی وقت تک حسن تقریر اور خوش بیانی کے ساتھ موصوف ہے جب تک وہ کسی جلسہ میں کھڑا ہوا تقریر کر رہا ہے اور جب جلسہ ختم ہو گیا تو وصف تقریر بھی ختم ہو گیا۔ ہر گز نہیں بلکہ وہ مقرر جس وقت رات کو سو جاتا ہے اور اس کے تمام حواس معطل اور بے کار ہو جاتے ہیں اس وقت بھی وہ وصف تقریر ہی کے ساتھ موصوف رہتا ہے۔ یہی کہتے ہیں کہ فلاں مقرر سو رہا ہے۔

اور کیا معلم اور استاد اسی وقت تک معلم ہے جب تک سبق پڑھاتا ہے سبق ختم ہونے کے بعد وہ معلم نہیں رہا۔

اور کیا حاکم اسی وقت تک حاکم ہے کہ جس وقت تک اس کا قلم فیصلہ لکھ رہا ہے کچہری برخواست ہونے کے بعد وہ حاکم نہیں رہتا۔

پس جب کہ ایک مخلوق، صفت کا تعلق منقطع ہو جانے سے اس صفت سے معرا اور خالی نہیں ہو جاتی تو باری تعالیٰ کی صفات اگر مخلوق سے متعلق نہ ہوں تو کیا باری تعالیٰ صفات کے متعلق نہ ہونے سے صفت خالقیت وغیرہ سے معطل اور بے کار ہو جائے گا۔ معاذ اللہ اگر خدا تعالیٰ کا خالق ہونا مخلوقات کے موجود ہونے پر موقوف ہو تو پھر اس کا علیم وخبیر ہونا بھی مخلوقات کے موجود ہونے پر موقوف ہوگا اور اس کا سمیع و بصیر ہونا مسموعات اور مبصرات کے موجود ہونے پر موقوف ہوگا اور اس کا معبود ہونا عباد یعنی بندوں کے موجود ہونے پر موقوف ہوگا۔

اور لیجئے آگ محرق ہے۔ احراق اس کی ایک صفت ہے لیکن ظہور اس صفت کا جب ہوگا کہ جب آگ کسی شئے سے لگے۔ اسی طرح صفت خالقیت کو سمجھئے کہ وہ ذات ہمیشہ سے خالق ہے لیکن صفت خالقیت کا ظہور جب ہوگا کہ صفت تکوین اور تخلیق کسی شئے کے ساتھ متعلق ہو اس لئے فقط یہ ظہور اور یہ تعلق حادث ہوگا اور جو شئے اس صفت کے متعلق ہونے سے ظہور اور وجود میں آئے گی وہ بھی حادث ہوگی لیکن اصل صفت قدیم ہوگی۔ غرض یہ کہ اتصاف اور شئے ہے اور ظہور اور شئے ہے۔ عدم ظہور

سے عدم اتصاف لازم نہیں آتا اسی طرح عدم ظہور خالقیت سے خدا کو غیر خالق سمجھ لینا سخت نادانی ہے۔ مزید توضیح کے لئے ایک مثال سمجھئے وہ یہ کہ نور اور شعاع آفتاب کے لئے لازم اور غیر منفک ہیں۔ اس لئے کہ آفتاب کی ذات، انوار اور شعاعوں کے لئے منبع اور سرچشمہ ہے۔

لیکن اگر ایک طرف نور اور شعاع کا تعلق آفتاب کے ساتھ ہے تو دوسری طرف زمین کے ساتھ بھی ہے لیکن آفتاب کے ساتھ دائمی ہے اور کسی وقت نور اور شعاع آفتاب سے منفک نہیں ہوتے۔

اور زمین کے ساتھ تعلق حادث ہے اسی وجہ سے زمین کبھی روشن ہوتی ہے اور کبھی نہیں نور آفتاب زمین کے لئے ایسا ہے جیسا انسان کے لئے سایہ اور عکس اور وہ کوئی لازمی اور دائمی شئے نہیں۔ یقیناً ایک حادث اور فانی شئے ہے۔ اسی طرح صفت تکوین اور تخلیق، ترزیق اور احیاء اور اماتت کا تعلق ایک حق جل وعلی سے ہے اور یہ تعلق دائمی اور لازم ہے اس میں کبھی تغیر نہیں آسکتا۔ وہ ہر حال میں ان صفات کمال کے ساتھ موصوف ہے دوسرا تعلق ممکنات اور حادثات کے ساتھ اور وہ حادث ہے مثلاً آج کسی کے ساتھ صفت احیاء کا تعلق ہوگیا تو وہ زندہ ہوگیا اور چند روز کے بعد صفت اماتت کا تعلق ہوگیا تو وہ مرگیا۔ غرض یہ کہ یہ تعلق حادث ہے اور اسی وجہ سے ممکنات میں تغیر اور تبدل ہوتا رہتا ہے کبھی کوئی غنی ہے اور کوئی مفلس کوئی حاکم اور کوئی محکوم۔ اس تغیر سے ذات باری تعالیٰ عزاسمہ میں کوئی تغیر لازم نہیں آتا۔

اگر آفتاب کی شعاعوں اور کرنوں کا تعلق در و دیوار کے ساتھ نہ ہو تو اس سے آفتاب کی ذات یا صفات میں کیا نقصان۔

اسی طرح اگر اس ذات احدیت کی شان تکوین اور تخلیق اور صفت مالکیت کا کسی کے ساتھ بھی تعلق نہ ہو تو وہ خالق اور مالک ہے۔ اس کا خالق اور مالک ہونا عالم کے پیدا ہونے پر کسی طرح موقوف نہیں اور جس طرح وہ آفرینش عالم سے پہلے مالک تھا

اسی طرح وہ عالم فنا ہونے کے بعد مالک رہے گا۔

﴿لِمَنِ الْمُلْكُ الْيَوْمَ لِلّٰهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ.﴾ [۱]

تَرجَمۃ: ”کس کا راج ہے اُس دن اللہ کا ہے جو اکیلا ہے دباؤ والا ہے۔“

خلاصہ

یہ کہ صفات قدیم ہیں اور تعلقات اور متعلقات سب حادث ہیں ”کُلَّ یَوْمٍ هُوَ فِیْ شَاْنٍ“ چنانچہ بھومکا کے صفحہ ۱۷ پر ہے۔

”پیدائش عالم سے پہلے خدا اس پیدا شدہ عالم کا ایک بے عدیل مالک تھا۔“ اور ستیارتھ پرکاش کے صفحہ ۲۱۴ پر ہے۔

”تمام مخلوقات کا ایک ہی مالک اعلیٰ تھا جو سب جگت موجود ہونے سے پہلے موجود تھا۔“ ان دونوں عبارتوں سے صاف ظاہر ہے کہ خدا پیدائش سے پہلے ہی خالق اور مالک تھا۔ پیدائش بعد میں ہوئی اس کا خالق اور مالک ہونا اس پر موقوف نہیں کہ عالم ہمیشہ سے اس کے ساتھ ازلی اور قدیم ہو اور اگر خدا کا خالق اور مالک ہونا مادہ اور روح کے قدیم ہونے پر موقوف ہو تو خدا اپنے موصوف ہونے میں دوسروں کا محتاج ہوگا جو اس کے موصوف بالذات ہونے کے سراسر خلاف ہے اس لئے کہ موصوف بالذات اس کو کہتے ہیں کہ جو اپنے اتصاف میں کسی کا محتاج نہ ہو۔

پس اگر خدا تعالیٰ کا متصف بصفات کمالیہ ہونا عالم کے قدیم ہونے پر موقوف ہو تو اس کے یہ معنی ہوں گے کہ اگر بالفرض عالم نہ ہوتا تو خدا تعالیٰ کسی صفت کمال کے ساتھ موصوف نہ ہوتا یا بالفاظ دیگر یوں کہو کہ خدا، خدا ہی نہ رہتا۔

بہرحال صفات کے لئے مظہر کی حاجت نہیں۔ آخر پرلے کا زمانہ جس وقت کہ سب کائنات نیست و نابود ہو جاتی ہے اس وقت صفات الٰہیہ کا کوئی مظہر باقی نہیں

---

[۱] القرآن ۴۰/۱۶

رہتا۔ پس اگر معاذ اللہ حدوث عالم کے ماننے سے آفرینش عالم سے پہلے صفت تکوین وتخلیق کا معطل ہونا لازم آتا ہے۔ تو یہی اشکال بعینہ پرلے کے وقت پر بھی لازم آتا ہے۔ "فما هو جوابكم فهو جوابنا"

پادری مول اپنی کتاب کے صفحہ ۱۳ پر لکھتا ہے۔

❶ مقدس نوشتوں کی یہ تعلیم ہے کہ مادہ یا روح کی اصل خواہ کچھ بھی ہو لیکن مادی اور روحانی جہان خدا کی ہستی اور ازلی اور خودمختاری کے شرائط نہیں بلکہ اس کے نتیجہ ہیں۔ الخ۔

❷ علاوہ ازیں اگر صفت کے قدیم ہونے سے متعلق کا قدیم ہونا ضروری ہے تو پھر عالم کی ہر ہر چیز قدیم اور ازلی ہونی چاہئے اس لئے کہ صفت خالقیت اور مالکیت کا تعلق صرف ایک دوشی سے نہیں ہر ہر فرد ہر ہر ذرہ کے ساتھ ہے علی ہذا موت اور حیات اور رزق وغیرہ بھی ازلی ہونی چاہئیں۔ غرض یہ کہ اس بناء پر کوئی شئے قدیم اور ازلیۃ سے باہر نہیں ہوسکتی۔ "وهو ظاهر البطلان"

❸ نیز صفت خالقیت کا ظہور تو عالم کے مخلوق ہونے سے ہوگا یہ عجب طرح کی منطق ہے کہ صفت خالقیت کا ظہور مادہ اور روح کے غیر مخلوق اور ازلی ہونے سے ہو صفت احیاء کا ظہور حیات کے ذریعہ سے ہونا چاہئے نہ کہ عدم حیات اور موت کے ذریعہ سے، صفت اماتت کا ظہور موت کے ذریعہ ہونا چاہئے نہ کہ عدم موت کے ذریعہ سے، ٹھیک اسی طرح شان خالقیت کا ظہور مخلوق اور حادث ہونے کے ذریعہ سے ہونا چاہئے نہ کہ قدیم اور ازلی ہونے سے۔

کوئی شئے قدیم اور ازلی ہو کر خدا کی مخلوق اور محکوم کیسے ہوسکتی ہے۔ خالق کا مخلوق سے مقدم ہونا ضروری ہے اور جو شئے متاخر ہو وہ کبھی ازلی نہیں ہوسکتی۔ خلاصہ یہ کہ اس صورت میں ان کا مدعا اظہار خالقیت حاصل نہیں ہوسکتا۔

❹ نیز یہ امر خلاف حکمت ہے کہ بعض صفات الٰہیہ کا اظہار ہو اور بعض کا نہ ہو شان سمیعی اور بصیری کے اظہار کے لئے انسان کو سمع و بصر عطا فرمائی۔ اور شان علیمی اور

خبیری کے ایک ذاتی تجلی نے انسان کو صاحب علم وخبر بنادیا۔ مؤمنین مخلصین کو صفت رحم وکرم کا، عصاۃ مؤمنین کو صفت عفو ومغفرت کا، کافروں کو شان قہر وانتقام کا مورد اور تجلی گاہ بنایا۔

پس ضرور تھا کہ جس طرح شان سمیعی اور بصیری اور علیمی اور خبیری کا اظہار فرمایا اسی طرح شان احدیت وصمدیت، غنا، توحید، یہ تمام صفات اور شئون معرض ظہور میں آئیں اور شان احدیت کا اظہار صرف اسی طرح ہوسکتا ہے کہ صرف وہی ایک ذات موجود ہو اور باقی تمام کائنات پردہ عدم میں مستور ہوں۔ پھر جب قدرت اور ارادہ ان کے متعلق ہو اس وقت یہ تمام معدومات پردۂ عدم سے نکل کر "شان کن فیکون" کے اظہار کیلئے معرض وجود میں آئیں۔ اور شان صمدیت اور استغناء کا ظہور صرف اس طرح ہوسکتا ہے کہ وہ علیم وقدیر اور غنی مطلق اپنی ایجاد اپنی تخلیق اپنی تکوین میں کسی قسم کی اعانت اور امداد کا محتاج نہ ہو۔ محض اپنی قدرت اور ارادہ سے نیست کو ہست اور نابود کو بود کرتا ہو۔ لوہار اور بڑھئی کی طرح اپنی تخلیق اور تکوین میں مادہ اور روح کا محتاج نہ ہو۔

❺ نیز یہ امر بھی قابل غور ہے کہ ایجاد تکوین اور ترکیب کے مفہوم میں کیا فرق ہے ایجاد اور تکوین کے معنی صرف یہ ہیں کہ کسی معدوم کو پردہ عدم سے نکال کر مسند وجود پر بٹھلا دیا جائے اور ترکیب کے معنی صرف یہ ہیں کہ دو چیزوں کو آپس میں ملا دیا جائے پس صفت ایجاد اور شان تکوینی کا ظہور صرف اسی صورت میں ممکن ہے کہ معدوم کو موجود اور نیست کو ہست کیا جائے۔ مادہ اور روح کے ملانے سے صرف شان ترکیب اور تصویر ظاہر ہوسکتی ہے۔ صفت ایجاد اور شان تکوینی کا ظہور نہیں ہوسکتا۔ اور خدا تعالیٰ فقط مصور ہی نہیں۔ بلکہ وہ خالق اور باری بھی ہے۔ ﴿هُوَ اللّٰهُ الْخَالِقُ الْبَارِئُ الْمُصَوِّرُ﴾[1] ترجمہ: (وہ اللہ ہے بنانے والا نکال کھڑا کرنے والا)۔

---

[1] القرآن ۲۴/۵۹

❻ نیز یہ شان اولیت کا اظہار بھی صرف اسی طرح ہوسکتا ہے کہ صرف ابتداء میں وہی ایک ذات احد ہو اور کوئی نہ ہو ﴿هُوَ الْاَوَّلُ وَالْاٰخِرُ وَالظَّاهِرُ وَالْبَاطِنُ﴾ [۱]

تَرْجَمَہ: (وہی ہے سب سے پہلا اور سب سے پچھلا اور باہر اور اندر)۔

عالم کو اگر حادث اور فانی نہ مانا جائے تو خدا کی شان اولیت کا ظہور نہیں ہوسکتا عجیب بات ہے کہ خدا تعالیٰ کو خالق بھی مانتے ہیں اور پھر اس کی خدائی اور خالقیت ثابت کرنے کے لئے اس کے پیدا کئے ہوئے عالم کو اس کے ہم پلہ اور ہم رتبہ یعنی قدیم بھی مانتے ہیں ؎

نیستی باید کہ آں از حق بود
تا کہ بیند اندراں حسن احد [۲]

❼ نیز شان احاطہ کا ظہور صرف اسی طرح ہوسکتا ہے کہ یہ تمام سلسلہ اس کے احاطہ میں ہو، اس کے احاطہ سے باہر نہ ہو۔ اور احاطہ میں آجانے کے بعد پھر اس شئے کو غیر متناہی اور غیر محدود ماننا سراسر خلاف عقل ہے۔

قال تعالیٰ: ﴿اَلَا اِنَّهٗ بِكُلِّ شَیْءٍ مُّحِیْطٌ﴾ [۳]

تَرْجَمَہ: ”آگاہ ہوجاؤ کہ حق تعالیٰ بے شک سب کو محیط ہے۔“

اور ستیارتھ پرکاش کے صفحہ ۱۹۴ باب ۷ سوال زیر عنوان، پرمیشور کے محیط کل ہونے کے دلائل۔ اور ستیارتھ پرکاش کے صفحہ ۲۰۷ باب ۷، ۴۴ سوال کا جواب (اور وہ بوجہ محیط کل ہونے کے) اور بھومکا کے صفحہ ۵۳ پر ہے (اس سے پہلے محیط کل پرمیشور تھا) اور ستیارتھ کے صفحہ ۴۴۶ باب ۱۲ نمبر ۶۰ پر ہے (جو محیط کل ہے) اور ستیارتھ کے صفحہ ۴۴۴ باب ۱۲ نمبر ۵۳ پر ہے (ایشور محیط اور بے لوث ہے) اور دوسری سطر میں ہے (کہ جو احاطہ میں ہے وہ محدود اور محاط ہے)۔

لہٰذا جب وہ محیط کل تمام عالم کو محیط ہے تو لامحالہ عالم محدود ہوگا۔ غیر محدود اور غیر

---

[۱] القرآن ۵۷/۳ [۲] مثنوی دفتر ششم: جلد ۶ صفحہ ۲۵ [۳] القرآن: ۴۱/۵۴

متناہی نہ ہوگا۔ پس خدا کو محیط ماننے کے بعد سلسلہ عالم کو غیر محدود اور غیر محصور ماننا کھلا ہوا تناقض اور صریح اختلاف ہے۔

❽ نیز ستیارتھ پرکاش کے صفحہ ۲۰۹ باب ۷ سوال ۵۰ کے جواب میں ہے۔ پرمیشور اپنے کاموں میں خودمختار ہے۔

اور اسی صفحہ کے ۵۱ سوال کے جواب میں ہے۔

دنیا کو قائم رکھنا اور فنا کرنا اور سب کو انتظام میں رکھنا پرمیشور کے افعال ہیں۔ اور ستیارتھ پرکاش کے صفحہ ۴۴۶ باب ۱۲ نمبر ۵۹ سے ۶۲ تک خدا کے فاعل مختار ہونے کا مفصل تذکرہ ہے اھ۔

اور ستیارتھ صفحہ ۲۰۳ باب ۷ پر ہے۔

سؤال (۳۶): پرمیشور کا کان، آنکھ وغیرہ حواس نہیں تو پھر وہ حواس کے کام کس طرح کرسکتا ہے۔

جواب: یہ اپنشد کا قول ہے۔ پرمیشور کے ہاتھ نہیں لیکن اپنی طاقت کے ہاتھ سے سب کو بناتا اور قابو میں رکھتا ہے۔

پاؤں نہیں لیکن محیط ہونے کے باعث سب سے زیادہ صاحب رفتار حرکت دینے والا ہے۔ آنکھ کا آلہ نہیں لیکن سب کو ٹھیک ٹھیک دیکھتا ہے۔ کان نہیں لیکن سب کی باتیں سنتا ہے۔ حواس باطنی نہیں مگر تمام دنیا کو جانتا ہے۔ وہ حواس کے بغیر اپنے سب کام اپنی طاقت سے کرتا ہے اھ۔

اور ستیارتھ پرکاش صفحہ ۲۰۴ پر ۳۸ سوال کے جواب میں ہے۔ جتنے مکان اور زمانہ میں فعل کرنا مناسب سمجھتا ہے اتنے ہی مکان اور زمان میں فعل کرتا ہے اس سے نہ زیادہ نہ کم۔ کیونکہ وہ علیم ہے اھ۔

عبارات بالا سے یہ امر بخوبی ثابت ہوگیا کہ عالم کا پیدا کرنا اور فنا کرنا حق تعالیٰ کا ایک اختیاری فعل ہے اور فعل خواہ کسی قسم کا ہو کسی طرح قدیم نہیں ہوسکتا اس لئے

کہ فعل ایک خاص حرکت کا نام ہے کہ جو خاص وقت اور خاص مکان میں ہو۔ اور حرکت کے مفہوم ہی میں تجدد اور حدوث اور مسبوق بالغیر ہونا داخل ہے۔

نیز حرکت محرک سے موخر ہوتی ہے اور تمام حرکات کا سلسلہ محرک پر منتہی اور مختتم ہونا ضروری ہے۔ نیز فاعل مختار کا فعل ارادہ کے بعد ہوتا ہے اور جو شئے کسی کے بعد ہو وہی حادث ہے پس خدا کا یہ فعل یعنی مادہ اور روح میں ترکیب اور ترتیب کس طرح قدیم اور ازلی ہوسکتا ہے۔ لامحالہ یہ تمام سلسلہ اس کے ارادہ پر ختم ہو جائے گا۔ "(اِنَّ رَبَّکَ) فَعَّالٌ لِّمَا یُرِیْدُ"

۹ نیز اگر کوئی شئے نیست سے ہست نہیں ہوسکتی تو اس کے یہ معنی ہوں گے کہ بالفرض اگر مادہ اور روح نہ ہوتا تو معاذ اللہ خدا تعالیٰ بالکل معطل اور بے کار ہوتا اور عالم کی کسی شئے کو نہ پیدا کر سکتا۔

۱۰ نیز یہ کہ خدا تعالیٰ نے مادہ اور روح کے سوا کسی اور شئے کو پیدا کیا یا نہیں۔ اگر یہ کہا جائے کہ نہیں پیدا کیا تو سوال یہ ہے کہ پھر خدا نے کیا کام کیا۔ اور اگر مادہ اور روح کے سوا اور کائنات کو بھی پیدا کیا۔ تو پھر ان کو کس طرح نیست سے ہست کیا۔

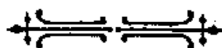
پس جو خدا عالم کی غیر محدود اور بے شمار کائنات کو نیست سے ہست کرتا ہے وہ بلا شبہ مادہ اور روح کو بھی نیست سے ہست کر سکتا ہے۔ پھر یہ کہ جب خدا نے مادہ اور روح کو نیست سے ہست نہیں کیا تو پھر وہ مادہ اور روح کا خالق نہ ہوگا اور جب خالق نہ رہے گا تو مادہ اور روح کا مالک بھی نہ رہے گا۔ کیونکہ خدا تعالیٰ کی ملکیت کے یہی معنی ہیں کہ وہ اشیاء کا خالق ہو۔

ظاہر ہے کہ خدا تعالیٰ کی ملکیت بیع وشراء ہبہ اور وراثت کے ذریعہ سے نہیں ہوتی لہٰذا اس صورت میں خدا تعالیٰ خالق الکل اور مالک الکل نہ رہے گا بلکہ خالق الجز اور مالک الجزء ہوگا۔ اور جب مادہ اور روح کا مالک نہ ہوگا تو مستحق عبادت اور طاعت بھی نہ ہوگا۔ اور عیاذاً باللہ مادہ اور روح پر خدا تعالیٰ کا قبضہ اور تسلط غاصبانہ اور ظالمانہ سمجھا

جائے گا۔

بحمد اللہ اس مسئلہ کی کافی تشریح ہو چکی ہے اب مزید تفصیل کی ضرورت نہیں اب ہم اس مضمون کو عارف رومی قدس اللہ سرہ کے ان دعائیہ اشعار پر ختم کرتے ہیں ؎

اے خدائے قادر بے چون و چند
از تو پیدا شد چنیں قصر بلند
کوہ و دریا جملہ در فرمان تست
آب و آتش اے خداوندان تست
گر تو خواہی آتش آب خوش شود
ورنہ خواہی آب ہم آتش شود
این طلب در ماہم ایجاد تست
رستن از بیداد یارب داد تست
بے طلب تو ایں طلب مان دادۂ
گنج احساں بر ہمہ بکشادۂ
بے شمار و صد عطا ہا دادۂ
باب رحمت برہمہ بکشادۂ
بے طلب ہم مید ہی گنج نہاں
رائگاں بخشیدہ جان و جہان
در عدم کے بود مارا خود طلب
بے سبب کر دی عطا ہائے عجب



خال و مال وادی و عمر[۱] جاوداں
سائر نعمت کہ ناید در بیاں

[۱] ایں باعتبار روح گفتہ کہ ابدی است فافہم ذلک واستقم۔

بہذا النعم الی دار السلام
با لنبی المصطفیٰ خیر الانام
باطلب چوں ندہی اے حی ودود
کز تو آمد جملگی جود و وجود

صفات خداوندی غیر محدود ہیں

صد ہزاراں وصف اگر گوئی و بیش
جملہ وصف اوست اوزیں جملہ بیش
چوں نہایت نیست ایں را لا جرم
لاف کم باید زدن بربند دم

کمالات خداوندی کا انحصار کچھ صفات مذکورہ ہی پر نہیں اس کے کمالات تو بے حد بے پایاں ہیں کم اور کیف سب سے بالا اور برتر ہیں جس طرح اس کی ذات بابرکات بے حد اور بے پایاں اور کیف اور این سے منزہ ہے اسی طرح اس کی صفات بھی بے پایاں اور بے چوں وچگون ہیں۔ اس لئے کہ اگر کوئی زمان یا مکان اس کا احاطہ کر سکے تو پھر خدا کو خدا نہ کہنا چاہئے بلکہ اس کیف وکم کو یا اس زمان ومکان کو خدا کہنا چاہئے جو خدا کو بھی محیط ہے۔ وہ خدا ہی کیا ہوا جو کسی کے احاطہ میں آ جائے اسی طرح اگر کمالات خداوندی بھی کسی زمان یا مکان کے احاطہ میں آ جائیں تو وہ خدائی کمالات کیا ہوئے۔

علاوہ ازیں ہر شئے کے اوصاف اور کمالات اس کی ذات کے مناسب ہوتے ہیں۔ اوصاف اور کمالات کا ذات کے مناسب نہ ہونا نقص اور عیب ہے۔ انسان میں اگر وہ کمالات نہ ہوں جو عقلاً انسان کے لئے ہونا ضروری ہیں تو وہ انسان ناقص ہے۔ اس طرح اگر ذات خداوندی جو کہ بے حد اور بے پایاں اور بے کم اور بے کیف ہے

اس کے اوصاف اور کمالات بے حد و بے پایاں نہ ہوں تو اس کے لئے ایک عظیم نقص ہوگا کیونکہ ایسی ذات کے لئے محدود کمالات کا ہونا کسی طرح مناسب نہیں۔

صفات خداوندی مخلوق نہیں

اور جب یہ ثابت ہو گیا کہ کمالات ذات کے مناسب ہونے چاہئیں تو مخلوق شئے کے کمالات مخلوق ہونے چائیں اور غیر مخلوق ذات کے کمالات غیر مخلوق یعنی قدیم ہونے چاہئیں کیونکہ قطع نظر اس سے کہ کمالات خداوندی مثلاً علم اور سمع کے مخلوق اور حادث ہونے سے خدا کا اصل میں جاہل اور اندھا ہونا لازم آتا ہے، یہ خرابی لازم آتی ہے کہ کمالات خداوندی ذات خداوندی کے مناسب نہ رہیں اس لئے کہ ذات خداوندی تو قدیم اور غیر مخلوق ہے اور اس کے اوصاف اور کمالات کو مخلوق فرض کیا گیا ہے۔

ایک خلجان اور اس کا رفع

خلجان یہ ہے کہ اگر کمالات خداوندی مخلوق نہیں تو ان کو خدا کہنا چاہیئے کیونکہ خدا کے معنی ہی یہ ہیں کہ جو خود موجود ہو اور کسی کا مخلوق نہ ہو۔ اور جب کمالات خداوندی جو بے حد و بے پایاں ہیں خدا ٹھہرے تو یہ توحید کہاں رہی۔ توحید تو دو خدا ماننے کی صورت میں بھی نہیں رہتی چہ جائیکہ بے انتہا خدا ماننے کے بعد بھی توحید باقی رہے۔

جواب

یہ ہے کہ بے شک خداؤں کا متعدد ہونا محال ہے لیکن خداؤں کے متعدد ہونے کے معنی یہ ہیں کہ ہر ایک جدا اور مستقل وجود رکھتا ہو۔ لہٰذا صفات خداوندی اگرچہ ذات خداوندی کی طرح قدیم ہیں مگر ان کا وجود ذات خداوندی سے مادہ اور روح کی طرح جدا اور علیحدہ نہیں ان سب کا ایک ہی وجود ہے۔

بسا اوقات ایک ہی ذات ہوتی ہے مگر مختلف اعتبار سے اس کے ہزاروں لقب ہوتے ہیں ایک ہی شخص کسی لحاظ سے باپ اور کسی کے اعتبار سے بیٹا اور کسی کی نسبت سے چچا اور کسی حیثیت سے بھتیجا کہلاتا ہے۔ مگر اس کے ایک ہونے میں کسی قسم کا فرق نہیں آتا۔ اسی طرح وہ ذات خداوندی ایک ہے مگر کسی وجہ سے وہ خالق ہے اور کسی وجہ سے وہ رازق ہے۔ قال تعالیٰ:

﴿قُلِ ادْعُوا اللّٰهَ اَوِ ادْعُوا الرَّحْمٰنَ ؕ اَیًّا مَّا تَدْعُوْا فَلَهُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰی ۚ﴾[1]

ترجمہ: ”آپ کہیئے اللہ (کہہ کر) پکارو یا رحمٰن (کہہ کر) پکارو جس نام سے بھی پکارو اس کے اچھے ہی اچھے نام ہیں۔“

آفتاب طلوع کے وقت سرخ اور بے شعاع نظر آتا ہے اور نصف النہار کے وقت سفید اور باشعاع ہو جاتا ہے اور غروب کے وقت زرد ہو جاتا ہے۔ ان سب صورتوں میں یہی کہا جاتا ہے کہ آفتاب کو دیکھا۔ الحاصل جس طرح سے آفتاب کا باوجود ایک ہونے کے مختلف رنگوں میں جلوہ گر ہونا اور طرح طرح سے تجلی اس کی وحدت کے منافی نہیں۔ اسی طرح خداوند کریم کا باوجود ایک ذات ہونے کے مختلف صفات اور متعدد کمالات میں جلوہ گر ہونا اس کی وحدت کے منافی نہیں۔

صفات خداوندی نہ عین ذات ہیں نہ غیر ذات بلکہ لازم ذات ہیں

اس مثال سے یہ بات بھی نکل آئی کہ صفات خداوندی ذات باری تعالیٰ کے ساتھ ایسی نسبت رکھتی ہیں کہ ان کو نہ عین ذات کہہ سکتے ہیں اور نہ غیر ذات جیسا کہ نور کو نہ آفتاب کا عین کہہ سکتے ہیں نہ غیر بلکہ یہ کہیں گے کہ آفتاب تو معدن نور اور منبع

---

[1] القرآن: ۱۷/۱۱۰

ضیاء کا نام ہے اور نور اس کے لئے لازم ہے جیسا کہ چار کے لئے زوجیت اور پانچ کے لئے فردیت اسی طرح صفات خداوندی ذات باری کے لئے لازم ذات ہیں کہ ان صفات اور کمالات کا ذات خداوندی سے جدا ہونا ناممکن اور محال ہے۔

یہی تمام اہل سنت و الجماعت، اشاعرہ اور ماتریدیہ کا مسلک ہے کہ صفات خداوندی لازم ہیں اور اسی کو امام ربانی شیخ مجدد الف ثانی قدس سرہ نے مکتوبات میں اختیار فرمایا ہے اور حکماء اور صوفیہ جو عینیت کے قائل ہوئے ان کا شد و مد کے ساتھ رد کیا ہے۔

تسبیحات و تقدیسات یعنی تنزیہات

خداوند ذوالجلال کے لئے یہ ضروری ہے کہ تمام صفات کمال کے ساتھ موصوف ہو اسی طرح اس کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ تمام عیوب اور نقائص سے پاک اور منزہ ہو۔ خدائی کے ساتھ کسی عیب اور نقصان کا جمع ہونا ناممکن اور محال ہے۔ انسان قاصر اللسان اپنے خیال کے مطابق خدا تعالیٰ کی کتنی ہی ثنا اور ستائش کیوں نہ کرے مگر پھر بھی بعض مرتبہ خیالات اور اوہام خداوند ذوالجلال کی عظمت اور جلال کو جسمانی قالب میں ڈھال لیتے ہیں اور اس کے لئے جسمانی اور امکانی صفات اور خصوصیات ثابت کرنے لگتے ہیں اس لئے قرآن کریم نے جا بجا خداوند ذوالجلال کی تسبیح و تقدیس نزاہت اور لطافت کو خاص انداز سے بیان کیا ہے تاکہ محض لفظی اور اسمی اشتراک سے (مثلاً جیسے کہتے ہیں کہ خدا سنتا اور دیکھتا ہے۔ اور بندہ کو بھی کہتے ہیں کہ سنتا اور دیکھتا ہے۔ حالانکہ بندہ کے دیکھنے اور سننے کو خدا کے دیکھنے اور سننے سے کوئی نسبت نہیں) خدا اور بندہ کے درمیان میں کسی قسم کی مماثلت اور مشابہت کا شبہ نہ ہو اور خوب سمجھ لیں کہ وہ خداوند کردگار بے مثل اور بے چون و چگون ہے زمان اور مکان کیف اور این سب سے بالاتر ہے طائر عقل کی وہاں رسائی نہیں۔ کیونکہ زمان اور مکان کیف اور این

عقل اور ادراک سب اسی کے پیدا کیے ہوئے ہیں۔ بھلا واجب اور ممکن، قدیم اور حادث، باقی اور فانی میں کیسے مماثلت ممکن ہے۔ اور جب قدیم اور حادث حقیقت اور ذات کے اعتبار سے مختلف اور مباین ہیں تو صفات اور افعال میں کیسے ایک دوسرے کے مشابہ اور مماثل ہو سکتے ہیں۔

قال تعالیٰ: ﴿لَيْسَ كَمِثْلِهِ شَيْءٌ﴾ [۱]

ترجمہ: ''کوئی چیز اس کے مثل نہیں۔''

﴿وَلَمْ يَكُنْ لَّهُ كُفُوًا أَحَدٌ﴾ [۲]

ترجمہ: ''کوئی خدا کا ہمسر نہیں۔''

﴿هَلْ تَعْلَمُ لَهُ سَمِيًّا﴾ [۳]

ترجمہ: ''کیا تم کسی کو خدا کے ہم پلہ پاتے ہو۔''

﴿وَلَهُ الْمَثَلُ الْأَعْلَىٰ﴾ [۴]

ترجمہ: ''اس کی شان تو بہت ہی اعلیٰ اور ارفع ہے۔''

﴿أَفَمَنْ يَخْلُقُ كَمَنْ لَّا يَخْلُقُ﴾ [۵]

ترجمہ: ''کیا خالق اور غیر میں کسی قسم کی مشابہت ممکن ہے۔''

﴿اللَّهُ لَا إِلَٰهَ إِلَّا هُوَ الْحَيُّ الْقَيُّومُ لَا تَأْخُذُهُ سِنَةٌ وَلَا نَوْمٌ﴾ [۶]

ترجمہ: ''اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں۔ اس حی قیوم کو نہ اونگھ آتی ہے اور نہ نیند۔''

﴿وَلَا يَئُودُهُ حِفْظُهُمَا وَهُوَ الْعَلِيُّ الْعَظِيمُ﴾ [۷]

ترجمہ: ''اور نہیں تھکاتی اس کو ان کی حفاظت اور وہ بڑا عظمت والا

۱۔ القرآن:۴۲/۱۱ ۲۔ القرآن:۱۱۲/۴ ۳۔ القرآن:۱۹/۶۵ ۴۔ القرآن:۳۰/۲۷
۵۔ القرآن:۱۶/۱۷ ۶۔ القرآن:۲/۲۵۵ ۷۔ القرآن:۲/۲۵۵

ہے۔"

﴿لَا تُدْرِكُهُ الْاَبْصَارُ ۡ وَهُوَ يُدْرِكُ الْاَبْصَارَ ۡ وَهُوَ اللَّطِيْفُ الْخَبِيْرُ ۝﴾ [۱]

ترجمہ: "نگاہیں اس کا ادراک نہیں کرسکتیں۔ بلکہ وہی نگاہوں کا ادراک کرتا ہے اور وہ لطیف اور خبیر ہے اس لئے وہی ایسی لطیف یعنی غیر مادی اور غیر محسوس چیزوں کا ادراک کرتا ہے۔"

"وروی الحکیم الترمذی مرفوعا ان اللّٰہ احتجب عن العقول کما احتجب عن الابصار"

ترجمہ: "حکیم ترمذی نے روایت کیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ جس طرح نگاہوں سے محجوب اور مستور ہے اسی طرح عقلوں سے بھی محجوب اور مستور ہے۔"

ہرچہ اندیشی پذیر اے فناست
وانکہ در اندیشہ ناید آں خداست
آں مگو چوں در اشارت نایدت
دم مزن چوں در عبادت نایدت
نہ اشارت می پذیرد نہ عیان
نے کسے زو علم وارد نہ نشان
مر صفاتش راچناں داں اے پسر
کزوے اندر وہم ناید جز اثر
ظاہر است آثار ونور رحمتش
لیک کے داند جزا و ماہیتش

[۱] القرآن:۶/۱۰۳

ہیچ ماہیات اوصاف کمال
کس نداند جز بہ آثار و مثال

حق جل وعلا کی حقیقت تو درکنار انسان اپنی ہی حقیقت معلوم کرنے سے قاصر ہے حکماء نے بہت کچھ عقل کو دوڑایا مگر آج تک روح اور عقل اور قوت ادراکیہ کی حقیقت نہ معلوم کر سکے صرف چند خواص اور آثار معلوم کر سکے۔

عقل اور روح تو بڑی چیز ہے لیکن وہ مادہ جس کے وہ پرستار ہوئے ہیں اسی کی حقیقت نہ معلوم کر سکے۔ بلکہ آج تک اس کے وجود کو بھی ثابت نہ کر سکے۔

پس جب انسان باوجود ہر وقت کے مشاہدہ کے اپنی حقیقت پر مطلع نہ ہو سکا تو اس وراء الوراء ثم وراء الوراء کی حقیقت پر کیسے مطلع ہو سکتا ہے۔

اسی وجہ سے علامہ احمد بن مسکویہ رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ حق سبحانہ وتعالیٰ کی معرفت ایجابی اور اثباتی طریقہ سے ناممکن ہے۔ ایجابی اور اثباتی طریقہ سے معرفت کی صورت یہ ہے کہ اس شئے کی حقیقت یا صفت بیان کر دی جائے اور ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ کی حقیقت اور کنہ تو کون بتلا سکتا ہے۔ رہی صفات تو یہ انسان ضعیف البیان قاصر اللسان کہاں خداوند عالم کے اوصاف اور محامد بیان کر سکتا ہے۔

البتہ جو صفات ممکنات اور مخلوقات میں صفات کمال سمجھی جاتی ہیں انہی کو اپنی بساط اور مقدور کے موافق خداوند عالم کے لئے ثابت کرے گا اور ظاہر ہے کہ وہ ذات مقدس ان صفات سے کہیں اعلیٰ اور اشرف ہے۔ کما قال تعالیٰ:

﴿ سُبْحٰنَهٗ وَتَعٰلٰى عَمَّا يَصِفُوْنَ ﴾[1]

اس لئے کہ بندوں میں جو صفات کمال ہیں وہ سب اسی کی پیدا کی ہوئی ہیں اور یہ سب کے نزدیک مسلم ہے کہ خالق اور مخلوق میں مشابہت اور مماثلت ناممکن ہے۔ لہٰذا اس خداوند قدوس کی صحیح معرفت کا طریقہ یہ ہے کہ یہ کہا جائے کہ وہ بے مثل اور

[1] القرآن: ۶/۱۰۰

بے چون وچگون ہے۔ کما قال تعالیٰ:

﴿لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَىْءٌ﴾ [1]

ترجمہ: "کوئی شئے اس کے مانند نہیں۔"

خدا کے جاننے کا سب سے بہتر طریق یہی سلبی طریق ہے۔ ایجابی اور اثباتی طریق میں اندیشہ ہے کہ تنزیہ کا حق ادا نہ ہو۔ "واللّٰہ سبحانہ و تعالیٰ اعلم" [2]

اور اگر بالفرض خدا کے لئے بے مثل ہونا ضروری نہ ہو بلکہ خالق کا مخلوق کے مشابہ اور مماثل ہونا ممکن ہو تو پھر معاذ اللہ خداوند ذوالجلال پر تغیر اور تبدل، فنا اور زوال تمام جسمانی اور امکانی عوارض کا طاری ہونا ممکن ہوگا کیونکہ دو مماثل اور مشابہ چیزیں حکم میں بھی مماثل اور مشابہ ہوتی ہیں علاوہ ازیں مماثلت وہاں ممکن ہے کہ جہاں کسی قسم کی شرکت ممکن ہو اور ظاہر ہے کہ مخلوق خالق کے ساتھ کسی چیز میں شریک نہیں لہٰذا مماثلت بھی ناممکن ہوگی۔

اور جب ثابت ہوگیا کہ خالق مخلوق کے مشابہ نہیں ہوسکتا تو ثابت ہوگیا کہ خالق مخلوقات کی تمام خصوصیات سے مبرا اور منزہ ہوگا۔

حق تعالیٰ کسی کے ساتھ متحد نہیں

حق تعالیٰ کسی شئے کے ساتھ متحد نہیں اور نہ کوئی شئے حق تعالیٰ کے ساتھ متحد ہے اس لئے کہ جب اس کی شان یہ ہے کہ "لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَىْءٌ" نہ کوئی اور اس کا ذات میں مماثل ہے نہ صفات میں تو پھر اتحاد کیسے ممکن ہے۔

نصاریٰ کہتے ہیں کہ خدا تعالیٰ اور عیسیٰ علیہ السلام اور روح القدس تینوں مل کر ایک ہیں۔ ہنود کہتے ہیں کہ خدا تعالیٰ اوتاروں میں حلول کرتا ہے۔ "سُبْحَانَهٗ

[1] القرآن: ۴۲/۱۱ [2] کذا فی الفوز الاصغر: صفحہ ۲۶، فصل ثامن

وَتَعَالٰی عَمَّا یَصِفُوْنَ"، بعض صوفیہ کرام جو وحدۃ الوجود کے قائل ہیں۔ ان کی یہ مراد ہرگز نہیں کہ بندہ خدا کے ساتھ متحد ہو جاتا ہے اس لئے کہ یہ سراسر کفر اور الحاد ہے ان کی مراد یہ ہے کہ اصل وجود تو ایک ہے یعنی وجود خداوندی باقی ہیچ جیسے آفتاب جب طلوع کرتا ہے تو عالم کا ہر ہر ذرہ روشن ہو جاتا ہے تو روشن اور منور تو لاکھوں اور کروڑوں ہیں مگر نور ایک ہی ہے۔ یا یوں کہئے کہ جن حضرات پر اللہ کی محبت کا غلبہ ہوتا ہے ان کو سوائے خدا تعالیٰ کے کوئی چیز نظر نہیں آتی یہ خاص کیفیت اور خاص حالت ہے جن پر گزرتی ہے وہی جانتے ہیں۔ "اللھم اجعلنا منھم"

امام ربانی شیخ مجدد الف ثانی قدس سرہ فرماتے ہیں۔

حضرت خواجہ قدس سرہ فرمودہ اند کہ معنی عبارت انا الحق نہ آنست کہ من حقم بلکہ آنست کہ من نیستم و موجود حق است سبحانہ وتغیر وتبدل رابذات وصفات وافعال او تعالیٰ راہ نیست "فسبحان من لا یتغیر بذاتہ ولا بصفاتہ ولا فی الافعال بحدوث الاکوان"

حضرت خواجہ قدس سرہ فرماتے ہیں کہ انا الحق کے یہ معنی ہرگز نہیں کہ میں حق اور خدا ہوں، بلکہ یہ مطلب ہے کہ میں نہیں ہوں صرف حق تعالیٰ موجود ہے کہ جس کی بارگاہ میں تغیر ذات اور تبدل صفات وافعال کا کوئی گزر نہیں وہ ذات ذوالجلال اپنی ذات اور تمام صفات اور افعال میں تغیر اور تبدل سے منزہ ہے۔ موجودات کے تغیر سے اس میں کوئی تغیر وتبدل نہیں ہوتا۔

مثلاً لوہا اگر آگ میں ڈال دیا جائے اور وہ لوہا آگ کے فیض سے ایسا صاف اور شفاف اور سرخ ہو جائے کہ آگ کا ہم رنگ بن جائے اور اس حالت میں یہ لوہا بزبان حال "انا النار" کہے تو درحقیقت اس کا یہ مطلب نہیں کہ میں فی حد ذاتہ نار ہوں بلکہ یہ ان آثار کی طرف راجع ہے کہ جو لوہے میں آگ کے فیض صحبت سے پیدا ہو گئے ہیں

ؔ مکتوب: صفحہ ۲۶۶، صفحہ ۳۱۴ دفتر اول

نے کہ ہر دم نغمہ آرائی کند
فی الحقیقت از دم نائی کند
بے فنائے خویش بے جذب قوی
کے حریم وصل را محرم شوی
تو مباش اصلا کمال این ست و بس
تو دراں گم شو وصال این ست و بس

یا کوئی صاف وشفاف آئینہ کہ جوآفتاب کی شعاعوں سے جگمگا اٹھا ہواور دیکھنے سے یہ معلوم ہوتا ہو کہ گویا یہی آفتاب ہے ایسی حالت میں اگر یہ ائینہ "انا الشمس" (میں آفتاب ہوں) کہےتو اس کا مطلب یہ بھی نہیں کہ میں حقیقتاً آئینہ آفتاب ہوں بلکہ مطلب یہ ہے کہ میں کچھ نہیں یہ جو کچھ شعاعیں اور انوار مجھ میں موجزن ہیں وہ آفتاب کی تجلی اور انعکاس کا پرتو ہے۔اسی طرح مقربان الٰہی کہ جن کے قلوب آئینہ سے زائد صاف اور شفاف، مصفی اور مجلی ہو جاتے ہیں اور اس نورالسموات والارض کے انوار اور تجلیات ان میں منعکس ہونے لگتے ہیں ایسی حالت میں ان حضرات سے ایسے کلمات صادر ہو جاتے ہیں کہ جن کو عوام اور قاصر الافہام ظاہر پر محمول کر لیتے ہیں کہ جوان کے دین وایمان کے لئے باعث تخریب ہوتا ہے۔

اور فی الحقیقت ان کا مطلب وہ ہوتا ہے کہ جو ہم شیخ مجدد رحمہ اللہ تعالی سے نقل کر چکے ہیں۔اور مولانا رومی قدس سرہ السامی نے اس مسئلہ کو مثنوی میں مختلف طریق سے متعدد مواضع میں حل فرمایا ہے۔اختصاراً صرف ایک جگہ کا کلام ہدیہ ناظرین کیا جاتا ہے۔

معشوقے از عاشق پرسید کہ خود را دوست تر داری یا مرا گفت من از خود مردہ ام و بتو زندہ ام از خود واز صفات خود نیست شدہ ام و بتو ہست شدہ ام علم خود را فراموش کردہ ام واز علم تو عالم شدہ ام، قدرت خود را باد دادہ ام، واز قدرت تو قادر شدہ ام اگر خود را

دوست دارم ترا دوست داشتہ باشم واگر ترا دوست داشتہ باشم خودرا دوست داشتہ باشم۔

ہر کرا آئینہ یقین باشد
گرچہ خود بیں خدائے بیں باشد

اخرج بصفاتی الی خلقی من رئاك فقد رآنی ومن قصدك قصدنی ومن احبك احبنی وقس علی هذا.

گفت معشوقے بعاشق زامتحان
در صبوحی[1] کای فلاں ابن الفلان
مر مرا تو دوست تر داری عجب
یا کہ خود را راست گویا ذالکرب
گفت من در تو چناں فانی شدم
کہ پرم من از تو از سر تا قدم
بر من از ہستی من جز نام نیست
در وجودم جز توای خوش کام نیست
زاں سبب فانی شدم من اینچنیں
ہمچو سرکہ در تو بحر انگبیں
ہمچو سنگے کہ شود کل لعل ناب
پر شود او از صفات آفتاب
بعد ازاں گر دوست دارد خویش را
دوستی خور بود آں اے فتیٰ
ور کہ خود را دوست دارد او بجاں
دوستی خویش باشد بیگماں

[1] وقت نوشیدن شراب

خواہ خود را دوست دارد لعل ناب
خواہ او دوست دارد آفتاب
اندریں دو دوستی خود فرق نیست
ہر دو جانب جز ضیائے شرق نیست
تانشد او لعل خود را دشمن است
زانکہ یک من نیست اینجا دو من است
زانکہ ظلمانی ست سنگ ای باحضور
ہست ظلمانی حقیقت ضد نور
خویش را گر دوست دارد کافرست
زانکہ او مناع شمس اکبر ست
پس نشاید کہ بگوید سنگ انا
اوہمہ تاریکی ست و در فنا
گفت فرعونے اناالحق گشت پست
گفت منصورے اناالحق و برست
آں انا را لعنۃ اللہ در قفا
ویں انا را رحمۃ اللہ در فنا
زآنکہ اوسنگ سیہ بد این عقیق
آں عدوئے نور بود و عشیق این عشق

"سُبْحَانَهٗ اَنْ يَّكُوْنَ لَهٗ وَلَدٌ"

جب خدا کا وحدہ لاشریک لہ ہونا ثابت ہو گیا تو پھر اس میں کوئی شک نہیں رہا کہ خدا کے لئے نہ بیٹا ہوسکتا ہے اور نہ بیٹی۔ اس لئے کہ اولاد ماں باپ کے ہم جنس ہوا کرتی ہے۔ پس معاذ اللہ اگر کوئی خدا کے بیٹا ہوگا تو وہ خدا کے ہم جنس ہوگا کہ جو

توحید کے سراسر خلاف ہے۔ نیز ایک ذات سراپا احتیاج کو خدا ماننا اور الوہیت میں اس کو شریک سمجھنا کھلی نادانی ہے۔

﴿قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ ۝ اَللّٰهُ الصَّمَدُ ۝ لَمْ يَلِدْ ۙ وَلَمْ يُوْلَدْ ۝ وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ ۝﴾ [1]

ترجمہ: ''اے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم! آپ فرما دیجئے کہ اللہ ایک ہے اور بے نیاز ہے نہ اس نے کسی کو جنا نہ وہ کسی سے جنا گیا اور نہ کوئی اس کا ہمسر ہے۔''

گر تو مردے را بخوانی فاطمہ
گرچہ یک جنس اند مرد وزن ہمہ
قصد خوں تو کند تا ممکن است
گرچہ خوشخوی وحلیم وساکن ست
فاطمہ مدح است در حق زناں
مرد را گوئی بود زخم سناں
دست و پادر حق ما استایش ست
در حق پاکی حق آلایش ست
لم یلد ولم یولد او را لائق ست
والد و مولود را او خالق ست
ہرچہ جسم آمد ولادت وصف اوست
ہرچہ مولود ست اوزیں سوی جوست
زانکہ از کون وفسادت وہیں
حادث ست و محدثے خواہد یقین

[1] القرآن ۱۰۲/۱تا۴

صفات متشابہات

اے بر تراز خیال و قیاس و گمان و وہم
وز ہرچہ گفتہ اند شنیدیم خواندہ ایم

خدا کی ذات کو اپنی ذات پر اور اس کی صفات کو اپنی صفات پر قیاس کرنا سخت نادانی ہے ہر جگہ مخلوق کو بھی مخلوق پر قیاس نہیں کر سکتے۔ خالق تو درکنار پیشاب کو پیشاب پر بدبو میں قیاس کر سکتے ہیں۔ مگر گلاب کو پیشاب پر قیاس نہیں کر سکتے۔ مردہ کو مردہ پر قیاس کر سکتے ہیں مگر زندہ کو مردہ پر قیاس نہیں کر سکتے۔ قیاس وہاں ہو سکتا ہے جہاں کسی قسم کی مشابہت ہو اور مخلوقات کو خدائے بے مثل سے کچھ بھی مشابہت نہیں۔

قال تعالیٰ:

﴿لَيْسَ كَمِثْلِهِ شَيْءٌ.﴾ [۱]

ترجمہ: ”کوئی شے اس کے مثل نہیں۔“

﴿هَلْ تَعْلَمُ لَهُ سَمِيًّا.﴾ [۲]

ترجمہ: ”کیا اس کا کوئی ہم نام معلوم ہے۔“

﴿وَلَهُ الْمَثَلُ الْأَعْلٰى.﴾ [۳]

ترجمہ: ”بالا اور برتر شان اسی کے لئے مخصوص ہے۔“

اور اگر مخلوقات کو خالق کے ساتھ وجود علم و قدرت حیات میں کچھ مشابہت ہے تو برائے نام۔ زمین کی روشنی اور چمک کو آفتاب کی روشنی سے کیا نسبت۔ اگر ہے تو وہ برائے نام سب جانتے ہیں کہ وہ آفتاب ہی کا فیض ہے ورنہ زمین کی روشنی کجا اور نور آفتاب کجا۔ پس اس کی حیات ہماری حیات کی طرح نہیں اور اس کا سننا اور دیکھنا اور کلام کرنا ہمارے سننے اور دیکھنے اور کلام کرنے کے مشابہ نہیں۔ وہ اپنے سننے اور دیکھنے

---

[۱] القرآن ۴۲/۱۱ [۲] القرآن ۱۹/۶۵ [۳] القرآن ۳۰/۲۷

اور ادراک اور علم میں جوارح کا محتاج نہیں اس کے علو کے لئے کوئی مکان اور جہت نہیں اس کے نزول اجلال کے لئے حرکت نہیں۔ اس کی رضاء وغضب کی کوئی کیفیت نہیں۔

بہر حال اس کی شان اعلی اس سے برتر ہے کہ کسی عقلی یا حسی شئے کو اس پر قیاس کر سکیں لیکن تقرب الی الفہم کے لئے اس کی شوؤن اور صفات کو انہی کی زبان اور محاورات میں ذکر کیا جاتا ہے

علی جهته التقریب للذهن اذلنا
عقول علیها فهم ما ثم یعسر

یعنی چونکہ اس کی صفات اور شوؤں کا سمجھنا بہت دشوار تھا اس لئے تقریب الی الاذھان کے لئے اس قسم کے محاورات استعمال میں لائے گئے۔

کما قال تعالٰی: ﴿وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا بِلِسَانِ قَوْمِهٖ﴾[1]

تَرجَمَہ: ”اور ہم نے ہر رسول کو اس کی قوم کی طرف بھیجا اسی کی زبان میں۔“

تمام ملتیں اور ادیان سماویہ اس پر متفق رہی کہ خدا کی صفات کمال کو محاورات اور معروف الفاظ میں ذکر کیا جائے۔ تاکہ عام عقلیں خدا کو پہچان سکیں اور ساتھ ہی ساتھ ”لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ“ سے بھی آگاہ کر دیا تاکہ خالق اور مخلوق میں کسی قسم کا قیاس نہ جاری کر سکیں اور زیادہ بحث وتفتیش میں نہ پڑیں۔ انسان اپنی محدود اور ناقص اور قلیل علم سے اس خداوند قدوس کے بے کم وکیف اور بے حد و بے پایاں ذات اور صفات کا تو درکنار اپنی ہی ذات کا پورا ادراک نہیں کر سکتا کہ تمام حکماء ختم ہو گئے مگر جسم اور روح کی حقیقت آج تک نہیں سمجھا سکے۔

---

[1] القرآن ۴/۱۴

ہاں اجمالی طور سے اس قدر معلوم ہوسکتا ہے کہ وہ ذات جامع کمالات ہے اور اپنی ذات اور صفات کے اعتبار سے بے مثل اور یکتا ہے۔

قال تعالیٰ:

﴿وَمَآ اُوْتِيْتُمْ مِّنَ الْعِلْمِ اِلَّا قَلِيْلًا﴾ [1]

ترجمہ: ''اور نہیں دیا گیا تم کو کوئی حصہ علم کا مگر بہت ہی قلیل۔''

﴿وَلَا يُحِيْطُوْنَ بِشَيْءٍ مِّنْ عِلْمِهٖٓ اِلَّا بِمَا شَآءَ﴾ [2]

ترجمہ: ''اس کے علم میں سے کسی شئے کا بھی احاطہ نہیں کر سکتے۔''

اور اسی وجہ سے کہ خدا کی ذات وصفات کے متعلق زیادہ بحث وتفتیش کرنا اس کی کیفیتوں میں غور وخوض کرنا محض لا حاصل ہی نہیں بلکہ کج فہمی کی دلیل ہے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی امت کو حکم فرمایا:

''تفکروا فی الخلق ولا تفکروا فی الخالق وان الی ربك المنتھی ولا فکرۃ فی الخالق''

ترجمہ: ''مخلوق میں فکر کرو۔ خالق میں نہیں اللہ تک سب چیزیں ختم ہو جاتی ہیں۔ خالق میں فکر نہ کرنا چاہئے۔''

اور اسی وجہ سے صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کا تمام قرن اسی طرح گزرا کہ وہ خدا کی تمام صفات کمالیہ پر ایمان رکھتے تھے اور تنزیہ اور تقدیس کے لئے لیس کمثلہ شیء پڑھ لیا کرتے تھے کیونکہ وہ جانتے تھے کہ ان صفات کے ذکر کرنے سے مقصد صرف اس قدر ہے کہ ہم ان صفات کے ذریعہ سے اپنے خالق کو پہچان سکیں اور یہ مطلب ہرگز نہیں کہ وہ ہماری طرح آنکھ سے دیکھتا ہے اور سنتا ہے اس لئے کہ جس طرح اس کی ذات بے چون و چگون ہے اسی طرح اس کی صفات اور شوؤن بھی بے چون وچگون ہیں۔ انہی صفات متشابہات میں سے استواء علی العرش بھی اللہ تعالیٰ کی ایک

[1] القرآن: ۸۵/۱۷ [2] القرآن: ۲۵۵/۲

صفت ہے جو اس کی شایان شان ہے بطور نمونہ علماء راسخین کا کلام نقل کرتے ہیں۔ تفصیل کے لئے علم کلام کی کتابوں کی مراجعت کریں۔

استواء علی العرش

قال تعالٰی: ﴿اَلرَّحۡمٰنُ عَلَی الۡعَرۡشِ اسۡتَوٰی ۝﴾[1]

ترجمہ: ”رحمٰن عرش پر مستوی ہے۔“

جب یہ ثابت ہو گیا کہ اس کی ذات ہماری ذات اور اس کی صفات ہماری صفات کے مشابہ اور مماثل نہیں یقیناً وہ علیم وخبیر سمیع وبصیر ہے مگر ہماری طرح نہیں بدون مضغہ لحم کے ادراک کرتا ہے اور بے کان کے سنتا ہے اور بے آنکھ کے دیکھتا ہے بدون زبان کے کلام کرتا ہے۔ ہماری طرح ان اعضاء اور جوارح کا محتاج نہیں۔

﴿وَاللّٰهُ الۡغَنِیُّ وَاَنۡتُمُ الۡفُقَرَآءُ ۚ﴾[2]

ترجمہ: ”اللہ ہر طرح بے نیاز ہے اور تم ہر طرح حاجت مند۔“

پس جس طرح وہ بغیر آنکھ اور کان کے سمیع وبصیر ہے ٹھیک اسی طرح وہ بغیر جہت اور مکان کے مستوی علی العرش بھی ہے اگر بغیر آنکھ اور کان کے دیکھنا اور سننا ممکن ہے تو بغیر جہت اور مکان کے عرش پر مستوی ہونا بھی ممکن ہے اور جس طرح اس کے علم اور سمع وبصر کی کیفیت حیطہ عقل سے باہر ہے اسی طرح "استواء علی العرش" کی کیفیت بھی احاطۂ ادراک سے خارج ہے۔ چنانچہ امام مالک رحمہ اللہ تعالیٰ سے جب ”استواء علی العرش“ کی کیفیت دریافت کی گئی تو یہ ارشاد فرمایا:

”کیف غیر معقول والاستواء غیر مجھول والایمان به واجب والسوال عنه بدعة انتهی“

یعنی اس کی کیفیت عقل میں نہیں آسکتی نیز اس کی ذات اور اس کی تمام صفات

---

[1] القرآن: ۵/۲۰ [2] القرآن: ۳۸/۴۷

کم وکیف سب سے منزہ اور پاک ہیں لہٰذا جو شئے کہ کم وکیف سب سے پاک ہے اس کی کیفیت دریافت کرنا سراسر غیر معقول ہے۔ اور عقل "استواء علی العرش" کی اگر چہ کیفت اور حقیقت سے واقف نہیں مگر اتنا ضرور جانتی ہے کہ یہ ایک صفت کمال ہے کہ جس پر بلاتشبیہ کے ایمان لانا ہی ایسا ضروری ہے جیسا کہ اس کے علم وقدرت سمع وبصر پر بلاتشبیہ کے ایمان لانا حتمی اور لازمی ہے اور اس قسم کا سوال بدعت ہے کیونکہ ادیان سماویہ اور ملل الٰہیہ اور خیر القرون میں کبھی اس قسم کا سوال نہیں پیدا ہوا اس لئے کہ وہ سب جانتے تھے کہ یہ سب صفات کمال ہیں خدا کا ان کے ساتھ موصوف ہونا لابدی ہے مگر ہماری طرح نہیں۔ "لیس کمثلہ شیء"

غالباً ہمارے اس بیان کے بعد استواء علی العرش کے بارہ میں کسی قسم کا شک نہ رہا ہوگا۔ اور اگر اب بھی کچھ خلجان باقی ہے تو ہم چند اکابر امت کی تحقیق آپ کے سامنے پیش کرتے ہیں اگر خدا کے فضل اور اس کی توفیق نے دستگیری فرمائی تو انشاء اللہ العزیز آپ کو اطمینان ہو جائے گا۔

تحقیق حجۃ الاسلام امام غزالی قدس اللہ سرہ

(۱) قل لمن یفھم ما اقول
اترک البحث فذا شرح یطول

ترجمہ: "جو شخص استواء علی العرش کی حقیقت سمجھنا چاہے اس سے کہہ دو کہ اس تفتیش کو چھوڑو اس کی شرح بہت طویل ہے۔"

(۲) ثم سر غامض من دونہ
قصرت واللہ اعناق الفحول

لہ مجانی الادب جلد ۴ صفحہ ۴ ومشارق الانوار جلد ۲ صفحہ ۳۷

ترجمہ: ”یہ ایک سربستہ راز ہے جس کے سامنے بڑے بڑے علماء کی گردنیں خم ہیں۔“

③ انت لا تعرف اياك ولم
تدر من انت ولا كيف الوصول

ترجمہ: ”اے مخاطب تو اپنی ہی حقیقت سے واقف نہیں کہ تو کون ہے اور کس طرح ہے۔“

④ لا ولا تدرى صفات ركبت
فيك حارث فى خفاياها العقول

ترجمہ: ”اور نہ ان صفات کو جانتا ہے کہ جو تیرے میں پیوست ہیں ان کے اسرار و دقائق کے ادراک میں عقلیں حیران ہیں۔“

⑤ اين منك الروح فى جوهرها
هل تراها او ترى كيف تجول

ترجمہ: ”بتلاؤ کہ روح کہاں ہے اور اس کی کیا حقیقت ہے اور کیا اس کو دیکھتے ہو اور کس طرح وہ حرکت کرتی ہے۔“

⑥ وكذا الانفاس هل تحصرها
لا ولا تدرى متى عنك تزول

ترجمہ: ”اور علی ہذا انفاس (سانس) کو کیا شمار کر سکتے ہو۔ ہرگز نہیں اور نہ تم کو یہ معلوم کہ وہ تم سے کب علیحدہ ہوں گے۔“

⑦ اين منك العقل والفهم اذا
غلب النوم فقل لى ياجهول

ترجمہ: ”اور جب نیند غالب آتی ہے تو عقل وفہم کہاں چلے جاتے ہیں بتلا اے ناداں۔

⑧ انت اكل الخبز لا تعرفه
كيف يجرى منك امر كيف تبول

ترجمہ: ”تمہیں تو یہ بھی اچھی طرح معلوم نہیں کہ کس طرح کھانا اندر پہنچتا ہے اور کس طرح پیشاب آتا ہے۔

⑨ فاذا كانت طواياك التى
بين جنبيك بها انت جهول

ترجمہ: ”پس جب تم اپنی انتڑیوں ہی کی حقیقت اور کنہ سے بے خبر ہو۔“

⑩ كيف تدرى من على العرش استوٰى
لا تقل كيف استوى كيف النزول

ترجمہ: ”تو تم استواء علی العرش اور نزول الی السماء الدنیا کی کیفیت اور حقیقت کس طرح جان سکتے ہو۔

⑪ كيف يحكى الرب امر كيف يُرىٰ
فَلَعُمرى ليس ذا الا فضول

ترجمہ: ”خدا کی کیفیت کس طرح بیان ہوسکتی ہے اور کس طرح خدا دیکھا جاسکتا ہے یہ سب فضول باتیں ہیں۔“

⑫ فهو لا كيف ولا اين له
وهو رب الكيف والكيف يحول

ترجمہ: ”خدا تعالیٰ کیف اور این سب سے منزہ ہے اس لئے کہ وہ تو این اور کیف سب کا خالق اور رب ہے۔“

⑬ وهو فوق الفوق لا فوق له
وهو فى كل النواحى لا يزول

ترجمہ: ”وہ فوق الفوق اور وراء الوراء ہے اس کے اوپر کوئی نہیں وہی سب جگہ حاضر وناظر ہے۔“

(۱۴) جل ذاتاً و صفات وعلا
وتعالیٰ ربنا عما نقول

ترجمہ: ”حق تعالیٰ اپنی ذات وصفات میں اعلیٰ اور برتر ہے اور جو کچھ ہم کہتے ہیں اس سب سے برتر ہے۔“

تحقیق شیخ ابوطاہر قزوینی علیہ الرحمۃ

خداوند عالم نے کائنات عالم کو مختلف طبقات پر تقسیم کیا ہے، اول زمین اور پانی کا طبقہ ہے اور پھر کرہ ہوا اور کرہ نار ہے اور ان کے بعد سبع سموات اور سبع سموات پر کرسی جلال۔ اور کرسی جلال پر عرش عظیم۔ عرش کے بعد کسی مخلوق کا وجود ثابت نہیں، رہے سرادقات جلال سو وہ عرش ہی کے تابع ہیں، عرش سے جدا نہیں۔ (الحاصل) کائنات عالم میں سے کوئی شئے دائرہ عرش سے باہر نہیں سبع سموات اور سبع ارضین سب کو عرش عظیم محیط ہے اس کے بعد کسی مخلوق کا ہونا نہ کسی عقلی دلیل سے ثابت ہے نہ کسی نقلی دلیل سے، غرض یہ کہ کائنات کا سلسلہ عرش عظیم پر ختم ہو جاتا ہے۔

پس ”الرحمن علی العرش استوی“ کے یہ معنی ہیں کہ خداوند عالم کی تکوین اور تخلیق کا سلسلہ عرش عظیم پر ختم ہو گیا اور کوئی مخلوق دائرہ عرش سے باہر نہیں۔

اور قرآن عزیز میں استوی کا لفظ اس معنی میں بکثرت مستعمل ہوا۔

قال تعالیٰ: ﴿وَلَمَّا بَلَغَ اَشُدَّهٗ وَاسْتَوٰی﴾ [۱]

ای استتم شبابه.

ترجمہ: ”جب وہ اپنی جوانی کو پہنچ گیا اور اس کی جوانی ختم ہو گئی۔“

---

[۱] القرآن: ۱۴/۲۸

﴿كَزَرْعٍ اَخْرَجَ شَطْاَهٗ فَاٰزَرَهٗ فَاسْتَغْلَظَ فَاسْتَوٰى﴾ [1]

ترجمہ: ''جیسے کھیتی نے نکالا اپنی سوئی کو، پھر اس کو مضبوط کیا پس موٹا ہوا۔ پھر کھیتی مکمل ہوگئی۔''

ای استتم ذلك الزرع.

استواء کے اصل معنی مساوات کے ہیں۔ کما قال تعالٰی:

﴿هَلْ يَسْتَوِى الَّذِيْنَ يَعْلَمُوْنَ وَالَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ﴾ [2]

ترجمہ: ''کیا اہل علم اور غیر اہل علم برابر ہو سکتے ہیں۔''

لیکن جب کوئی شئے اپنی نہایت اور کمال کو پہنچ جاتی ہے محاورہ عرب میں اس کے لئے استوی کا لفظ مستعمل ہوتا ہے اور استواء شمس اور استواء میزان اسی سے ماخوذ ہے۔ قال تعالٰی:

﴿فَاِذَا اسْتَوَيْتَ اَنْتَ وَمَنْ مَّعَكَ.﴾ [3]

ترجمہ: ''جب تم اور تمہارے ساتھی سوار ہو جائیں۔''

﴿لِتَسْتَوٗا عَلٰى ظُهُوْرِهٖ﴾ [4]

ترجمہ: ''تاکہ تم اس کی پشت پر بیٹھ جاؤ۔''

﴿وَاسْتَوَتْ عَلَى الْجُوْدِيِّ﴾ [5]

ترجمہ: ''اور (کشتی) جودی پر ٹھہر گئی۔''

﴿فَسَوّٰىهُنَّ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ.﴾ [6]

ای کمل وتمم خلقها.

ترجمہ: ''خدا نے سات آسمان مکمل بنا دیئے۔''

وقال تعالٰی:

---

[1] القرآن: ۲۹/۴۸ [2] القرآن: ۹/۳۹ [3] القرآن: ۲۸/۲۳

[4] القرآن: ۱۳/۴۳ [5] القرآن: ۴۴/۱۱ [6] القرآن: ۲۹/۲

﴿فَإِذَا سَوَّيْتُهٗ وَنَفَخْتُ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِيْ﴾[1]

ترجمہ: "پس جب میں اس کو تام الخلقہ بنادوں اور اس میں اپنی خاص روح ڈال دوں۔"

﴿يٰٓاَيُّهَا الْاِنْسَانُ مَا غَرَّكَ بِرَبِّكَ الْكَرِيْمِ ۝ الَّذِيْ خَلَقَكَ فَسَوّٰىكَ فَعَدَلَكَ ۝﴾[2]

ترجمہ: "اے انسان تجھ کو خدائے کریم کے بارہ میں کس نے دھوکہ دیا جس نے تجھ کو پیدا کیا اور درست اندام اور معتدل کیا۔"

نیز خداوند عالم نے قرآن عزیز میں استوی علی العرش کو چھ جگہ ذکر فرمایا ہے اور ہر جگہ اس سے قبل سبع سموات اور سبع ارضین کی تخلیق کا تذکرہ کیا ہے جس سے صاف یہ معلوم ہوتا ہے کہ آیت کا مطلب یہ ہے کہ اس خداوند عالم نے زمین اور زمان اور کون ومکان سب کو پیدا فرمایا اور اپنی تکوین اور تخلیق کے سلسلہ کو عرش عظیم پر ختم کردیا۔ قال تعالیٰ:

❶ ﴿اِنَّ رَبَّكُمُ اللّٰهُ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ فِيْ سِتَّةِ اَيَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ﴾[3]

ترجمہ: "بے شک تمہارا رب اللہ ہے جس نے زمین وآسمان چھ دن میں بنائے اور پھر مستوی علی العرش ہوا۔"

❷ ﴿اِنَّ رَبَّكُمُ اللّٰهُ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ فِيْ سِتَّةِ اَيَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ يُدَبِّرُ الْاَمْرَ﴾[4]

ترجمہ: "یقیناً تمہارا رب اللہ ہے جس نے آسمان اور زمین چھ دن میں بنائے پھر قائم ہوا عرش پر، تدبیر کرتا ہے تمام کاموں کی۔"

---

[1] القرآن: ۷۲/۳۹ [2] القرآن: ۸۲/۶، ۷

[3] القرآن: ۷/۵۴ [4] القرآن: ۱۰/۳

۳ ﴿تَنْزِيْلًا مِّمَّنْ خَلَقَ الْاَرْضَ وَالسَّمٰوٰتِ الْعُلٰى. ۝ اَلرَّحْمٰنُ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوٰى ۝ وَلَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا وَمَا تَحْتَ الثَّرٰى ۝﴾ [1]

ترجمہ: ”یہ قرآن اس ذات کا اتارا ہوا ہے جس نے زمین اور بلند آسمانوں کو پیدا کیا۔ وہ بڑا مہربان ہے عرش پر قائم ہوا اور آسمان اور زمین اوران کے درمیان کی اور تحت الثریٰ کی تمام چیزیں اسی کی ملک میں۔“

۴ ﴿اَلَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا فِيْ سِتَّةِ اَيَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ ۚ﴾ [2]

ترجمہ: ”اللہ ہی نے زمین اور آسمان کو اوران کے درمیان کی چیزوں کو چھ دن میں پیدا فرمایا پھر عرش پر قائم ہوا۔“

۵ ﴿اَللّٰهُ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا فِيْ سِتَّةِ اَيَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ ۭ﴾ [3]

ترجمہ: ”اللہ ہی نے سبع سموات وارضین کو اوران کے مابین کو چھ دن میں پیدا فرمایا پھر عرش پر قائم ہوا۔“

۶ ﴿هُوَ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ فِيْ سِتَّةِ اَيَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ ۝﴾ [4]

ترجمہ: ”اسی نے چھ دن میں آسمان اور زمین کو پیدا کیا۔ پھر عرش پر قائم ہوا۔“

الحاصل سبع سموات اور سبع ارضین کے بعد استواء علی العرش کو خصوصیت سے ذکر کرنا اس پر صاف دلالت کرتا ہے کہ الرحمٰن علی العرش

ل القرآن: ۲۰/۴،۵،۶ ۔ ۲ القرآن: ۲۵/۵۹

۳ القرآن: ۳۲/۴ ۔ ۴ القرآن: ۵۷/۴

استوی کے یہ معنی ہیں کہ خداوند عالم کی تخلیق اور تکوین کا سلسلہ عرش پر ختم ہو گیا۔

تحقیق شیخ محی الدین ابن عربی قدس اللہ سرہ

تکوین عالم سے خداوند ذوالجلال کو حاشا اپنا کوئی ذاتی نفع اور نقصان مدنظر نہیں بلکہ مقصد یہ ہے کہ اپنی صفات کمال کے مظاہر پیدا کرے تاکہ مخلوق اپنے خالق کو ان مظاہر کے واسطہ سے سمجھ سکے۔ ورنہ مخلوق کی کیا مجال کہ وہ اپنے خالق ذوالجلال کو بدون کسی مظہر یا تجلی کے سمجھ سکے۔

ولم یبد من شمس الوجود ونورها
علی عالم الارواح شیء سوی القرص
ولیس تناول الذات فی غیر مظهر
ولو هلك الانسان من شدة الحرص
ولا ریب فی قول الذی قد بثثته
وما هو بالقول المموه بالحرص

اور ظاہر ہے کہ اس کے کمالات کی کوئی نہایت نہیں اس کی صفات کمال تو بے حد بے پایاں ہیں پس اگر بعض صفات کمالیہ کے مظاہر پیدا کئے جائیں اور بعض کے نہ پیدا کئے جائیں تو مقصد ناتمام رہتا ہے۔

انسان کی حیات علم قدرت سمع و بصر کو اپنی حیات کاملہ اور علم وسیع اور قدرت تامہ اور بے کم و کیف سمع و بصر کا مظہر اور تجلی گاہ بنایا اور ایک سخی اور کریم کے ہاتھ کو اپنی افضال اور الطاف کا مظہر بنایا۔ اسی طرح مناسب ہے کہ صفۃ ملکیہ اور حاکمیہ کا بھی کوئی مظہر پیدا کیا جائے۔ اس لئے کہ اس ذات عالی کا ایک نام ملک اور ملیک مقتدر بھی ہے۔ کما قال تعالیٰ:

﴿يُسَبِّحُ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ الْمَلِكِ

اَلْقُدُّوْسِ الْعَزِیْزِ الْحَکِیْمِ ﴿۱﴾

ترجمہ: ”تمام آسمان اور زمین کی چیزیں ایسے خدا کی تسبیح پڑھتی ہیں کہ جو بادشاہ اور پاک اور غالب اور حکمت والا ہے۔“

﴿تَبٰرَکَ الَّذِیْ بِیَدِهِ الْمُلْکُ وَهُوَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرُ ۝﴾ ۲

ترجمہ: ”مبارک ہے وہ ذات کہ جس کے ہاتھ میں تمام جہانوں کی بادشاہی ہے اور وہ ہر شئے پر قادر ہے۔“

﴿فَسُبْحٰنَ الَّذِیْ بِیَدِهٖ مَلَکُوْتُ کُلِّ شَیْءٍ وَّاِلَیْهِ تُرْجَعُوْنَ ۝﴾ ۳

ترجمہ: ”پاک ہے وہ ذات کہ جس کے ہاتھ میں ہر چیز کی حکومت ہے اور اسی کی طرف تم لوٹائے جاؤ گے۔“

غرض یہ کہ جب خداوند عالم تمام عالم کا بادشاہ اور احکم الحاکمین ٹھہرا تو اس کے ساتھ سلطنت اور بادشاہت کے لوازم بھی ہونے چاہئیں اس لئے کہ کوئی شئے بدون لوازم کے مکمل نہیں ہوتی۔

اور ظاہر ہے کہ جب سلطنت ہوتی ہے تو اس کے لئے ایک دارالسلطنت اور پایہ تخت بھی ہوتا ہے وزراء اور حکام بھی ہوتے ہیں تمام وزراء پر ایک وزیر اعظم بھی ہوتا ہے انتظام مملکت کے لئے پولیس ہوتی ہے۔ اعداء سلطنت سے مقابلہ کے لئے فوج اور لشکر بھی ہوتا ہے مجرموں کے لئے جیل خانہ اور خیر خواہان سلطنت اور ارکان دولت کے لئے دربار عام اور دربار خاص بھی ہوتا ہے۔

مجرموں کے جرم کے تفاوت سے جیل خانہ کی سزا اور میعاد میں فرق ہوتا ہے چوری اور زنا کے مجرم دو چار سال کے لئے جیل خانہ بھیج دیئے جاتے ہیں اور اعداء

۱ القرآن:۶۲/۱ ۲ القرآن:۶۷/۱ ۳ القرآن:۳۶/۸۳

سلطنت اور باغیان حکومت کے لئے حبس دوام اور سزائے موت کا حکم ہوتا ہے۔

حکام میں فرق مراتب ہوتا ہے ایک حاکم اپنے ماتحت حاکموں کے احکام بدل سکتا ہے ان کے فیصلے منسوخ کرسکتا ہے مگر وزیراعظم کے فیصلہ کو کوئی حاکم اور کوئی وزیر منسوخ نہیں کرسکتا الا یہ کہ بادشاہ ہی اپنے فیصلہ کو منسوخ کرے تو کرے ورنہ اور کوئی ایسا نہیں کہ جو اس کے فیصلہ کو منسوخ کرسکے۔

ٹھیک اسی طرح اس احکم الحاکمین نے اپنی شان ملکیت ظاہر کرنے کے لئے ایک پایہ تخت یعنی عرش پیدا فرمایا اور نظام عالم کے لئے حضرات انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کو مسند وزارت پر بٹھلایا۔ اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو تمام وزراء کا وزیراعظم بنا کر مسند صدارت پر بٹھلایا۔ اور ان وزراء کے واسطہ سے اپنے احکام اور فرامین سے خلقت کو آگاہ کیا۔ اور احکام شاہی کی نہ تعمیل کرنے والوں کے لئے ایک جیل خانہ بنایا جس کا نام جہنم ہے۔

﴿وَجَعَلْنَا جَهَنَّمَ لِلْكٰفِرِيْنَ حَصِيْرًا ۝﴾ [1]

ترجمہ: ”اور ہم نے جہنم کافروں کے لئے قید خانہ بنایا۔“

جو شخص بادشاہ کی حکومت اور وزراء کی وزارت مان کر پھر سلطانی احکام میں تقصیر کرتا ہے تو اس کے لئے یہ جیل خانہ چند روزہ ہے اور جو شخص بادشاہ یعنی خدا کی حکومت اور وزراء (انبیاء و رسل) کی وزارت (رسالت و نبوت) ہی تسلیم نہیں کرتا حکومت اور اس کے وزراء سے مقابلہ کرتا ہے تو اس کے لئے سوائے قتل یا حبس دوام کے کوئی سزا نہیں پہلی مثال اس گنہگار مسلمان کی ہے کہ جو خدا اور اس کے رسول کو مانتا ہے مگر ان کی پوری اطاعت نہیں کرتا۔ اور دوسری اس کافر کی ہے کہ جو سرے سے خدا یا اس کے رسول ہی کو نہیں مانتا۔ اور رعایا کی نگرانی کے لئے ایک خفیہ محکمہ بھی قائم فرمایا کہ اس محکمہ کے دو آدمی ہر وقت ہر انسان پر مسلط رہتے ہیں انسان جو کچھ کرتا ہے وہ اس کو لکھتے

[1] القرآن: ۸/۱۷

رہتے ہیں اور اس کو خبر نہیں۔ قال تعالیٰ:

﴿وَاِنَّ عَلَيْكُمْ لَحٰفِظِيْنَ ۝ كِرَامًا كَاتِبِيْنَ ۝ يَعْلَمُوْنَ مَا تَفْعَلُوْنَ ۝﴾ [1]

ترجمہ: ”بے شک تمہارے اوپر فرشتے نگہبانی کرنے والے محترم باعزت اعمال کے لکھنے والے مسلط ہیں جو کرتے ہو وہ جانتے ہیں۔“

اور قیامت کے دن جب مقدمات پیش ہوں گے اس وقت آپ کے یہ تمام کارنامے جو خدائی خفیہ (یعنی کراماً کاتبین) نے قلم بند کئے تھے وہ آپ کے سامنے ڈال دیئے جائیں گے۔ کما قال تعالیٰ:

﴿وَنُخْرِجُ لَهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ كِتٰبًا يَّلْقٰهُ مَنْشُوْرًا ۝ اِقْرَاْ كِتٰبَكَ ۭ كَفٰى بِنَفْسِكَ الْيَوْمَ عَلَيْكَ حَسِيْبًا ۝﴾ [2]

ترجمہ: ”قیامت کے دن اس کے سامنے ایک کتاب (نامہ اعمال) نکالیں گے جس کو وہ کھلا ہوا پائے گا اور اس سے یہ کہا جائے گا کہ اپنے اعمال کی کتاب پڑھ لو آج تمہاری ذات حساب لینے کے لئے کافی ہے۔“

﴿يُنَبَّؤُا الْاِنْسَانُ يَوْمَئِذٍۢ بِمَا قَدَّمَ وَاَخَّرَ ۝﴾ [3]

ترجمہ: ”اس دن انسان کو اگلے اور پچھلے کی سب خبر دے دی جائے گی۔“

﴿وَاِذَا النُّفُوْسُ زُوِّجَتْ ۝ وَاِذَا الْمَوْءٗدَةُ سُئِلَتْ ۝ بِاَيِّ ذَنْۢبٍ قُتِلَتْ ۝ وَاِذَا الصُّحُفُ نُشِرَتْ ۝﴾ [4]

ترجمہ: ”اور جس وقت جانیں بدنوں کے ساتھ ملا دی جائیں گی، اور

---

[1] القرآن: ۸۲/۱۰، ۱۱، ۱۲ — [2] القرآن: ۱۷/۱۳، ۱۴

[3] القرآن: ۷۵/۱۳ — [4] القرآن: ۸۱/۷ تا ۱۰

جس وقت زندہ درگور لڑکی سے پوچھا جائے گا، کہ تو کس گناہ میں قتل کی گئی، اور جس وقت اعمال نامے پھیلائے جائیں گے۔"

اور چونکہ اس کا کوئی دشمن نہ تھا اس لئے خود اپنے لئے ایک دشمن یعنی شیطان پیدا کیا اور اس کو ایک عظیم فوج بھی عطا کی۔ کما قال تعالیٰ:

﴿إِنَّ الشَّيْطٰنَ كَانَ لِلرَّحْمٰنِ عَصِيًّا﴾ [1]

ترجمہ: "شیطان بے شک خدا کا نافرمان ہے۔"

﴿وَكَانَ الشَّيْطٰنُ لِرَبِّهٖ كَفُوْرًا﴾ [2]

ترجمہ: "اور شیطان اپنے پروردگار کا ناشکرا ہے۔"

﴿أُولٰٓئِكَ حِزْبُ الشَّيْطٰنِ﴾ [3]

ترجمہ: "یہی لوگ شیطان کے گروہ ہیں۔"

اور شیطان اور اس کی فوج کے مقابلہ کے لئے ایک لشکر ملائکہ کا پیدا فرمایا۔

کما قال تعالیٰ: ﴿وَلِلّٰهِ جُنُوْدُ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ﴾ [4]

ترجمہ: "اللہ ہی کے لئے لشکر ہیں آسمانوں کے اور زمینوں کے۔"

﴿وَمَا يَعْلَمُ جُنُوْدَ رَبِّكَ إِلَّا هُوَ﴾ [5]

ترجمہ: "اللہ کے لشکروں کو اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا۔"

﴿وَإِنَّ جُنْدَنَا لَهُمُ الْغَالِبُوْنَ﴾ [6]

ترجمہ: "ہمارا ہی لشکر غالب ہے۔"

الحاصل شان ملکیت ظاہر کرنے کے لئے ایک پایۂ تخت یعنی عرش عظیم پیدا فرمایا اور جس طرح قصر سلطانی اور باب عالی کے لئے کچھ مخصوص دربان ہوتے ہیں۔ اسی طرح اس احکم الحاکمین نے اپنے پایۂ تخت کی دربانی کے لئے اپنے عظیم لشکر سے چند

[1] القرآن: ۱۹/۴۴ [2] القرآن: ۱۷/۲۷ [3] القرآن: ۵۹/۱۹
[4] القرآن: ۴۸/۴ [5] القرآن: ۷۴/۳۱ [6] القرآن: ۳۷/۱۷۳

فرشتوں کو منتخب فرمایا۔ کما قال تعالیٰ:

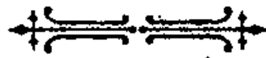
﴿وَتَرَى الْمَلَائِكَةَ حَافِّينَ مِنْ حَوْلِ الْعَرْشِ يُسَبِّحُونَ بِحَمْدِ رَبِّهِمْ﴾ [۱]

تَرْجَمَہ: ”اور اے مخاطب تو فرشتوں کو دیکھے گا کہ وہ عرش کو گھیرے ہوئے ہوں گے اور خدا کی تسبیح اور تحمید پڑھتے ہوئے ہوں گے۔“

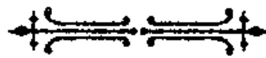
سبحان ربك رب العزة عما يصفون وسلام على المرسلين والحمد لله رب العالمين.

خمسہ [۲] ظفر بر قصیدہ حکیم سنائی رحمہ اللہ تعالیٰ

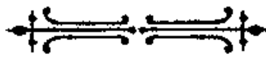
پئے دنیا یونہی بک بک کے عبث جان کھپائی
نہ دیا منزل عقبیٰ مجھے رستہ دکھائی
مگر اب جی میں ہے سب چھوڑ کر یہ ہرزہ درآئی



ملکا ذکر تو گویم کہ تو پاکی و خدائی
نروم من بجز آں رہ کہ توآں رہ بنمائی



نہ پھروں عہد سے جب تک مرے دم میں رہے دم
رہوں پیمان محبت پہ ترے میں یونہی محکم
طلب وصل تری دل سے مرے ہو نہ کبھی کم

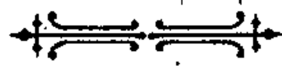


---

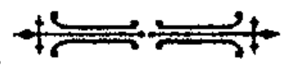
[۱] القرآن: ۳۹/۷۵

[۲] یہ اس لئے نقل کیا ہے کہ کبھی کبھی ذوق وشوق سے اس کو پڑھ لیا کرے کہ توبہ ومناجات وتوحید پر مشتمل ہے۔ منہ ۱۲

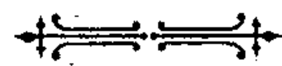
ہمہ درگاہ تو جویم ہمہ درکار تو پویم
ہمہ توحید گویم کہ بتوحید سزائی



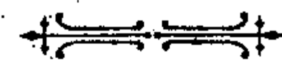
نہ چپ وراست سے گر ہووے تری نصرت و یاری
نہ ترا عرش سے تا فرش اگر فیض ہو جاری
نہ کہے کیونکہ خدا یا یہ خدائی تجھے ساری



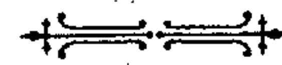
تو خداوند یمینی تو خداوند یساری
تو خداوند زمینی تو خداوند سمائی



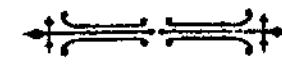
نظر آتی ہے جہاں میں سفیدی و سیاہی
قلم صنع پہ دے ہے ترے دن رات گواہی
تری یکتائی مبرا ہے ہر اک شئے سے الٰہی



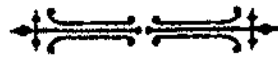
تو زن و جفت نہ جوئی تو خور وخفت نخواہی
احدا بے زن و جفتی ملکا کام روائی



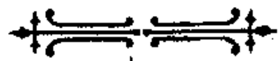
نہ پرستش کا تو محتاج نہ محتاج عبادت
نہ عنایت تجھے درکار کسی کی نہ حمایت
نہ شراکت ہے کسی کی نہ کسی کی ہے فراست



نہ نیازت بولادت نہ بفرزند تو حاجت
تو جلیل الجبروتی تو امیر الامرائی



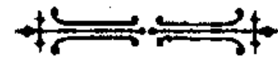
جسے تو چاہے امیری دے جسے چاہے فقیری
جسے تو چاہے بزرگی دے جسے چاہے حقیری
کرم و عفو سے کیونکر نہ کرے عذر پذیری



توکریمی تو رحیمی تو سمیعی تو بصیری
تو معزی تومذلی ملک العرش بجائی[۱]



گنہ و جرم پہ بھی کرتا ہے تو رزق رسانی
ترے الطاف سے محروم نہ میخوار نہ زانی
کہ تو ستار ہے اور واقف اسرار نہانی



ہمہ راعیب تو پوشی ہمہ راعیب تو دانی
ہم را رزق رسانی کہ تو باجود و عطائی

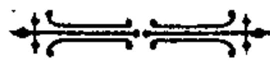


خرد وفہم سے گردل نے کوئی بات تراشی
کہ ہوا اول و آخر کی حقیقت کا تلاشی
میرے نزدیک سوا اس کے ہے سب سمع خراشی

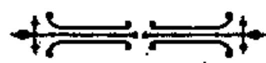


۱۔ العلائی

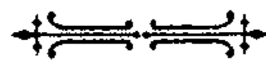
نہ بدی خلق تو بودی نہ بود خلق تو باشی
نہ تو خیزی نہ نشینی نہ تو کاہی نہ فزائی



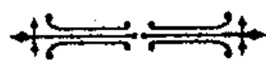
رہی مصروف ثنا میں ترے ہر چند خلائق
نہ ادا پر وہ ثنا ہو جو ثنا ہے ترے لائق
کہ وہ فوق اور ہے جس فوق سے ہے سب پہ تو فائق



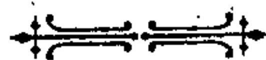
نہ سپہری نہ کواکب نہ بروجی نہ دقائق
نہ مقامی نہ منازل نہ نشینی نہ بپائی



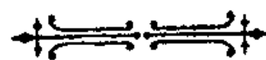
رہ توصیب تری رکھتی نہایت ہے درازی
نہ لگے ہاتھ یہ کوچہ تری بے بندہ نوازی
نہ چلے کنہ حقیقت میں تری نکتہ طرازی



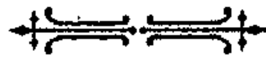
بری از چوں و چرائی بری از عجز و نیازی
بری از صورت و رنگی بری از عیب و خطائی



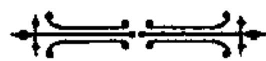
نہ تجھے دوست کی حاجت ہے نہ اندیشہ دشمن
نہ تجھے کام ہے عشرت سے نہ شیوہ ترا شیون
نہ تجھے چاہئے ماوی نہ تجھے چاہئے مسکن



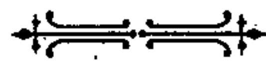
بری از خوردن و خفتن بری از تہمت مردن
بری از بیم و امیدی بری از رنج و بلائی



نہ رہا عالم طفلی و جوانی ہوئی پیری
غم دنیا کی ہوس میں مجھے رہے گی یہ اسیری
نہ روا رکھ میرے حق میں تو یہ خواری و حقیری



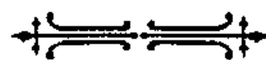
تو علیمی تو حکیمی تو خبیری تو بصیری
تو نماینده فضلی تو سزا وار خدائی



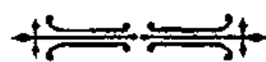
ترے اوصاف بیان کرنے کی باندھی ہے جو دُھن جی
دم تقریر ہے گونگی دم تحریر ہے لنجی
مری گو نوک زبان گنج معانی کی ہے کنجی



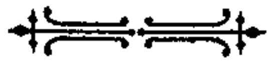
نہ تواں وصف تو گفتن کہ در و صف نہ گنجی
نتواں شرح تو کردن کہ تو درشرح نیائی



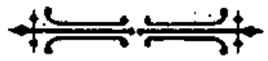
نہ بصر کو ہے قدرت کہ تری دیکھے تجلی
نہ خرد کو ہے یہ طاقت کہ تجھے پائے ذرا بھی
متحیر ہوں میں اس میں کہ صفت کیا کروں تری



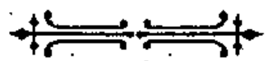
احدٌ[1] لیس کمثلی صمد لیس کفھلی
لمن الملک تو گوئی کہ سزا وار خدائی



ظفر اس وقت میں خاموش ہو کیا غنچہ کی مانند
کہ یہ اشعار مناجات کے یاد آئے اسے چند
کرے توصیف میں کس طرح تری اپنی زباں بند



لب و دندان سنائی ہمہ توحید تو گویند
مگر از آتش دوزخ بودش زود رہائی



ضرورت بعثت حضرات انبیاء کرام علیہم السلام

قال اللّٰہ تعالٰی: ﴿يَاۤاَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَآءَتْكُمْ مَّوْعِظَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَشِفَآءٌ لِّمَا فِى الصُّدُوْرِ وَهُدًى وَّرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ﴾[2]

ترجمہ: ''اے لوگو تحقیق آئی تمہارے پاس نصیحت تمہارے رب کی طرف سے جو شفا ہے سینوں کے لئے اور ہدایت اور رحمت مؤمنوں کے لئے۔''

ہم جب اس عالم عناصر پر نظر ڈالتے ہیں تو طرح طرح کی بیماریاں اور قسم قسم کے امراض نظر آتے ہیں کوئی طبقہ ایسا نہیں کہ جو ہر قسم کی بیماری سے پاک ہو۔ ایسی

[1] از لفظ احد تا لمن الملک مفعول ست مر فعل گوئی کہ کسے مثل من نیست الخ۔ منہ ۱۲

[2] القرآن: ۱۰/۵۷

حالت میں ایک حاذق طبیب کی ضرورت محسوس ہوتی ہے کہ جوان مریضوں کا علاج کردے۔ طبیب مریض کی حالت اور موسم کی حرارت و برودت اور ملک کی آب ہوا کو دیکھ کر نسخہ تجویز کرتا ہے۔

مریض طبیب کے علاج سے جب ہی صحت یاب ہوسکتا ہے کہ جب اس مریض کا مرض حد یاس وناامیدی تک نہ پہنچ چکا ہو۔ اور اگر مریض نا قابل علاج ہو چکا ہے جنون اور دق اور سل جیسے امراض میں مبتلا ہو چکا ہے تو اس کے لئے طبیب کا علاج مفید نہیں پڑتا۔ کوئی مریض جب مرض کی شدت میں مبتلا ہوا اپنے احباب و اقارب سے مخاطب ہو کر یہ کہے کہ مجھ کو کسی طبیب کی حاجت نہیں میں خود اپنے لئے نسخۂ صحت تجویز کرسکتا ہوں تو آپ ہی انصاف فرمایئے کہ اس کے احباب و اقارب اس کی اس رائے کو کس درجہ وقیع خیال کریں گے بلکہ اس کی رائے کو بھی آثار مرض میں سے ایک اثر سمجھیں گے لہٰذا جس طرح یہ عالم اجسام طرح طرح کی امراض و آلام میں مبتلا رہتا ہے عالم ارواح اس سے کہیں زائد قسم قسم کے علل واسقام میں مبتلا رہتا ہے عالم عناصر میں بخار اور طاعون کی اتنی کثرت نہیں جتنی کہ چوری، زنا کاری، ظلم و تعدی، بغض و عداوت، کینہ وحسد، کذب وخیانت ان روحانی امراض کی کثرت ہے۔

پس جس طرح جسمانی مریض کا یہ کہنا کہ میں خود اپنے لئے اور دوسرے مریضوں کے لئے بھی نسخۂ صحت تجویز کرسکتا ہوں، ایک کھلی نادانی ہے۔ اسی طرح کسی روحانی مریض کا یہ کہنا کہ میں خود اپنے لئے اور دوسروں کے لئے نسخۂ ہدایت تجویز کر سکتا ہوں، اہل عقل کے نزدیک یہ نادانی گزشتہ نادانی سے کسی طرح کم نہیں جب وہ ایک جسم کثیف محسوس ومبصر کا کہ جو ہر وقت اس کی نظروں کے سامنے ہے، علاج نہیں کرسکتا تو روح جو کہ ایک جوہر لطیف ہے جس کی حقیقت اور اوصاف کا معلوم کرنا حیطۂ عقل سے باہر ہے اس کا علاج اس سقیم الروح سے کسی طرح ممکن ہے۔

مریض اگر صحت یاب ہونا چاہتا ہے تو اس کے لئے بجز اس کے اور کوئی صورت

نہیں کہ طبیب جب کسی دوا یا غذا کے مفید اور موزوں ہونے کا فتویٰ دے اس کو بے چوں و چرا تسلیم کر لے خواہ اس دوا یا غذا کی خواص اور کیفیتیں اس کو معلوم ہوں یا نہ ہوں حتیٰ کہ اگر طبیب اس کو ایسی دوا دے کہ جس کے نام سے بھی صحیح طور پر آشنا نہ ہو تو مریض کے لئے یہی مناسب ہے کہ وہ دوا خواہ اس کی طبیعت اس سے رغبت کرتی ہو یا نفرت اس کا استعمال کرے۔

الحاصل جس طرح جسمانی مریضوں کے لئے اس کی ضرورت ہے کہ سلطنت کی جانب سے ان مریضوں کے لئے شفاخانے قائم کئے جائیں۔ اور اطباء کو ان کے علاج کے لئے معین کیا جائے۔ اسی طرح ضرورت کہ اس احکم الحاکمین کی جانب سے ان روحانی امراض کے لئے روحانی طبیب بھیجے جائیں تا کہ ان روحانی مریضوں کا علاج فرمائیں اور ان کو ابدی ہلاکت سے بچائیں۔

ہاں اگر یہ روحانی مریض یاس کی حد کو پہنچ چکے ہوں تو اس وقت ان روحانی اطباء کے نسخۂ ہدایت سے ان روحانی مریضوں کو نفع نہ ہوگا۔

كما قال تعالىٰ: ﴿إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا سَوَاءٌ عَلَيْهِمْ ءَأَنذَرْتَهُمْ أَمْ لَمْ تُنذِرْهُمْ لَا يُؤْمِنُونَ ۝﴾ [1]

تَرجَمَہ: ”جو لوگ اللہ کے علم میں کافر ہیں برابر ہے کہ آپ ان کو ڈرائیں یا نہ ڈرائیں وہ ایمان نہ لائیں گے۔“

اور روحانی امراض جب حالت یاس کو پہنچ جاتے ہیں تو لسان شریعت میں اس حالت کو ختم، طبع، رین سے تعبیر کرتے ہیں۔ ایسی حالت میں اگر نسخۂ ہدایت سے ان کو فائدہ نہ ہو تو اس سے نسخۂ ہدایت یا اس طبیب حاذق کا کوئی نقص خیال نہیں کیا جا سکتا شریعت میں انہی روحانی اطباء کو انبیاء و رسل علیہم السلام کہتے ہیں۔

حجۃ الاسلام امام غزالی متعنا اللہ بعلومہ و برکاتہ آمین۔ ”المنقذ من

[1] القرآن: ۲/۶

الضلال" میں فرماتے ہیں:

"ثم انی لما واظبت علی العزلة والخلوة قریبا من عشر سنین وبان لی فی اثناء ذلك علی الضرورة من اسباب لا احصیها مرة بالذوق ومرة بالعلم البرنی ومرة بالقبول الایمانی ان الانسان خلق من بدن وقلب واعنی بالقلب حقیقة روحه التی هی محل معرفة اللّٰه تعالٰی دون اللحم والدم الذی یشارك فیه المیت والبهیمة وان البدن له صحة بها سعادته ومرض فیه هلاکه وان القلب کذلك له صحة وسلامة ولا ینجو الا مَنْ اتی اللّٰه بقلب سلیم وله مرض فیه هلاکه الا بدی الاخروی کما قال تعالٰی فی قلوبهم مرض وان الجهل باللّٰه سم مهلك وان معصیة اللّٰه تعالٰی بمتابعة الهوی داءه الممرض وان معرفة اللّٰه تعالٰی تریاقه الحی وطاعته بمخالفة الهوی دواءه الشافی وانه لا سبیل الی معالجة بازالة مرضه وکسب صحبته الا بأدویة کما لا سبیل الی معالجة البدن الا بذلك وکما لان ادویة البدن تؤثر فی کسب الصحة بخاصیة فیها لا یدرکها العقلاء ببضاعة العقل بل یجب فیها تقلید الاطباء الذین اخذوها من الانبیاء الذین اطلعوا بخاصیة النبوة علی خواص الاشیاء فکذالك بان لی علی الضرورة ان ادویة العبادات بحدودها ومقادیرها المحدودة المقدرة من جهة الانبیاء لا یدرك وجه تاثیرها ببضاعة عقل

العقلاء بل يجب فيها تقليد الانبياء الذين ادركوا تلك الخواص بنور النبوة لا ببضاعة العقل وكما ان الادوية تركبت من النوع والمقدار فبعضها ضعف البعض فى الوزن والمقدار فلا يخلوا اختلاف مقاديرها عن سرهو من قبيل الخواص فكذلك العبادات التى هى ادوية داء القلوب مركبة من افعال مختلفة النوع والمقدار حتى ان السجود ضعف الركوع وصلاة الصبح نصف صلاة العصر فى المقدار فلا يخلوا عن سر من الاسرار هو من قبيل الخواص التى لا يطلع عليها الابنور النبوة فقد تحامق وتجاهل جدا من اراد ان يستنبط بطريق العقل لها حكمه اوظن انها ذكرت على الاتفاق لا عن سر الهى وكما ان فى الادويه اصولا هى اركانها وزوائد هى متمماتها لكل واحد منها خصوص تاثير فى اعمال اصولها كذلك النوافل والسنن متممات لتكميل آثار اركان العبادات وعلى الجملة فالانبياء اطباء امراض القلوب انتهى“

تَرجَمہ: ”مجھ کو دس سال کی خلوت اور عزلت سے یہ بات معلوم ہوئی اور بالبداہت اس کا بے شمار اسباب سے انکشاف ہو گیا اور وہ اسباب احاطہ سے باہر ہیں، کبھی ذوق اور وجدان سے اور کبھی دلیل و برہان سے اور کبھی ذوق ایمان سے یہ بات معلوم ہوئی کہ انسان بدن اور قلب سے مرکب ہے اور قلب سے وہ حقیقت روحانیہ مراد ہے کہ جو معرفت ربانی کا محل ہے قلب سے یہ مضغہ لحم و دم مراد نہیں جس میں مردے اور بہائم بھی

شریک ہیں اور جس طرح بدن کے لئے صحت و مرض ہے اسی طرح قلب کے لئے بھی صحت و مرض ہے اور صحت و سلامتی بھی ہے نجات وہی شخص پائے گا جو اللہ کے پاس قلب سلیم لے کر آئے گا اور صحت کی طرح قلب کے لئے مرض بھی ہے کہ جس میں اس کی ابدی ہلاکت ہے جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ان کے دلوں میں مرض ہے۔ خدا ہی سے بے خبر ہونا سم قاتل ہے اور بمقتضائے ہوائے نفسانی اللہ کی نافرمانی کرنا یہ قلب کی بیماری ہے جو قلب کو مریض کر دیتی ہے اور معرفت الٰہی اس کا تریاق ہے کہ جو حیات بخشتا ہے اور اس کی اطاعت و فرمانبرداری قلب کے لئے دواء شافی ہے اور امراض قلبیہ کے علاج کی صرف یہ صورت ہے کہ اول اس کے امراض کا ازالہ کیا جائے اور پھر ادویہ نافعہ سے صحت حاصل کی جائے جیسا کہ بدن کا علاج بھی اسی طرح ہوتا ہے اور جس طرح دواؤں کا صحت میں موثر ہونا عقل سے معلوم نہیں ہو سکتا بلکہ اس میں اطبا اور حکماء کی تقلید ضروری ہے کہ جنہوں نے اس شئے کو انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام سے لیا اور انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کو ان چیزوں کے خواص نور نبوت سے معلوم ہوئے ہیں پس اسی طرح عبادات کا خاص طریقہ اور خاص مقدار کے ساتھ امراض قلبیہ کے لئے دواء شافی اور مفید صحت ہونا اس کی وجہ بھی عقل سے معلوم نہیں ہو سکتی بلکہ انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کا اتباع ضروری ہے کہ جنہوں نے نور نبوت سے ان چیزوں کے خواص معلوم کئے ہیں نہ کہ عقل سے۔ اور جس طرح دواؤں کا مختلف النوع والمقدار اور مختلف الاوزان چیزوں سے مرکب ہونا خالی از حکمت نہیں اسی طرح عبادات کا کہ جو امراض قلبیہ کی دوا ہیں ان کا بھی مختلف النوع اور مختلف المقدار افعال سے مرکب ہونا مثلاً سجود کا رکوع سے دو چند ہونا اور نماز صبح کا نماز

عصر سے نصف ہونا خالی از حکمت نہیں اس کا علم صرف نور نبوت سے ہو سکتا ہے اور جو شخص ان چیزوں کے اسرار و حکم عقل سے مستنبط کرنا چاہے یا ان کو محض اتفاقی اور خالی از حکمت سمجھے تو وہ سخت احمق اور جاہل ہے اور جس طرح دواؤں کے کچھ اصول و ارکان ہیں اور کچھ مکملات اور ہر ایک کا خاص اثر ہے اسی طرح سنن و نوافل ارکان عبادات کی متمم اور مکمل ہیں۔ الحاصل باطنی اور روحانی امراض کے اطباء انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام ہیں۔"

نسخ احکام خلاف عقل نہیں

اور جس طرح زمان و مکان اور حالات مریض کے مختلف ہونے سے نسخہ اور اس کی مقدار کا بدلنا خلاف عقل نہیں بلکہ عین حکمت ہے۔ اسی طرح اختلاف امم اور اختلاف ازمنہ اور امکنہ کی بناء پر احکام شرعیہ میں بھی تغیر و تبدل کا ہونا خلاف عقل نہیں بلکہ عین حکمت ہے بسا اوقات چند مریض ایک ہی مرض میں مبتلا ہوتے ہیں مگر طبیب ان کے حالات کو مدنظر رکھ کر دواؤں کی مقدار میں فرق کر دیتا ہے۔ مثلاً ایک بچہ اور ایک جوان اور ایک بوڑھا تینوں ایک ہی مرض کے مریض ہیں مگر طبیب دوائیں مختلف المقدار تجویز کرتا ہے۔

دین ایک ہے اور شریعتیں مختلف

الحاصل تینوں کا مرض ایک ہے اور علاج بھی ایک اور دوا بھی ایک صرف اختلاف مزاج اور اختلاف طبائع کی بناء پر مقدار ادویہ میں فرق کر دیا گیا۔

اسی طرح تمام انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام کا دین ایک ہے سب ایک ہی اصل پر متفق ہیں۔ اختلاف زمان و مکان اور اختلاف حالات کی وجہ سے اسی ایک دین اور ایک اصل کی صورتیں اور شکلیں اور طریقے مختلف ہوتے رہے۔ اس لئے کہ

دین کی حقیقت یہ ہے کہ خدا کو وحدہ لاشریک لہ سمجھنا ذات وصفات کے اعتبار سے بے مثل اور یکتا ماننا راحت وتکلیف سراً وضراً عیش ونشاط، انقباض وانبساط ہر حال میں اسی کو پکارنا، اسی کے سامنے سر جھکانا، اس کی راہ میں جان و مال سے دریغ نہ کرنا، قیامت اور حشر ونشر جنت وجہنم کو حق سمجھنا اس کے نافرمانوں پر حدود وتعزیرات کا قائم کرنا اس کے دشمنوں سے جہاد کرنا اس کے احکام اور فرامین کی نشر واشاعت میں پوری پوری کوشش کرنا یہ ہے حقیقت دین کی جس پر تمام انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام متفق رہے ان امور میں کسی کا خلاف نہیں ہوا۔

کما قال تعالیٰ: ﴿شَرَعَ لَكُمْ مِّنَ الدِّيْنِ مَا وَصّٰى بِهٖ نُوْحًا وَّالَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ وَمَا وَصَّيْنَا بِهٖٓ اِبْرٰهِيْمَ وَمُوْسٰى وَعِيْسٰٓى اَنْ اَقِيْمُوا الدِّيْنَ وَلَا تَتَفَرَّقُوْا فِيْهِ ۭ﴾[1]

ترجمہ: ”حق تعالیٰ نے تمہارے لئے وہ دین تجویز فرمایا کہ جس کا نوح کو حکم دیا اور جس کی وحی آپ کی طرف بھیجی اور جس کا ہم نے ابراہیم اور موسیٰ اور عیسیٰ کو حکم دیا کہ دین کو قائم رکھو اور اس میں متفرق نہ ہو۔“

اختلاف اگر ہوا تو وہ صرف امور مذکورہ کی صورتوں اور شکلوں میں ہوا جیسا کہ شریعت موسویہ میں بیت المقدس کی جانب نماز پڑھی گئی اور شریعت محمدیہ میں خانہ کعبہ کی طرف، اصل نماز میں دونوں شریعتیں متفق ہیں۔ اختلاف صرف کیفیت ادا میں ہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی شریعت میں زانی کا حکم صرف رجم (سنگسار کر دینا) تھا اور ہماری شریعت میں زانی محصن کیلئے رجم اور غیر محصن کے لئے سو تازیانے ہیں۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی شریعت میں صرف قصاص کا حکم تھا اور ہماری شریعت میں قصاص بھی ہے اور دیت بھی۔

اور انہی خاص صورتوں اور خاص شکلوں کا نام شریعت اور منہاج ہے۔

---

[1] القرآن: ۴۲/۱۳

وقال تعالٰی: ﴿لِكُلٍّ جَعَلْنَا مِنكُمْ شِرْعَةً وَّمِنْهَاجًا﴾[1]
ترجمہ: ”ہر ایک کے لئے ہم نے ایک شریعت اور طریق بنایا۔“
چنانچہ عارف رومی قدس سرہ السامی فرماتے ہیں ؎

چوں بصورت بنگری چشمت دواست
تو بنورش در نگرکاں یکتواست

ترجمہ: ”اور اگر صورت کو دیکھو تو آنکھیں دو ہیں اور اگر نور کو دیکھو تو ایک ہی ہے۔“

لاجرم بر یکے افتد نظر
آں یکے بینی دوناید در بصر

ترجمہ: ”چنانچہ جب کسی چیز پر نظر پڑتی ہے تو ایک ہی نظر آتی ہے دو نہیں۔“

نور ہر دو چشم نتواں فرق کرد
چونکہ در نورش نظر انداخت مرد

ترجمہ: ”دونوں آنکھوں کے نور میں امتیاز اور تفریق ناممکن ہے۔ جب کہ اس میں کوئی تامل کرے۔“

دہ چراغ ار حاضر آید در مکان
ہر یکے باشد بصورت غیر آں

ترجمہ: ”دس چراغ اگر کسی مکان میں رکھ دیئے جائیں تو صورت ہر ایک کی مختلف ہے۔“

فرق نتواں کرد نور ہر یکے
چوں بنورش روئے آری بیشکے

[1] القرآن: ۵/۴۸

ترجمہ: ”لیکن ایک چراغ کے نور کو دوسرے چراغ کے نور سے ممتاز اور علیحدہ نہیں کر سکتے۔“

اطلب المعني من الفرقان وقل
لانفرق بين احد من رسل

ترجمہ: ”پس ان تمثیلات سے حق تعالیٰ کے اس ارشاد کا مطلب سمجھو“

﴿لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهٖ﴾[1]

ترجمہ: ”کہتے ہیں کہ ہم جدا نہیں کرتے کسی کو اُس کے پیغمبروں میں سے۔“[2]

ہمارے اس مختصر بیان سے علاوہ نبوت ورسالت کی ضرورت کے یہ مسئلہ بھی بحمد اللہ تعالیٰ حل ہو گیا کہ احکام الٰہیہ میں نسخ وتبدیل کا جاری ہونا خلاف عقل نہیں۔ جیسے کہ حاذق طبیب کا کسی مریض کے لئے کبھی منضج تجویز کرنا اور کسی وقت مسہل اس کی حذاقت اور مہارت میں قادح نہیں۔

ایسے ہی احکام الٰہیہ میں باقتضاء حکمت کسی قسم کا نسخ بھی منافی نہیں۔ اور اگر آپ کو یہ سوال ہے کہ احکام الٰہی میں تغیر اور تبدل کیوں ہے اور اس کی کیا حکمت ہے تو ہم کو آپ سے یہ سوال ہے کہ افعال الٰہی میں تغیر اور تبدل کیوں ہے اور اس کی کیا مصلحت ہے۔ مثلاً دن کے بعد شب اور ایک موسم کے بعد دوسرا موسم اور طفولیت کے بعد شباب اور شباب کے بعد پیری کے آنے میں کیا حکمت ہے غالباً آپ یہی فرمائیں گے کہ حق تعالیٰ کا کوئی فعل حکمت اور مصلحت سے خالی نہیں گو ہمیں اس کی حکمت کا علم نہ ہو۔

﴿وَمَآ اُوْتِيْتُمْ مِّنَ الْعِلْمِ اِلَّا قَلِيْلًا.﴾[3]

---

[1] القرآن ۲/۲۸۵ [2] کذا فی الدفتر الاول: صفحہ ۵۸ [3] القرآن: ۱۷/۸۵

ترجمہ: ”تم کو کوئی علم نہیں دیا گیا مگر بہت قلیل۔“

﴿وَلَا يُحِيطُونَ بِشَيْءٍ مِّنْ عِلْمِهِ إِلَّا بِمَا شَآءَ﴾ [۱]

ترجمہ: ”وہ اس کے علم میں سے کسی ایک چیز کا بھی احاطہ نہیں کر سکتے مگر جس کا وہ چاہے۔“

اسی طرح ہم بھی یہ کہہ سکتے ہیں کہ حق تعالیٰ کا کوئی حکم خلاف حکمت نہیں ہوسکتا گو ہم قصور عقل کی وجہ سے اس کے اقوال واحکام کی حکم اور مصالح معلوم کرنے سے قاصر اور عاجز ہیں اور جب آپ یہ نہیں بتلا سکتے کہ اتنے ماہ موسم سرما اور اتنی مدت موسم گرما کیوں رہا، موسم سرما میں رات طویل اور دن قصیر اور موسم گرما میں اس کا بالعکس کیوں ہوا۔

تو ہم سے بھی اس سوال کا کوئی حق نہیں کہ کیا وجہ ہے کہ فلاں حکم شریعت موسویہ میں مشروع رہا۔ اور پھر شریعت عیسویہ میں آکر منسوخ ہوگیا اور علی ہذا جو حکم انبیاء سابقین صلوات اللہ وسلامہ علیہم اجمعین کی شریعت میں مشروع تھا وہ شریعت محمدیہ علی صاحبہا الف الف صلوۃ والف الف تحیۃ میں آکر کیوں بدل گیا۔

شریعت کی ضرورت اور تقسیم احکام اور عقل کا ناکافی ہونا

عالم میں جس طرف بھی نظر ڈالتے ہیں ایک عظیم اختلاف نظر آتا ہے ایک ہی فعل ہے کہ ایک شخص اس کو مستحسن اور دوسرا قبیح سمجھتا ہے اب نہ معلوم کہ حق تعالیٰ شانہ کے نزدیک وہ حسن ہے یا قبیح اور کونسی صورت خدا کے نزدیک پسندیدہ ہے اور کون سی ناپسندیدہ عقل اس سے بالکل قاصر ہے کہ ٹھیک ٹھیک کسی شئے کا حسن وقبح بتلا سکے اس لئے کہ ہر انسان کو صرف اپنی ہی اغراض پیش نظر ہوتی ہیں۔ دوسروں کی اغراض و مقاصد سے بے خبر ہوتا ہے اس لئے بہت ممکن ہے کہ غلبۂ ہوی اور حب غرض کی وجہ

[۱] القرآن: ۲/۲۵۵

سے کسی شئے کو مستحسن سمجھ کر واجب قرار دے اور خلاف غرض شئے کو قبیح سمجھ کر ناجائز اور حرام بتلائے اور دوسرا شخص اپنی غرض کی وجہ سے اس کا عکس سمجھے۔

نیز اس ظلوم وجہول انسان سے ایک ہی شئے کے تمام اطراف و جوانب اور اس کے تمام حالات کا احاطہ قطعاً محال ہے اس لئے کچھ بعید نہیں کہ کوئی شئے بعض حالات میں حسن ہو اور بعض حالات میں قبیح اور یہ شخص ایک جانب سے بے خبر ہونے کی وجہ سے دوسری جانب کو علی الاطلاق حسن یا قبیح بتلا دے نیز طبائع بشریہ اکثر اوہام کی مطیع ہوتی ہیں ان کی کسی تجویز کا آمیزش وہم سے بالکلیہ منزہ ہونا نہایت ہی دشوار ہے۔

جس مکان میں مردہ پڑا ہوا ہو اس مکان میں انسان شب گزارنے سے گھبراتا ہے حالانکہ اس کو یقین ہے کہ مردہ کسی قسم کی حس و حرکت نہیں کر سکتا لیکن یہ وہم ضرور ہے کہ ممکن ہے کہ اسی وقت یہ مردہ حس و حرکت کرنے لگے اور اٹھ کر مجھ کو چمٹ جائے۔

علامہ ابن خلدون فرماتے ہیں کہ عقل کی مثال اس ترازو کی سی ہے کہ جس سے سونا اور جواہرات تولے جائیں۔ اگر اس ترازو سے سونے چاندی کا وزن معلوم کرنا چاہو تو صحیح وزن معلوم کر سکتے ہو لیکن اگر اس ترازو سے پہاڑوں کو تولنا چاہو تو یہ ناممکن اور محال ہے۔

اسی طرح عقل سے اس کے دائرہ کی چیزیں معلوم ہو سکتی ہیں۔ لیکن اگر یہ چاہو کہ اس بے چاری اور کمزور عقل سے خداوند ذوالجلال کی ذات وصفات اور عالم غیب اور عالم ملکوت کی چیزوں کو معلوم کر لو تو یہ امر محال ہے۔ اور اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ عقل بے کار ہے ہاں یہ کہہ سکتے ہیں کہ بارگاہ قدس اور عالم غیب کی چیزوں کے ادراک اور معرفت میں قاصر اور درماندہ ہے۔ اپنے محدود دائرہ کی چیزوں کے معلوم کرنے کی صحیح میزان ہے اس میں بے کار نہیں جیسے سونے چاندی تولنے کی ترازو فی حد ذاتہٖ صحیح میزان اور صحیح ترازو ہے سونے اور چاندی کا وزن ٹھیک بتلاتی ہے لیکن اس

سے پہاڑوں کے وزن کا تصور کرنا حماقت ہے۔[1]

اور سائنس فقط ان امور کو بتلاتی ہے کہ جو عقل اور تجربہ سے حاصل ہوسکیں جیسے ریل گاڑی اور تار برقی۔ اس قسم کے علوم میں وحی اور الہام کی ضرورت نہیں تجربہ کافی ہے۔ اور نبوت ان کمالات علمیہ اور عملیہ کی رہنمائی کرتی ہے کہ جہاں عقل اور حس کی رسائی نہ ہو۔

چراغ بے شک ایک روشن چیز ہے مگر آفتاب کے سامنے اس کی کیا حقیقت ہے اسی طرح عقل بے شک ایک منور اور روشن شئے ہے مگر نور اور آفتاب نبوت کے سامنے اس کی کیا ہستی ہے کسی نے کیا خوب کہا ہے۔

مصطفیٰ اندر جہاں وانگہ کسے جوید زعقل
پیش مہر نور افشاں از سہا جوید ضیا

نیز حق تعالیٰ شانہ نے ہر حاسہ کی ایک حد[2] مقرر فرمائی ہے کہ اس حاسہ کا ادراک واحساس اس حد سے کسی طرح متجاوز نہیں ہوسکتا مثلاً آنکھ مبصرات کا احساس کرسکتی ہے مسموعات اور معقولات کا ادراک نہیں کرسکتی خلاصہ یہ کہ ہر حاسہ کا ادراک محدود اور متناہی ہے۔ غیر محدود اور غیر متناہی نہیں۔

اسی طرح انسان کی عقل محدود ہے اپنی حد سے زائد ادراک نہیں کرسکتی معاذ اللہ اگر عقل کا ادراک غیر محدود اور غیر متناہی ہوجائے تو پھر عقل کے ادراکات اور علوم اور حق تعالیٰ شانہ کے علوم وادراکات دونوں میں کیا فرق رہے۔ "معاذ اللہ" دونوں برابر ہوجائیں۔ قال تعالیٰ:

﴿وَمَآ اُوْتِيْتُمْ مِّنَ الْعِلْمِ اِلَّا قَلِيْلًا.﴾[3]

---

[1] مقدمہ ابن خلدون صفحہ ۲۵۰، بحث علم الکلام

[2] کما روی عن الامام الشافعی رحمہ اللہ تعالیٰ روح المعانی: جلد۱۲ صفحہ۱۳۲

[3] القرآن: ۸۵/۱۷

ترجمہ: ''اور نہیں دیئے گئے تم کو علم سے مگر تھوڑا۔''

﴿وَلَا يُحِيطُونَ بِشَيْءٍ مِّنْ عِلْمِهِ إِلَّا بِمَا شَاءَ﴾[1]

ترجمہ: ''اور نہیں احاطہ کر سکتے وہ کسی ایک چیز کا بھی مگر جتنا وہ چاہے۔''

محدود اور متناہی کا ادراک و احساس متناہی اور محدود ہی ہو سکتا ہے غیر محدود کیسے ہو سکتا ہے۔ انسان اگر سینہ سے سینہ بھی ملا دے اور چیر کر دل بھی دکھلا دے تب بھی دل کی بات دوسرے کو نہیں معلوم ہو سکتی۔

پس وہ لطیف و خبیر کہ جس کے ادراک سے ابصار اور بصائر سب ہی قاصر اور عاجز ہیں اس کی رضا اور عدم رضا بغیر اس کے بتلائے ہوئے کیسے معلوم ہو سکتی ہے۔

اور اگر بالفرض عقل سلیم سے کسی شئے کے متعلق معلوم بھی کر لیا کہ یہ شئے امر خداوندی یا نہی خداوندی کے لائق ہے لیکن اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ حق تعالیٰ شانہ اس کے پابند ہو جائیں۔ شان بے نیازی کے بنا پر اس کے خلاف بھی حکم صادر فرما سکتے ہیں۔

نیز ایک دو بات کا معلوم ہو جانا کچھ مفید نہیں تاوقتیکہ تفصیلی طور پر تمام امور کا علم نہ ہو اس لئے اس کے ارشاد اور حکم کا انتظار کرنا چاہئے اور یہ اس کی شان کے ہرگز مناسب نہیں کہ وہ اپنی مرضی اور غیر مرضی سے ہر کس و ناکس کو خود مطلع کرے۔

سلاطین عالم کو جب اس متاع قلیل اور حطام دنیا پر ناز ہے کہ وہ اپنے احکام ہر کس و ناکس سے نہیں کہتے پھرتے حالانکہ وہ انہیں کے ہم جنس اور ہم نوع ہیں بلکہ وزراء اور حکام کے ذریعہ سے اطلاع دیتے ہیں تو کیا اس احکم الحاکمین کی شان کے یہ مناسب ہو سکتا ہے کہ وہ ہر کس سے منہ لگائے۔ یقیناً وہ احکم الحاکمین بھی اپنے مقربین کے توسط سے اپنے قوانین اور احکام کی اطلاع دے گا۔ ایسے حضرات کو اہل اسلام انبیاء و رسل و پیغمبران خدا کہتے ہیں۔

اور جس طرح کہ حکام اور مقربین میں فرق مراتب ہوتا ہے۔ اسی طرح انبیاء و

---

[1] القرآن: ۲/۲۵۵

رسل کے مراتب و مدارج میں بھی تفاوت ہوتا ہے۔

کما قال تعالیٰ: ﴿تِلْكَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ ۘ مِنْهُمْ مَنْ كَلَّمَ اللّٰهُ وَرَفَعَ بَعْضَهُمْ دَرَجٰتٍ ۭ﴾[1]

تَرْجَمَۃ: ''ان سب رسولوں کو ہم نے فضیلت دی بعض کو بعض پر، بعض سے اللہ نے کلام فرمایا اور بعض کے درجے بلند کیے۔''

اور جس طرح حکام و وزراء کا سلسلہ وزیر اعظم پر منتہی اور مختتم ہو جاتا ہے۔ اسی طرح انبیاء و رسل کا سلسلہ بھی خاتم النبیین پر ختم ہو جاتا ہے۔ اور جس طرح وزارت عظمیٰ کا کوئی فیصلہ منسوخ نہیں ہوسکتا اسی طرح جب کسی حکم کا فیصلہ ختم نبوت کی بارگاہ سے صادر ہو چکا وہ تا قیامت منسوخ نہ ہو سکے گا۔

الحاصل: انبیاء علیہم السلام کی بعثت سے مقصد یہ ہوتا ہے کہ وہ لوگوں کو اس سے آگاہ کریں کہ بعض افعال ایسے ہیں کہ جو خدا کے نزدیک پسندیدہ ہیں اور بعض ایسے ہیں کہ جو ناپسندیدہ ہیں اور بعض ایسے ہیں کہ خدا ان کے کرنے سے نہ راضی ہوتا ہے اور نہ ناراض بندوں کو اختیار ہے کہ چاہیں کریں یا نہ کریں پس کسی فعل سے رضا یا عدم رضا کا تعلق ہونا یا دونوں سے بے تعلق ہونے کا نام حکم ہے جس فعل سے خدا کی رضا متعلق ہوتی ہے بندوں سے اس فعل کا مطالبہ کیا جاتا ہے اور وہ مطالبہ کبھی تاکیدی ہوتا ہے کہ اس کے کرنے پر رضا الٰہی اور ثواب مرتب ہوتا ہے اور نہ کرنے پر خدا کی ناخوشی اور عذاب مرتب ہوتا ہے۔ اور کبھی مطالبہ تاکیدی نہیں ہوتا اس امر مطلوب کے کرنے پر رضا اور ثواب تو حاصل ہوتا ہے مگر نہ کرنے پر کچھ ناخوشی اور عذاب نہیں ہوتا۔ اور جس فعل سے خدا کی ناخوشی اور ناراضی متعلق ہوتی ہے اس سے بندوں کو روکا جاتا ہے۔ اور جیسے مطالبہ کبھی تاکیدی ہوتا ہے اور کبھی غیر تاکیدی ایسی ہی ممانعت کبھی تاکیدی ہوتی ہے کہ اس سے رکنے اور بچنے کی صورت میں رضا الٰہی اور ثواب حاصل ہوتا ہے

[1] القرآن: ۲/۲۵۳

اور کرنے سے خدا کی ناراضی اور اس کا عقاب ہوتا ہے اور کبھی یہ ممانعت غیر تاکیدی ہوتی ہے کہ رکنے اور باز رہنے سے خدا کی خوشی اور ثواب حاصل ہوتا ہے اور کرنے سے خدا کی کچھ ناخوشی اور اس کا عذاب نہیں ہوتا۔ اور جس فعل سے خدا کی رضا اور عدم رضا کچھ متعلق نہیں ہوتی اس فعل میں بندہ کو اختیار دیا ہے کہ چاہے کرے یا نہ کرے۔ پس جس فعل کے ساتھ خدا کی رضا مندی تاکیدی طور پر متعلق ہو اس کو اہل اسلام ایجاب کہتے ہیں اور جس فعل کے ساتھ رضا بغیر تاکید کے متعلق ہو اس کو استحباب کہتے ہیں اور جس فعل کی ممانعت تاکیدی ہو اس کو تحریم کہتے ہیں اور جس فعل کی ممانعت غیر تاکیدی ہو اس کو کراہت کہتے ہیں اور جس فعل کی نہ ممانعت ہو اور نہ اس کا مطالبہ تو اس کو اباحت کہتے ہیں۔

حقیقت نبوۃ اور وحی

حق تعالیٰ نے انسان میں دو قوتیں رکھی ہیں ایک قوۃ ملکیہ روحانیہ، دوسری قوۃ بہیمیہ جسمانیہ۔ قوۃ بہیمیہ کے امراض زائل کرنے کے لئے اطباء اور حکماء کو پیدا فرمایا۔ اور قوۃ ملکیہ کی تربیت اور علاج کے لئے ایسے حضرات کو مبعوث فرمایا کہ جو بظاہر صورت جسمانیہ کے اعتبار سے بشر ہوں اور باعتبار قوۃ ملکیہ اور کمالات روحانیہ کے ملائک سے بھی بڑھ کر۔ ان حضرات کی قوت جسمانیہ، قوت ملکیہ کی ہر طرح سے محکوم اور غلام ہوتی ہے جیسا کہ حدیث میں ہے کہ ہر انسان کے ساتھ شیطان لگا ہوا ہے اور اس کو معصیت کی طرف بلاتا ہے لیکن میرا شیطان مطیع ہو گیا ہے۔ یعنی میری قوت بہیمیہ، قوت ملکیہ وروحانیہ کے مطیع اور فرمانبردار رہتی ہے۔

اور یہ حضرات کسی وقت بشریت سے منسلخ ہو کر ملأ اعلیٰ میں پہنچ جاتے ہیں اور اس حالت میں جو کچھ ملأ اعلیٰ سے علوم القاء ہوتے ہیں اس کو وحی کہتے ہیں اور اس انسلاخی حالت ختم ہو جانے کے بعد ان علوم کو لے کر بندگان خدا کی طرف متوجہ ہو جاتے ہیں

اور وحی کے وقت کبھی گھنٹہ کی سی آواز سنائی دیتی ہے اور کبھی فرشتہ خود سامنے آجاتا ہے اور فرشتہ کبھی اپنی اصلی صورت میں ظاہر ہوتا ہے اور کبھی کسی آدمی کی صورت میں سامنے آتا ہے اور یہ کچھ مستبعد نہیں جیسے ایک معنی مختلف الفاظ کے قالب میں ڈھل سکتے ہیں اسی طرح حقیقت ملکیہ بھی مختلف صورتوں اور متعدد شکلوں میں ہوکر ظاہر ہو سکتی ہے اور یہ اخذ وحی بہت سرعت کے ساتھ گویا ایک طرفۃ العین میں ہوجاتا ہے اور اسی سرعت نزول کی وجہ سے وحی کو وحی کہتے ہیں اس لئے کہ وحی کے معنی لغت میں سرعت کے ہیں۔ اور ہر نزول وحی کے وقت نبی مرسل کو ایک قسم کی صعوبت اور گرانی پیش آتی ہے۔ کما قال تعالیٰ:

﴿ اِنَّا سَنُلْقِیْ عَلَیْكَ قَوْلًا ثَقِیْلًا ۝ ﴾ [1]

تَرجَمہ: "ہم عنقریب آپ پر ایک بھاری کلام القا کریں گے۔"

اور اسی وجہ سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر جب وحی نازل ہوتی تھی تو سخت جاڑوں میں یہ کیفیت ہوتی کہ آپ کی پیشانی مبارک سے پسینہ ٹپکنے لگتا تھا اور کبھی آپ سے خرخر کی آواز نکلنے لگتی تھی۔ وجہ اس کی یہی تھی کہ بشریت سے منسلخ ہونا اور ملأ اعلیٰ اور عالم ملکوت میں پہنچ جانا صعوبت اور دشواری کا باعث ہوتا تھا اور یہ صعوبت اور دشواری ابتداء بعثت میں زائد پیش آتی ہے اور جب وحی پے در پے نازل ہوتی رہتی ہے تو پھر کسی قدر سہولت ہوجاتی ہے یہی وجہ ہے کہ مکہ میں چھوٹی چھوٹی سورتیں نازل ہوئیں اور وہ بھی دفعۃً نہیں بلکہ قطعہ قطعہ کرکے کئی کئی ماہ بلکہ کئی کئی سال کے فصل سے، بخلاف مدینہ طیبہ کے کہ وہاں پہنچ کر طویل طویل سورتیں نازل ہوئیں اور زمانہ بھی نزول کا قریب قریب رہا۔ چنانچہ ایک روایت میں ہے کہ غزوۂ تبوک میں سورۂ برأت بتمامہا اور ایک روایت میں ہے کہ اس کا اکثر حصہ اس حالت میں نازل ہوا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ناقہ پر سوار تھے۔

[1] القرآن: ۷۳/۵

وحی سے جو علم اور ادراک حاصل ہوتا ہے وہ بہت کچھ خواب سے مشابہ ہوتا ہے لیکن مرتبہ کے اعتبار سے ایک عظیم فرق ہے چنانچہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

”الرؤیا الصالحة جزء من ستة واربعین جزء ا من النبوة وفی روایة ثلاثة واربعین وفی روایة تسعین“ [۱]

ترجمہ: ”رویائے صالحہ نبوت کا چیالیسواں جز ہے اور ایک روایت میں یہ ہے کہ تینتالیسواں اور ایک روایت میں نوے واں جز ہے۔“

ان تینوں روایتوں سے کسی خاص عدد کا بیان کرنا مقصود نہیں بلکہ فرق مراتب بتلانا مدنظر ہے یعنی رویاء صالحہ اور نبوۃ میں اتنا ہی تفاوت ہے جتنا کہ ایک اور نوے (۹۰) میں یعنی جیسا کہ ایک اور نوے (۹۰) میں ایک عظیم فرق ہے ویسا ہی رویائے صالحہ اور نبوۃ میں عظیم فرق ہے۔

بعض علماء نے اس حدیث کی یہ شرح فرمائی ہے کہ ابتدائے نبوت میں چھ ماہ تک نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بذریعہ رویا صالحہ وحی آتی رہی۔ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کا کل زمانہ ۲۳ سال ہے۔ اس لئے چھ ماہ ۲۳ سال کے اعتبار سے چیالیسواں جزء ہے لیکن اس شرح میں یہ اشکال ہے کہ یہ شرح فقط ستۃ و اربعین کی روایت میں جاری ہو سکتی ہے۔ ”ثلاثةً واربعین“ اور ”تسعین“ کی روایت میں نہیں چل سکتی۔ دوسرے یہ کہ اگر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر چھ ماہ تک وحی خواب میں آتی رہی تو اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ کل انبیاء کے حق میں ایسا ہی ہوا ہو تیسرے یہ کہ اس شرح کی بناء پر نفس رویا صالحہ اور حقیقت نبوت میں کوئی نسبت نہ معلوم ہوگی بلکہ زمانہ رویا اور مدت نبوت میں نسبت مفہوم ہوگی۔

احیاء العلوم کی کتاب الفقر والزہد میں امام غزالی رحمہ اللہ تعالیٰ نے اس اختلاف

---

[۱] بخاری و مسلم بحوالہ مشکوۃ جلد ا صفحہ ۳۹۱

روایت کو اختلاف مراتب پر محمول فرمایا ہے کہ بعض کے حق میں رویائے صالحہ نبوت کا چیالیسواں جز ہوتا ہے اور بعض کے حق میں تینتالیسواں اور کسی کے لئے سترواں جز ہوتا ہے اور علی ہذا جس شخص کو جس درجہ کا نبوت کے ساتھ قرب ہے اسی درجہ اس کا رویا صالحہ بھی اقرب الی الجزئیہ ہے بہر حال تمام روایات صحیح ہیں۔ اختلاف مراتب اور تعدد مدارج کے لحاظ سے رویائے صالحہ کے جزئیت کے مدارج بھی مختلف ہو گئے۔

حجۃ الاسلام امام غزالی قدس اللہ سرہ نے اپنی کتاب "المنقذ من الضلال" میں نبوت کی جو حقیقت ارقام فرمائی ہے۔ اس کا محصل حسب ذیل ہے انسان جب اس عالم وجود میں قدم رکھتا ہے تو بالکل ساذج الفطرت اور علوم سے معری ہوتا ہے حق تعالیٰ شانہ اولا حاسہ لمس پیدا فرماتے ہیں جس سے وہ حرارت و برودت، رطوبت و یبوست لین و خشونت کا ادراک کرتا ہے لیکن اس حاسہ لمس سے الوان و اشکال کا ادراک نہیں کر سکتا بعد ازاں اس میں حاسہ بصر پیدا فرماتے ہیں تا کہ الوان واشکال کو دیکھ سکے اور پھر حاسہ سمع اور ذوق پیدا فرماتے ہیں تا کہ اصوات ونغمات کو سن سکے اور طعام وشراب کی لذتوں سے بہرہ اندوز ہو سکے۔ پھر سات سال کے قریب اس میں قوت ممیزہ پیدا فرماتے ہیں تا کہ محسوسات سے گزر کر معقولات کا کچھ ادراک کر سکے اور پھر بعد چندے اس میں قوت عاقلہ پیدا فرماتے ہیں تا کہ وجوب اور امکان، استحالہ اور امتناع کو سمجھ سکے لیکن ان کے علاوہ ادراک کا ایک اور مرتبہ ہے جو ان تمام مراتب سے بالا اور برتر ہے۔ وہاں نہ قوت عاقلہ کی رسائی ہے اور نہ قوت ممیزہ کی اسی مرتبہ کا نام نبوت ہے جس میں امور غیبیہ اور امور اخرویہ کا ادراک ہوتا ہے۔

جس طرح ایک شیر خوار بچہ کا قوت ممیزہ اور قوت عاقلہ کے وجود سے انکار قابل التفات نہیں ٹھیک اسی طرح مرتبہ نبوت کا انکار بھی قابل التفات نہیں۔

؎ خلق اطفا لند جز مست خدا
نیست بالغ جز رہیدہ از ہوا

لوگوں کے سمجھنے کے لئے حق تعالیٰ شانہ نے ایک نمونہ پیدا فرمایا ہے وہ یہ کہ انسان پر حالت منام میں کبھی صراحۃً اور کبھی تمثیلاً بہت سے غیبی امور اور آئندہ کے واقعات منکشف ہو جاتے ہیں۔ بالفرض اگر کوئی شخص ایسا ہو کہ اس کو کبھی نوم کا تجربہ نہ ہوا ہو حقیقت منام اور ماہیت رویا سے بالکلیہ بے خبر ہو۔ اس کے سامنے اگر یہ بیان کیا جائے کہ انسان جب شب کو مردہ کی طرح بالکل بے حس وحرکت لیٹ جاتا ہے اور تمام احساسات سمع اور بصر اس سے علیحدہ ہو جاتے ہیں۔ اس حالت میں اس پر بعض امور غیبیہ کا انکشاف ہوتا ہے تو یقیناً وہ شخص اس کا انکار کرے گا بلکہ اس کے استحالہ پر اپنے خیال میں ایک قوی برہان بھی قائم کر دے گا اور یہ کہے گا کہ بدون قوائے حاسہ اور اسباب ادراک کے کسی شئے کا ادراک کیوں کر ممکن ہے۔ لیکن مشاہدہ اس کی تکذیب کرے گا اور واقفین حقیقت اس کے براہین ودلائل پر اصلاً توجہ نہ فرمائیں گے اس نادان کے انکار کا منشا صرف یہ ہے کہ وہ اسباب ادراک کو ان قوائے حاسہ میں منحصر خیال کرتا ہے۔ طب اور نجوم کے علوم و معارف میں غور کرنے سے بداہۃً معلوم ہوتا ہے کہ یہ علوم محض الہامی ہیں۔ ادویہ کے عجیب وغریب خواص کہ جہاں تک نہ حس ظاہری کی رسائی ہے اور نہ عقل کی بجز الہام اور وحی انبیاء کیوں کر معلوم ہو گئے۔[1]

اور عارف ربانی شیخ مجدد الف ثانی رحمہ اللہ تعالیٰ نے مکتوبات میں نبوت کی حقیقت بعینہ یہی بیان فرمائی ہے کہ جو امام غزالی قدس اللہ سرہ سے نقل کی گئی۔

چنانچہ طور عقل ورائے طور حس است کہ آنچہ بحس مدرک نشود عقل ادراک آں می نماید ہمچنیں طور نبوت ورائے طور عقل ست آنچہ بعقل مدرک نشود بتوسل نبوت بدرک می در آید وہر کہ ورائے طور عقل طریقے از برائے معرفت اثبات نمی نماید فی الحقیقت منکر طور نبوت است ومصادم بداہت۔

ترجمہ: ''اور جس طرح طور عقل طور حس سے سوا ہے کہ جو چیزیں حس

---

[1] کذا فی المنقذ من الضلال: صفحہ ۴۴

ظاہر سے مدرک نہیں ہوسکتیں عقل ان کا ادراک کر لیتی ہے اسی طرح طور نبوت طور عقل سے سوا ہے کہ جو چیزیں عقل سے مدرک نہیں ہوسکتیں وہ بذریعہ نبوت ادراک میں آجاتی ہیں اور جو شخص سوائے طور عقل کوئی اور طریقہ معرفت اور ادراک کا نہیں مانتا تو وہ شخص فی الحقیقت طور نبوت کا منکر اور صریح بداہت کا مخالف ہے۔"

اور پھر اسی مکتوب میں تین صفحہ بعد تحریر فرماتے ہیں۔

حجۃ الاسلام امام غزالی رحمہ اللہ تعالیٰ در رسالہ منقذ عن الضلال می فرماید کہ فلاسفہ علم طب وعلم نجوم را از کتب انبیاء ما تقدم علی نبینا وعلیہم الصلوٰۃ والتسلیمات سرقہ کردہ اندو خواص ادویہ وغیر آنرا کہ عقل در درک آنہا قاصر ست از صحف وکتب منزلہ بانبیاء علیہم الصلوٰۃ والتسلیمات اقتباس نمودہ۔

ترجمہ: "حجۃ الاسلام امام غزالی رحمہ اللہ تعالیٰ (المنقذ من الضلال) میں فرماتے ہیں کہ فلاسفہ نے علم طب اور علم نجوم انبیاء سابقین علیہم الصلوٰۃ والسلام کی کتابوں سے چرایا ہے اور دواؤں کے خواص کہ جن کے ادراک سے عقل قاصر ہے انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام کے صحیفوں اور کتب منزلہ من السماء سے اقتباس کیا ہے۔"

مراتب وحی

1. مکالمہ الٰہی بلا واسطہ: جیسے ہمارے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم لیلۃ الاسراء میں اس سے سرفراز فرمائے گئے۔

کما قال تعالیٰ: ﴿ثُمَّ دَنَا فَتَدَلّٰى فَكَانَ قَابَ قَوْسَيْنِ اَوْ اَدْنٰى ۝ فَاَوْحٰٓى اِلٰى عَبْدِهٖ مَآ اَوْحٰى ۝﴾ [1]

[1] القرآن: ۵۳/۸تا۱۰

ترجمہ: ”پس حق تعالیٰ شانہ آپ سے قریب ہوئے اور نزول اجلال فرمایا اور دو کمان بلکہ ان سے بھی زیادہ قریب ہو گئے اور اپنے بندہ کی طرف وحی بھیجی جو کچھ بھی بھیجی یعنی کلام فرمایا۔“

۲ تکلیم الٰہی من وراء الحجاب: جیسے موسیٰ علیہ السلام سے حق تعالیٰ شانہ نے کوہ طور پر کلام فرمایا۔ کما قال تعالیٰ:

﴿وَكَلَّمَ اللّٰهُ مُوْسٰى تَكْلِيْمًا﴾ [1]

ترجمہ: ”اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام سے کلام فرمایا۔“

﴿وَلَمَّا جَآءَ مُوْسٰى لِمِيْقَاتِنَا وَكَلَّمَهٗ رَبُّهٗ قَالَ رَبِّ اَرِنِيْٓ اَنْظُرْ اِلَيْكَ ؕ﴾ [2]

ترجمہ: ”اور جب موسیٰ علیہ السلام وقت معین پر پہنچے اور رب العالمین نے ان سے کلام کیا تو موسیٰ نے ان سے یہ کہا کہ اے رب تو مجھ کو دکھا تا کہ میں تجھ کو دیکھوں۔“

﴿يٰمُوْسٰٓى اِنِّى اصْطَفَيْتُكَ عَلَى النَّاسِ بِرِسٰلٰتِىْ وَبِكَلَامِىْ﴾ [3]

ترجمہ: ”اے موسیٰ میں نے تجھ کو اپنے پیغام اور کلام سے برگزیدہ بنایا۔“

۳ ارسال ملک: یعنی فرشتہ کا اپنی ہیئۃ اصلیہ یا کسی بشر کی شکل میں متمثل ہو کر آنا۔

کما قال تعالیٰ: ﴿اَوْ يُرْسِلَ رَسُوْلًا فَيُوْحِيَ بِاِذْنِهٖ مَا يَشَآءُ ؕ﴾ [4]

ترجمہ: ”یا بھیجتے ہیں اللہ تعالیٰ کوئی فرشتہ پس وہ نازل کرتا ہے اللہ کے حکم سے جو خدا چاہتا ہے۔“

---

[1] القرآن: ۴/۱۶۴ [2] القرآن: ۷/۱۴۳

[3] القرآن: ۷/۱۴۴ [4] القرآن: ۴۲/۵۱

ابتداءِ نبوت کے وقت جبرئیل امین اصلی شکل میں وحی الٰہی لے کر نمودار ہوئے۔
باقی اکثر اوقات حضرت دحیہ کلبی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی شکل میں تشریف لاتے تھے۔
جیسا کہ سنن نسائی میں باسناد صحیح عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے مروی ہے مگر بعض اوقات حضرت دحیہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی شکل کے علاوہ اور شکل میں بھی آئے ہیں۔
جیسا کہ حدیث میں ہے۔

"بينا نحن عند رسول الله صلى الله عليه وسلم ذات يوم اذ طلع علينا رجل شديد بياض الثياب شديد سواد الشعر لا يرى عليه اثر السفر ولا يعرفه منا احد." [1]

تَرجَمَہ: "ایک روز ہم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس حاضر تھے کہ ایک شخص آیا کہ جس کے کپڑے تو نہایت سفید اور بال نہایت سیاہ تھے جس پر کوئی اثر سفر کا بھی نہیں معلوم تھا اور نہ ہم میں سے کوئی اس کو پہچانتا تھا۔"

کچھ مسائل دریافت کر کے چلے گئے۔ "وفی آخره قال النبی صلی الله عليه وسلم هذا جبرئيل جاء يعلم الناس دينهم." [2]

تَرجَمَہ: "بعد میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ یہ جبرئیل تھے تمہیں دین سکھلانے کے لئے آئے تھے۔"

۴ صلصلۃ الجرس: گھنٹہ کی طرح گونج اور آواز کا سنائی دینا جیسا کہ صحیح بخاری میں ام المؤمنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت ہے۔

"ان الحارث بن هشام سال رسول الله صلى الله عليه وسلم كيف ياتيك الوحى فقال رسول الله صلى

[1] بخاری و مسلم بحوالہ مشکوۃ جلد ا صفحہ ۱۱
[2] بخاری و مسلم بحوالہ مشکوۃ جلد ا صفحہ ۱۱

اللّٰه علیه وسلم احیانا یاتینی مثل صلصلة الجرس وهو اشده علی فیفصم عنی وقد وعیت عنه ما قال واحیانا یتمثل لی الملك رجلا فیکلمنی فاعی ما یقول قالت عائشة رضی الله تعالٰی عنها ولقد رأیته فی الیوم الشدید البرد فیفصم عنه وان جبینه لیتفصد عرقا۔"[1]

ترجمہ: "حارث بن ہشام نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ یارسول اللہ آپ کے پاس وحی کیسے آتی ہے؟ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ ارشاد فرمایا کہ کبھی کبھی تو گھنٹہ کی آواز کی طرح آتی ہے اور وحی کی یہ قسم میرے اوپر بہت سخت ہے پس وحی مجھ سے منقطع ہو جاتی ہے اور حالانکہ میں اس کو بہت محفوظ کر چکا ہوتا ہوں کہ جو فرشتہ نے کہا ہے اور کبھی کبھی فرشتہ مرد کی صورت میں آتا ہے اور مجھ سے کلام کرتا ہے جو کچھ کہتا ہے اس کو محفوظ کر لیتا ہوں حضرت عائشہ رضی اللہ تعالٰی عنہا فرماتی ہیں کہ میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو سخت سردی کے دن میں دیکھا ہے کہ وحی آپ سے منقطع ہوتی تھی اور پسینہ آپ کی پیشانی سے ٹپکتا ہوا ہوتا تھا۔"

چونکہ افادہ اور استفادہ افاضہ اور استفاضہ کے لئے یہ شرط ہے کہ سامع اور متکلم میں کوئی مناسبت ہو۔ اس لئے نزول وحی کبھی اس طرح ہوتا تھا کہ روح امین کی ملکیت اور روحانیت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر غالب آجاتی اور بشریت سے منسلخ ہو کر ملأ اعلی میں پہنچ جاتے یہ قسم اول ہے۔ اور کبھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بشریت جبرئیل امین کی ملکیت اور روحانیت پر غالب آجاتی اور روح امین متمثل بشکل بشر ہو جاتے یہ دوسری قسم ہے۔

---

[1] بخاری جلد ۱ صفحہ ۲

قسم اول کے متعلق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ ارشاد فرمایا کہ وحی کی یہ کیفیت مجھ پر نہایت سخت ہے اس لئے کہ بشریت سے ملکیت کی طرف منسلخ ہو جانا نہایت صعب اور دشوار ہے اور ملائک پر جو رب العزت کی جانب سے وحی آتی ہے وہ بھی اس قسم کی ہوتی ہے۔

"کما روی ابوھریرۃ رضی اللّٰہ تعالیٰ عنه عن النبی صلی اللّٰہ وسلم قال اذا قضی اللّٰہ فی السماء امرا ضربت الملائکة باجنحتها خضعانا لقوله کانه سلسلة علی صفوان فاذا فزع عن قلوبهم قالوا ماذا قال ربکم قالوا الحق وهو العلی الکبیر" [۱]

ترجمہ: "حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جب حق تعالیٰ آسمان میں کوئی حکم صادر فرماتے ہیں تو فرشتے خوف اور ہیبت کی وجہ سے عاجزی سے پر پھڑپھڑانے لگتے ہیں اور حق تعالیٰ کا کلام اس طرح سنائی دیتا ہے جیسا کہ صاف پتھر پر ایک زنجیر۔ پس جب ان کی گھبراہٹ دور ہو جاتی ہے تو ایک دوسرے سے پوچھتے ہیں کہ کیا حکم صادر ہوا تو اوپر والے بتاتے ہیں کہ حق بات کا حکم صادر ہوا یعنی فلاں حکم۔"

"وقد روی ابن مردویه من حدیث ابن مسعود رفعه اذا تکلم اللّٰہ بالوحی یسمع اهل السموات صلصلة کصلصلة السلسلة علی الصفوان فیفزعون ویرون انه من امر الساعة." [۲]

ترجمہ: "ابن مردویہ نے حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ

---

[۱] رواہ البخاری جلد۲ صفحہ ۷۰۸ [۲] فتح الباری باب حتی اذا فزع عن قلوبهم: جلد۸ صفحہ ۴۱۳

سے مرفوعاً روایت بیان کی کہ جب اللہ تعالیٰ ملائک پر کوئی وحی نازل فرماتے ہیں تو اہل سموات کو اس طرح سنائی دیتی ہے کہ زنجیر کی آواز ایک صاف پتھر پر۔ پس گھبرا جاتے ہیں اور یہ گمان کرتے ہیں کہ شاید قیامت کے متعلق کوئی حکم آیا۔"[1]

نیز اس کلام کا کہ جو صلصلۃ الجرس کے مشابہ ہو سمجھنا بہت دشوار ہے اور ملک متمثل بشکل بشر کے مکالمہ اور مخاطبہ کا سمجھنا آسان ہے۔ اس حدیث میں جو صلصلۃ الجرس کا لفظ آیا ہے اس سے آواز وحی مراد ہے۔ اور یہی ظاہر عبارت سے مفہوم ہوتا ہے۔

اور وقد وعیت عنہ ماقال میں عنہ اور قال کی دونوں ضمیر ملک (فرشتہ) کی طرف راجع ہیں کہ جو سیاق عبارت سے مفہوم ہوتا ہے جیسا کہ علامہ قسطلانی رحمہ اللہ تعالیٰ نے شرح بخاری میں ذکر فرمایا ہے۔

امام بخاری رحمہ اللہ تعالیٰ نے کتاب بدء والخلق کے باب ذکر الملائکہ میں اس حدیث کو دوبارہ ذکر فرمایا ہے جس سے ماقال کی ضمیر کا ملک کی طرف راجع ہونا واضح ہو جاتا ہے اور حدیث کی مراد سمجھنے میں بہت سہولت ہو جاتی ہے۔

"عن عائشة ان الحارث بن هشام سال النبي صلى الله عليه وسلم كيف ياتيك الوحي قال كل ذلك ياتي الملك. احيانا في مثل صلصلة الجرس فيفصم عني وقد وعيت ما قال وهو اشده علي ويتمثل لي الملك احيانا رجلا فيكلم فاعي ما يقول."[2]

ترجمہ: "حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت ہے کہ حارث بن ہشام نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ آپ کے پاس

---

[1] کذا فی فتح الباری   [2] بخاری جلد ۱ صفحہ ۲

وحی کس طرح آتی ہے؟ آپ نے ارشاد فرمایا کہ ہر مرتبہ فرشتہ آتا ہے کبھی گھنٹی کی آواز میں، پس وہ وحی اس وقت منقطع ہو جاتی ہے کہ جب میں اس کو محفوظ کر چکا ہوتا ہوں اور یہ وحی مجھ پر بہت سخت ہوتی ہے اور کبھی فرشتہ مرد کی صورت میں آکر کلام کرتا ہے پس جو کہتا ہے میں اس کو یاد کر لیتا ہوں۔"

۵ رویائے صادقہ (سچا خواب):

کما فی التنزیل فی قصة سیدنا ابراهیم علیه الصلوٰة والسلام ﴿قَالَ يٰبُنَيَّ اِنِّيْٓ اَرٰى فِي الْمَنَامِ اَنِّيْٓ اَذْبَحُكَ فَانْظُرْ مَاذَا تَرٰى ۭ﴾ [1]

ترجمہ: "(اے میرے بیٹے میں تجھ کو خواب میں ذبح کرتا ہوا دیکھتا ہوں پس بتلاؤ کیا رائے ہے)۔"

کما قال تعالیٰ: ﴿لَقَدْ صَدَقَ اللّٰهُ رَسُوْلَهُ الرُّءْيَا بِالْحَقِّ ۚ﴾ [2]

ترجمہ: "یقیناً اللہ نے اپنے رسول کو سچا خواب دکھایا۔"

﴿اِذْ يُرِيْكَهُمُ اللّٰهُ فِيْ مَنَامِكَ قَلِيْلًا ۭ وَلَوْ اَرٰىكَهُمْ كَثِيْرًا لَّفَشِلْتُمْ وَلَتَنَازَعْتُمْ فِي الْاَمْرِ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ سَلَّمَ ۭ اِنَّهٗ عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ۝﴾ [3]

ترجمہ: "اس وقت کو یاد کیجئے کہ جب اللہ تعالیٰ نے کافروں کو آپ کے خواب میں کم دکھایا اور اگر زائد دکھلاتے تو اے مسلمانو تم بزدل ہو جاتے اور نزاع شروع کر دیتے۔ لیکن اللہ نے تم کو سلامت رکھا اور وہ سینوں کی باتوں کو خوب جاننے والا ہے۔"

---

[1] القرآن: ۱۰۲/۳۷ [2] القرآن: ۲۷/۴۸ [3] القرآن: ۴۳/۸

"وقال عبادة بن الصامت رضی اللّٰه تعالٰی عنه رویا المؤمن کلام یکلم به الرب عبده فی المنام." [1]

ترجمہ: "حضرت عبادہ بن الصامت رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ مسلمان کا خواب ایک کلام ہے جو اللہ تعالیٰ اپنے بندہ سے خواب میں فرماتے ہیں۔"

"وعن عائشة ام المؤمنین رضی اللّٰه تعالٰی عنها قالت اول ما بدئ به رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم من الوحی الرویا الصالحة فی النوم فکان لا یری رؤیا الا جاءت مثل فلق الصبح" [2]

ترجمہ: "حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی کی ابتداء رویائے صالحہ یعنی نیک خواب کے ذریعہ سے ہوئی۔ پس جو خواب بھی آپ دیکھتے تھے وہ صبح کی روشنی کی طرح ظاہر ہوکر رہتا تھا۔"

"وعن ابی هریرة رضی اللّٰه تعالٰی عنه قال قال رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم لم یبق من النبوة الا المبشرات قالوا وما المبشرات قال الرؤیا الصالحة" [3]

ترجمہ: "حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ نبوت میں سے سوائے مبشرات کے کچھ باقی نہیں رہا۔ صحابہ نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! مبشرات سے کیا مراد ہے؟ آپ نے فرمایا رویائے صالحہ

---

[1] کذا فی مدارج السالکین جلد ۱ صفحہ ۲۸ [2] صحیح بخاری باب بدء الوحی جلد ۱ صفحہ ۲

[3] رواہ البخاری جلد ۲/ ۱۰۳۵

یعنی نیک خواب۔"

"وعن انس رضی اللّٰہ تعالٰی عنہ قال قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم الرؤیا الصالحۃ جزء من ستۃ واربعین جزأ من النبوۃ متفق علیہ" [۱]

ترجمہ: "حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ رویائے صالحہ نبوت کا چھیالیسواں جز ہے۔"

"وعن عبدالرحمن بن عایش رضی اللّٰہ تعالیٰ عنہ قال قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم رایت ربی عزوجل فی احسن صورۃ قال فیم یختصم الملأ الاعلی قلت انت اعلم الی آخر الحدیث رواہ الدارمی مرسلا وللترمذی نحوہ عنہ وعن ابن عباس ومعاذ بن جبل رضی اللّٰہ تعالٰی عنہم" [۲]

ترجمہ: "عبدالرحمٰن بن عایش رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں نے اللہ جل جلالہ کو باحسن صورت خواب میں دیکھا اللہ جل جلالہ نے فرمایا کہ اے میرے رسول ملأ اعلیٰ کس چیز میں مکالمہ کر رہے ہیں۔ الی آخر الحدیث۔ دارمی نے اس کو مرسلاً روایت کیا ہے اور اسی طرح ترمذی میں ہے اور یہ حدیث حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما اور معاذ بن جبل رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے بھی مروی ہے۔"

---

[۱] مشکوٰۃ شریف کتاب الرؤیا جلد۲ صفحہ۳۹۴، بخاری جلد۲ صفحہ۱۰۳۴

[۲] مشکوٰۃ شریف باب المساجد جلد۱ صفحہ۶۹

انبیاء کرام کا خواب وحی ہوتا ہے

انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام کا رؤیا بالکل قطعی ہوتا ہے اور اسی پر تمام امت کا اجماع ہے جیسا کہ حافظ ابن قیم رحمہ اللہ تعالیٰ نے مدارج السالکین میں تحریر فرمایا ہے۔

"رؤيا الانبياء وحي فانها معصومة من الشيطان وهذا باتفاق الامة ولهذا قدم الخليل على ذبح اسمٰعيل عليهما الصلٰوة والسلام بالرؤيا" [1]

ترجمہ: "انبیاء کرام کا خواب بھی وحی ہے اس لئے کہ وہ شیطان سے محفوظ ہے اور اسی پر تمام امت کا اتفاق ہے اور اسی وجہ سے کہ انبیاء کا خواب وحی ہوتا ہے حضرت ابراہیم علیہ السلام حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کے ذبح پر خواب کی وجہ سے آمادہ ہو گئے۔"

الحاصل انبیاء کرام کا رؤیا بالکل قطعی ہوتا ہے اس لئے کہ رویا انبیاء شیطان کے اثر سے بالکلیہ مامون ومصون ہوتا ہے۔ ان کا رؤیا فقط رحمانی ہوتا ہے نفسانی اور شیطانی نہیں ہوتا۔

"وقال النبي صلى الله عليه وسلم الرؤيا ثلثة رؤيا من الله ورؤيا تحزين من الشيطان ورؤيا مما يحدث به الرجل نفسه في اليقظة فيراه في المنام" [2]

ترجمہ: "آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ خواب تین قسم کا ہے ایک اللہ تعالیٰ کی جانب سے، دوسرا رویائے حزن شیطان کی جانب سے تیسرا خواب ہے کہ انسان جو دن میں کلام وغیرہ کرتا ہے وہی شب کو خواب میں دیکھتا ہے۔" [3]

---

[1] مدارج السالکین: جلد ا صفحہ ۲۸ [2] مدارج السالکین: جلد ا صفحہ ۲۸ [3] مدارج السالکین

علاوہ ازیں چونکہ انبیاء کرام کا صدق قطعی اور یقینی ہے اس لئے ان کے رؤیا کا صدق بھی قطعی اور یقینی ہے چنانچہ حافظ ابن قیم رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں۔

"اصدق الناس رؤیا اصدقھم حدیثا" سب سے زائد سچے خواب والا وہی شخص ہے کہ جو اپنے کلام میں سب سے زائد سچا ہے۔

نیز انبیاء کرام کی آنکھیں اگرچہ سوتی ہیں مگر قلوب بیدار رہتے ہیں یہ بھی اسی کو مقتضی ہے کہ انبیاء کرام کا خواب قطعی ہو بلکہ رویائے انبیاء فقط ظاہری آنکھوں کے لحاظ سے رؤیا ہے باقی قلب کے اعتبار سے وہ بیداری کے حکم میں ہے۔

نیز رویائے انبیاء میں جس درجہ انکشاف ہوتا ہے وہ دوسروں کے رؤیا میں نہیں ہوتا۔ جیسا کہ لا یرٰی رؤیا الاجائت مثل فلق الصبح سے معلوم ہوتا ہے۔

الحاصل انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام کا رؤیا بالکل قطعی ہے اور جس طرح انبیاء کرام معصوم ہیں اسی طرح ان کا رویا بھی معصوم ہے۔

❻ تفہیم غیبی: من جانب اللہ کسی کی نظر اور فکر میں ایسی برکت کا آجانا کہ اس کی قوت نظریہ کو کشاں کشاں صواب اور رشد کی طرف لے جائے اس کا نام تفہیم غیبی اور تفہیم الٰہی ہے۔

قال اللّٰہ تعالٰی: ﴿وَدَاوٗدَ وَسُلَیْمٰنَ اِذْ یَحْکُمٰنِ فِی الْحَرْثِ اِذْ نَفَشَتْ فِیْهِ غَنَمُ الْقَوْمِ وَكُنَّا لِحُكْمِهِمْ شٰهِدِیْنَ ۝ فَفَهَّمْنٰهَا سُلَیْمٰنَ وَكُلًّا اٰتَیْنَا حُكْمًا وَّعِلْمًا﴾[1]

ترجمہ: "اور جب کہ داؤد اور سلیمان اس کھیتی کا فیصلہ کرنے لگے جس کو قوم کی بکریاں رات میں روند گئی تھیں اور ہم ان کے فیصلہ کو دیکھ رہے تھے پس وہ فیصلہ ہم نے سلیمان کو سمجھا دیا اور علم اور حکمت ہر ایک کو عطا کیا۔"

[1] القرآن: ۲۱/۷۸، ۷۹

حق تعالیٰ شانہ نے علم اور حکمت کو دونوں نبیوں کے لئے ذکر فرمایا مگر اس واقعہ معینہ میں تفہیم کے ساتھ حضرت سلیمان علیہ السلام کو مخصوص فرمایا۔

"وقال علی بن ابی طالب کرم اللّٰہ وجھہ وقد سئل هل خصکم رسول اللّٰہ بشیء دون الناس فقال لا. والذی فلق الحبة وبرأ النسمة الا فھما یؤتیه اللّٰہ عبداً فی کتابه وما فی ھذہ الصحیفة" [1]

حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے دریافت کیا گیا کہ کیا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ کو کوئی خاص شے بتلائی کہ جو اور لوگوں کو نہیں بتلائی؟ فرمایا کہ نہیں جو سب کو بتلایا وہی مجھ کو بھی۔ قسم ہے خدا کی مگر ایک فہم اور سمجھ ہے کہ جو اللہ تعالیٰ اپنے جس بندے کو چاہتے ہیں عطا فرماتے ہیں اور میرے پاس ایک یہ صحیفہ ہے کہ جس میں آپ کے ارشاد فرمودہ احکام ہیں۔

حافظ ابن قیم رحمہ اللہ تعالیٰ مدارج السالکین میں فرماتے ہیں۔

"فالفھم نعمة من اللّٰہ علی عبدہ ونور یقذفه اللّٰہ مالا یدرکه غیرہ ولا یعرفه فیفھم من النص مالا یفھمه غیرہ مع استوائھما فی حفظه وفھم اصل معناہ فالفھم عن اللّٰہ ورسوله عنوان الصدیقیة رضی اللّٰہ عنھا ومنشور الو لایة النبویة وفیه تفاوتت مراتب العلماء حتی عد الف بواحد فانظر الی فھم ابن عباس رضی اللّٰہ عنھما وقد ساله عمر ولمن حضر من اھل بدر وغیرھم عن سورة ﴿اذا جاء نصراللّٰہ والفتح﴾ وما خص به ابن عباس رضی اللّٰہ عنھما من فھمه منھا

[1] مسلم بحوالہ مشکوۃ جلد ۲ صفحہ ۵۶۳

نعی اللّٰہ سبحانہ نبیہ الی نفسہ واعلامہ بحضور اجلہ وموافقۃ عمر رضی اللّٰہ عنہ لہ علی ذلک وخفائہ علی غیرھما من الصحابۃ وابن عباس اذ ذاک احدثھم سنا واین یجد فی ھذہ السورۃ الاعلام باجلہ لولا الفھم الخاص."[۱]

ترجمہ: "پس فہم اللہ کا بندہ پر ایک عظیم انعام ہے اور وہ ایک نور ہے جس کو اللہ تعالیٰ بندہ کے قلب میں ڈالتے ہیں جس کی وجہ سے اس کو ان امور کا ادراک اور فہم ہونے لگتا ہے کہ جو دوسرے کو نہیں ہوتا اگرچہ دوسرا شخص قوت حفظ اور اصل معنی کے سمجھنے میں اس کے برابر ہو پس یہ فہم صدیقیت کا عنوان اور ولایت نبوۃ کا خاص نشان ہے اور اس میں علماء کے مراتب مختلف ہوتے ہیں حتیٰ کہ بعض مرتبہ ہزار عالم ایک عالم کے برابر شمار کئے جاتے ہیں حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما کے فہم کو دیکھو کہ جب حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما اور دیگر صحابہ بدر سے ﴿اذا جاء نصراللّٰہ والفتح﴾ کی تفسیر دریافت فرمائی تو صرف ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے فرمایا کہ میری سمجھ میں یہ آتا ہے کہ حق تعالیٰ شانہ نے اپنے رسول کی وفات کی خبر دی ہے اور یہ بتلایا ہے کہ تمہاری وفات کا زمانہ قریب آگیا ہے اور حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی اس معنی پر موافقت فرمائی اور یہ معنی دوسرے صحابہ پر مخفی رہے حالانکہ ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سب سے کم عمر تھے اور ظاہراً آیت میں کوئی اشارہ وفات کی جانب نہیں۔ اگر تفہیم الٰہی نہ ہوتی تو یہ مطلب نہ سمجھ میں آتا۔

۷ الہام: جو علم کہ قلب میں بغیر کسی اکتساب اور استدلال کے حق تعالیٰ شانہ یا ملأ اعلیٰ کی جانب سے القاء ہو اس کو الہام کہتے ہیں۔

---

[۱] مدارج السالکین: جلد۱ صفحہ۲۲

قال تعالٰی: ﴿فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰهَا﴾ [1]

ترجمہ: ''پھر اللہ نے اس کے فجور اور تقوی کا اس کو الہام فرمایا۔''

شیخ عبدالوہاب شعرانی رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ تقویٰ کا الہام اس لئے فرمایا تا کہ نفس اس پر عمل کرے۔ اور فجور کا الہام اس لئے فرمایا تا کہ اس سے پرہیز کرے۔

حصین بن منذر خزاعی رضی اللہ تعالیٰ عنہ جب مشرف باسلام ہوئے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو یہ دعا تعلیم فرمائی۔

''اَللّٰهُمَّ اَلْهِمْنِیْ رُشْدِیْ وَاَعِذْنِیْ مِنْ شَرِّ نَفْسِیْ''

ترجمہ: ''اے اللہ مجھ کو رشد اور ہدایت کا الہام فرما اور شر نفس سے مجھ کو پناہ دے۔''

وقال تعالٰی شانہ: ﴿وَاَوْحَیْنَآ اِلٰٓی اُمِّ مُوْسٰٓی اَنْ اَرْضِعِیْهِ ج﴾ [2]

ترجمہ: ''اور موسیٰ علیہ السلام کی والدہ کو یہ الہام کیا کہ ان کو دودھ پلاؤ۔''

وقال تعالٰی شانہ: ﴿وَاِذْ اَوْحَیْتُ اِلَی الْحَوَارِیّٖنَ اَنْ اٰمِنُوْا بِیْ وَبِرَسُوْلِیْ ج﴾ [3]

ترجمہ: ''حواریین کو یہ الہام کیا کہ مجھ پر اور میرے رسول پر ایمان لاؤ۔''

وقال اللّٰہ تعالٰی جل جلالہ: ﴿قُلْنَا یٰذَا الْقَرْنَیْنِ اِمَّآ اَنْ تُعَذِّبَ وَاِمَّآ اَنْ تَتَّخِذَ فِیْهِمْ حُسْنًا﴾ [4]

ترجمہ: ''اور ذوالقرنین کو یہ الہام کیا کہ خواہ ان کو عذاب دو یا ان کے ساتھ احسان کرو۔''

الہام کی مختلف صورتیں ہیں کبھی ایسا ہوتا ہے کہ من جانب اللہ براہ راست قلب پر القاء ہوتا ہے اس کو علم لدنی کہتے ہیں۔

[1] القرآن: ۹۱/۸ [2] القرآن ۲۸/۷ [3] القرآن: ۵/۱۱۱ [4] القرآن: ۱۸/۸۶

کما قال تعالٰی شانہ: ﴿وَعَلَّمْنٰهُ مِنْ لَّدُنَّا عِلْمًا﴾[1]
ترجمہ: ”اور ہم نے سکھلایا اُس کو اپنی طرف سے ایک علم۔“
چنانچہ حجۃ الاسلام امام غزالی قدس اللہ سرہ فرماتے ہیں۔

”والعلم اللدنی هو الذی لاواسطة فی حصوله بین النفس وبین الباری وانما هو کالضوء من سراج الغیب یقع علی قلب صاف فارغ لطیف“[2]

ترجمہ: ”علم لدنی وہ ہے کہ جس کے حصول میں نفس اور حق تعالٰی کے درمیان کوئی واسطہ نہ ہو۔ علم لدنی بمنزلہ روشنی کے ہے کہ جو سراج غیب سے قلب صاف وشفاف پر واقع ہوتی ہے۔“

حضرت بایزید بسطامی رحمہ اللہ تعالٰی منکرین علم لدنی سے یہ فرمایا کرتے تھے۔

”قد اخذتم علمکم میتا عن میت ونحن اخذنا علمنا عن الحی الذی لا یموت. کذا فی الیواقیت والجواهر“[3]

تم نے (خطاب بہ علماء ظاہر) علم میتاً عن میت حاصل کیا ہے اور ہم نے علم حی لا یموت سے لیا ہے۔

اور کبھی ملاء اعلی اور ملک الہام کے توسط سے کوئی چیز قلب میں القاء کی جاتی ہے اس کو القاء فی القلب اور نفث فی الروع کہتے ہیں ملک الہام قلب میں القاء کرتا ہے مگر نظر نہیں آتا۔

”کما قال النبی صلی اللہ علیه وسلم ان روح القدس نفث فی روعی لن تموت نفس حتی تستکمل رزقها“[4]

---

[1] القرآن: ۱۸/۶۵
[2] کذا فی الرسالۃ الدنیۃ: صفحہ ۲۸
[3] جلد ۲ صفحہ ۹۱
[4] الحدیث

ترجمہ: ”نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: روح القدس یعنی جبرئیل علیہ السلام نے میرے قلب میں یہ ڈالا ہے کہ کوئی نفس اس وقت تک ہرگز نہ مرے گا جب تک کہ وہ اپنا رزق پورا نہ لے لے۔“

وقال تعالٰی: ﴿اِذْ یُوْحِیْ رَبُّكَ اِلَى الْمَلٰٓئِكَةِ اَنِّیْ مَعَكُمْ فَثَبِّتُوا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا﴾ [1]

ترجمہ: ”جب اللہ تعالٰی فرشتوں کی طرف وحی بھیجتے تھے کہ میں تمہارے ساتھ ہوں سو تم مسلمانوں کے دلوں کو ثابت اور قائم رکھو۔“

اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد "واعظ اللّٰه فی قلب کل مؤمن" جیسا کہ امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ تعالٰی اور امام ترمذی رحمہ اللہ تعالٰی نے نواس بن سمعان کے واسطہ سے روایت کیا ہے اس واعظ اللہ سے یہی الہام الٰہی بواسطۂ الملائک مراد ہے جیسا کہ حافظ ابن قیم رحمہ اللہ تعالٰی نے مدارج السالکین میں ذکر کیا ہے۔ اور کبھی ایسا ہوتا ہے کہ فرشتہ متمثل بشکل بشر ہو کر شفاہاً اور عیاناً مخاطب اور کلام کرتا ہے۔

کما قال تعالٰی: ﴿وَاِذْ قَالَتِ الْمَلٰٓئِكَةُ یٰمَرْیَمُ اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰكِ وَطَهَّرَكِ وَاصْطَفٰكِ عَلٰی نِسَآءِ الْعٰلَمِیْنَ﴾ [2]

ترجمہ: ”اور جس وقت کہ فرشتوں نے کہا کہ اے مریم اللہ نے تجھ کو پسند کیا ہے اور تجھ کو پاک بنایا ہے اور جہاں کی عورتوں پر تجھ کو فضیلت دی۔“

کما قال تعالٰی شانه: ﴿اِذْ قَالَتِ الْمَلٰٓئِكَةُ یٰمَرْیَمُ اِنَّ اللّٰهَ یُبَشِّرُكِ بِكَلِمَةٍ مِّنْهُ اسْمُهُ الْمَسِیْحُ عِیْسَى ابْنُ مَرْیَمَ وَجِیْهًا فِی الدُّنْیَا وَالْاٰخِرَةِ﴾ [3]

[1] القرآن: ۱۲/۸ [2] القرآن: ۴۲/۳ [3] القرآن: ۴۵/۳

ترجمہ: ”جب کہا فرشتوں نے کہ اے مریم! اللہ تجھ کو بشارت دیتا ہے اپنے ایک خاص کلمہ کی جس کا نام مسیح بن مریم ہوگا جو دنیا و آخرت میں صاحب وجاہت ہوگا۔“

وقال تعالیٰ شانہ: ﴿وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ مَرْيَمَ اِذِ انْتَبَذَتْ مِنْ اَهْلِهَا مَكَانًا شَرْقِيًّا ۝ فَاتَّخَذَتْ مِنْ دُوْنِهِمْ حِجَابًا ۖ فَاَرْسَلْنَآ اِلَيْهَا رُوْحَنَا فَتَمَثَّلَ لَهَا بَشَرًا سَوِيًّا ۝ قَالَتْ اِنِّيْٓ اَعُوْذُ بِالرَّحْمٰنِ مِنْكَ اِنْ كُنْتَ تَقِيًّا ۝ قَالَ اِنَّمَآ اَنَا رَسُوْلُ رَبِّكِ لِاَهَبَ لَكِ غُلٰمًا زَكِيًّا ۝﴾ [1]

ترجمہ: ”اور ذکر کرو کتاب میں مریم کا جب کہ وہ شرقی مکان میں اپنے لوگوں سے علیحدہ ہوئیں۔ پس ایک پردہ بنایا۔ پس بھیجا ہم نے ان کے پاس ایک فرشتہ جو آدمی کی شکل میں ان کے سامنے ظاہر ہوا۔ حضرت مریم بولیں کہ اللہ کی پناہ تجھ سے اگر تو اللہ سے ڈرتا ہے کہا کہ جزایں نیست کہ میں تو تیرے رب کا فرستادہ ہوں اس لئے آیا ہوں کہ تجھ کو ایک پاکیزہ لڑکا دے جاؤں۔“

”وقد كانت الملائكة تخاطب عمران بن حصين رضی اللہ تعالیٰ عنه بالسلام فلما اكتوى تركت خطابه فلما ترك الكي عاد اليه خطاب ملكي“ [2]

ترجمہ: ”فرشتے حضرت عمران بن حصین رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو سلام کیا کرتے تھے مگر جب وہ داغ لگوانے لگے تو فرشتوں نے سلام چھوڑ دیا پس جب انہوں نے داغ لینا چھوڑ دیا تو فرشتے پھر مخاطب اور سلام کرنے لگے۔“

---

[1] القرآن: ۱۹/۱۶ تا ۱۹ [2] مدارج السالکین صفحہ ۳۵ جلد ۱۲

"وقال ابوعمر كان اى عمران بن حصين من فضلاء الصحابة وفقهائهم يقول عنه اهل البصرة انه كان يرى الحفظة وكانت تكلمه حتى اكتوى" [1]

ترجمہ: "ابوعمر بن عبدالبر فرماتے ہیں کہ عمران بن حصین رضی اللہ تعالیٰ عنہ بڑے جلیل القدر تھے اور فقہاء صحابہ میں سے تھے اہل بصرہ خود حضرت عمران رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے ناقل ہیں کہ وہ کراماً کاتبین کو دیکھا کرتے تھے اور ان سے باتیں کرتے تھے یہاں تک کہ داغ لیا۔"

حجۃ الاسلام قدس اللہ سرہ احیاء العلوم میں فرماتے ہیں کہ قلب کے دو دروازے ہیں ایک عالم ملکوت اور ملأ اعلیٰ کی طرف ہے اور دوسرا شہادت کی طرف۔

ظاہری علوم اور معارف ظاہری باب یعنی حواس خمسہ ظاہر سے قلب میں داخل ہوتے ہیں اور عالم ملکوت اور ملأ اعلیٰ کے علوم، باطنی دروازہ سے قلب میں آ جاتے ہیں۔

"وروى الحسن عن رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم العلم علمان فعلم باطن فى القلب فذالك هو العلم النافع وسئل بعض العلماء عن العلم الباطن فقال هو سر من اسرار اللّٰه تعالٰى يقذفه اللّٰه تعالٰى فى قلوب احبائه لم يطلع عليه ملكاً ولا بشرا وقد قال صلى اللّٰه عليه وسلم ان من امتى محدثين و معلمين ومكلمين وان عمر منهم وقرأ ابن عباس رضى الله تعالٰى عنه وما ارسلنا من قبلك من رسول ولانبى ولا محدث. والمحدث هو الملهم والملهم هو الذى انكشف له

[1] کذا فی الاصابۃ: جلد ۳ صفحہ ۲۶

فی باطن قلبه من جهة الداخل لامن جهة المجسوسات یقول لیس العالم الذی یحفظ من کتاب فاذا نسی ما حفظه صارجاهلا انما العالم الذی یاخذ علمه من ربه ای وقت شاء بلا حفظ ولا درس وهذا هو العلم الربانی والیه الاشارة بقوله تعالٰی وعلمناه من لدنا علما مع ان کل علم من لدنه ولکن بعضها بوسائط تعلیم الخلق فلا یسمی ذلك علما لدنیا بل اللدنی الذی ینفتح فی سر القلب من غیر سبب مالوف من خارج الخ"[1]

تَرجَمہ: "حسن بصری رحمہ اللہ تعالیٰ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت فرماتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ ارشاد فرمایا کہ علم دو ہیں ایک ظاہری اور ایک باطنی اور آخرت میں علم باطن ہی نفع دیتا ہے۔ بعض علماء سے علم باطن کے متعلق دریافت کیا گیا تو یہ فرمایا کہ وہ ایک سر الٰہی ہے جس کو حق تعالیٰ اپنے احباب کے دلوں میں ڈالتے ہیں اور اس پر فرشتہ اور بشر کو بھی مطلع نہیں فرماتے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ میری امت میں سے محدث اور معلم اور مکلم ہوں گے۔ اور عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ ان میں سے ہیں اور ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما کی قرأت میں ہے۔ "وما ارسلنا من قبلك من رسول ولا نبی ولا محدث" اور محدث وہ ملہم من اللہ ہے کہ جس کے باطن قلب میں ان حواس ظاہرہ کے علاوہ علوم و معارف کے لئے کوئی دوسرا راستہ کھل گیا ہو۔ بایزید رحمہ اللہ تعالیٰ یہ فرمایا کرتے تھے کہ وہ شخص

[1] احیاء العلوم

عالم نہیں کہ جو کسی کتاب کو یاد کر لے اس لئے کہ اگر وہ اس کو بھول جائے تو جاہل رہ جائے گا۔ عالم حقیقۃً وہ ہے کہ جو اپنے رب سے جس وقت چاہے علم حاصل کرتا ہو بغیر حفظ اور تدریس کے اور یہی علم ربانی ہے۔ اور "علمناہ من لدنا علما" میں اسی طرح اشارہ ہے اگرچہ ہر علم اللہ ہی کے پاس ہے مگر بعض علم تعلیم خلق کے واسطہ سے حاصل ہوتا ہے اس کو علم لدنی نہیں کہتے علم لدنی وہ ہے کہ جو بغیر کسی خارجی سبب کے خود بخود قلب میں منجانب اللہ آتا ہو۔"

حجۃ الاسلام قدس سرہ ایک اور مقام پر فرماتے ہیں کہ حوض میں پانی لانے کی دو صورتیں ہیں ایک یہ کہ نہر وغیرہ سے پانی حوض کو لایا جائے۔ دوم یہ کہ اسی حوض کو کھود کر اور اس کو آلات سے صاف کر کے اسی میں کوئی چشمہ جاری کر دیا جائے اور یہ پانی بہ نسبت نہر کے پانی کے نہایت صاف اور شیریں اور لذیذ ہوگا۔ اسی طرح قلب بھی بمنزلہ حوض کے ہے کبھی علم اس میں حواس خمسہ کی نہر سے لایا جاتا ہے اور کبھی بذریعہ خلوت وعزلت مجاہدہ و ریاضت قلب کو کھود کر صاف کر دیا جاتا ہے اس وقت خود اندرون قلب ہی سے علم کے چشمے جاری ہو جاتے ہیں اور تحصیل علوم میں حواس ظاہرہ کی ضرورت بالکل باقی نہیں رہتی۔ حجۃ الاسلام رسالہ لدنیہ میں فرماتے ہیں، مگر اس باطنی باب کا انفتاح تحصیل علوم اور صلاح وتقویٰ اور ریاضت صادقہ اور مجاہدہ کبیرہ اور مراقبہ صحیحہ اور تفکر پر موقوف ہے۔

"کما قال النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم من عمل بما علم اورثہ اللّٰہ العلم بما لم یعلم وقال صلی اللّٰہ علیہ وسلم من اخلص للّٰہ اربعین صباحا اظہر اللّٰہ تعالٰی ینابیع الحکمۃ من قلبہ علی لسانہ وقال النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم تفکر ساعۃ خیر من عبادۃ

ستين سنة.

فالمتفكر اذا سلك سبيل الصواب يصير من ذوى الالباب وتنفتح روزنة من عالم الغيب فى قلبه فيصير عالما كاملا عاقلاً ملهمًا“ [۱]

ترجمہ: ”رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو علم پر عمل کرے اللہ تعالیٰ اس کو ان چیزوں کا علم عطا فرماتے ہیں جن کو وہ نہیں جانتا اور فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ جو چالیس روز اخلاص کے ساتھ عبادت کرے اللہ تعالیٰ علم و حکمت کے چشمے اس کے قلب سے اس کی زبان پر جاری فرما دیتے ہیں اور فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ ایک گھڑی تفکر اور مراقبہ ساٹھ سال کی عبادت سے بہتر ہے پس متفکر جب صحیح راستہ پر چلے تو وہ عنداللہ اولی الالباب میں سے ہو جاتا ہے اور عالم غیب سے ایک روزن اس کے قلب میں کھل جاتا ہے اس وقت یہ شخص پورا عالم اور عاقل اور ملہم اور مؤید من اللہ ہوتا ہے۔“

اللهم اجعلنا منهم آمين برحمتك يا ارحم الراحمين.

استدراک

شیخ اکبر قدس اللہ سرہ فرماتے ہیں کہ وحی الہام کبھی بذریعہ کتابت بھی ہوتی ہے کہ من جانب اللہ کوئی لکھی ہوئی شئے عطا ہوتی ہے۔

شیخ فتوحات کے ایک اور باب میں فرماتے ہیں کہ اس کتابت کی من جانب اللہ ہونے کی علامت یہ ہوتی ہے کہ ہر جانب سے پڑھی جاسکتی ہے۔

چنانچہ بیت اللہ میں میں نے ایک فقیر کو دیکھا کہ مطاف میں سے ایک لکھا ہوا

---

[۱] رسالہ لدنیہ: صفحہ ۳۷

ورق اترا جس میں اس فقیر کے متعلق یہ لکھا ہوا تھا کہ تو جہنم سے آزاد کر دیا گیا۔ اس ورق کی عجیب شان تھی وہ یہ کہ جس جانب اس ورق کو پلٹا جاتا تھا کتابت بھی اسی جانب پلٹ جاتی تھی۔

اسی طرح ایک مسکین عورت کہ جو میرے تلامذہ میں سے تھی اس نے ایک مرتبہ حق تعالیٰ شانہ کو خواب میں دیکھا کہ حق جل وعلا نے اس کو ایک ورقہ عطا فرمایا ہے وہ ورقہ اس کے ہاتھ میں تھا مٹھی بند تھی کسی طرح کھلتی نہ تھی۔ میں نے اس سے یہ کہا کہ تو اپنے دل سے یہ نیت کر کہ اگر حق تعالیٰ شانہ اس کے ہاتھ کو کھول دیں تو فوراً اس کو نگل جاؤں گی اس نے یہ نیت کی اور ہاتھ کو منہ کے قریب کیا۔ قریب کرتے ہی ہاتھ کھل گیا اور جبراً وقہراً وہ ورق خود بخود منہ میں داخل ہو گیا۔ لوگوں نے مجھ سے دریافت کیا کہ تم کو یہ کس طرح معلوم ہوا۔ میں نے کہا کہ اللہ تعالیٰ نے مجھ کو الہام فرمایا کہ ہماری مشیت یہ ہے کہ اس ورقہ کے مضمون پر کوئی مطلع نہ ہونے پائے۔

اور حق تعالیٰ شانہ نے کتابت لوح محفوظ اور کتابت مخلوقین کے فرق پر مجھ کو مطلع کر دیا ہے اور یہ عجیب علم ہے جس کا ہم کو مشاہدہ ہے اور ہم اس کو دیکھ چکے ہیں۔[1]

الہام انبیاء اور الہام اولیاء میں فرق

حافظ تورپشتی رحمہ اللہ تعالیٰ المعتمد میں فرماتے ہیں کہ الہام انبیاء اور الہام اولیاء میں فرق ظاہر ہے انبیاء کا الہام قطعی ہوتا ہے جس طرح انبیاء کرام معصوم عن الخطاء ہوتے ہیں اسی طرح ان کا الہام بھی معصوم عن الخطاء ہوتا ہے بخلاف الہام اولیاء کے کہ وہ ظنی ہوتا ہے اور خطا سے معصوم نہیں ہوتا یہ فرق ایسا ہی ہے جیسا کہ انبیاء اور اولیاء کے رویا صالحہ میں ہے کہ انبیاء کا رویا صالحہ وحی ہوتا ہے اولیاء کا نہیں۔

امام ربانی رحمہ اللہ تعالیٰ اپنے ایک مکتوب میں فرماتے ہیں۔

---

[1] انتہی کلامہ رحمہ اللہ تعالیٰ کذا فی الیواقیت والجواہر: جلد ۲ صفحہ ۸۳

والہام کہ اولیاء راہست مقتبس از انوار نبوت است واز برکات و فیوض متابعت انبیاء است علیہم الصلوٰۃ والتسلیمات۔[1]

ترجمہ: ”اور اولیاء کا الہام انوار نبوت سے ماخوذ ہوتا ہے اور انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام ہی کی متابعت کے فیض اور برکت سے ہوتا ہے

”فافھم واستقم“

یعنی جس طرح مؤمنین کا ایمان اور ان کی دیگر صفات مثلاً زہد وورع قناعت و توکل، رضا و تسلیم وغیرہ وغیرہ انبیاء کرام ہی کے ایمان اور صفات کا ایک عکس ہوتا ہے اور مؤمنین کے ایمان اور ان کے زہد اور ورع کو انبیاء کرام کے ایمان اور زہد و ورع سے کوئی نسبت نہیں ہوتی۔

اسی طرح الہام مؤمنین کو الہام انبیاء سے کوئی نسبت نہیں ہوتی۔ الہام مؤمنین تو الہام انبیاء کا ایک ادنی سا پرتو اور عکس ہوتا ہے۔ یہ کہاں اس کے ہمسر ہوسکتا ہے این الثری من الثریا۔

نیز الہام اولیاء فقط کسی بشارت یا تفہیم پر مشتمل ہوتا ہے اور الہام انبیاء میں امر و نہی اور احکام الٰہیہ جو بندوں کے متعلق ہوں وہ ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ انبیاء پر اپنے الہام کی تبلیغ واجب ہے اور اولیاء پر نہیں بلکہ اس کا اخفاء اولی ہے جب تک کوئی ضرورت شرعیہ ودینیہ داعی نہ ہو۔

طریق معرفت نبوۃ انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام

علماء ربانیین نے معرفت ورسالت اور صادق وکاذب کی تمیز کے متعدد طریقے ذکر فرمائے ہیں۔

طریق اول: علامہ سیّد محمد بن مرتضی یمانی رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ انبیاء کرام اور

[1] مکتوب: ۲۳ جلد ۳ صفحہ ۴۱

اصحاب مکر وتزویر میں بین فرق ہوتا ہے۔

انبیاء کرام کی پیشانیوں پر تقویٰ اور خشیۃ الٰہی کے انوار۔ آفتاب کی شعاعوں سے زائد تابان اور درخشاں نظر آتے ہیں صلاح اور رشد کے آثار ان کے مبارک چہروں پر عیاں اور نمایاں ہوتے ہیں۔ انابة الی اللہ اور استغفار تحلم اور اصطبار سخا اور ایثار، مساکین وفقراء کی مدارت اور محبت، ضعفاء اور غربا پر تلطف اور رافت اور دیگر محاسن وشمائل ان کے رگ وپے میں سرایت کئے ہوتے ہیں امراء سلاطین سے بے تعلق حب دنیا اور حب شہوات اور اتباع ہویٰ سے بالکلیہ پاک اور منزہ ہوتے ہیں بخلاف اصحاب حیل کے کہ مکر وتزویر کے ظلمات ان کے چہروں پر چھائی ہوئی ہوتی ہے۔

اغنیاء اور سلاطین کو اپنی طرف مائل کرنا تاکہ حطام دنیا اور متاع قلیل ان سے حاصل ہو سکے۔ یہ ان کا اولین مقصد ہوتا ہے لیل ونہار حب شہوات اور حب دنیا اور حب جاہ اور حب مال اور اتباع شہوات میں مستغرق اور منہمک ہوتے ہیں اور حق تعالیٰ شانہ نے اپنے اس ارشاد۔

﴿ أَمْ لَمْ يَعْرِفُوا رَسُولَهُمْ فَهُمْ لَهُ مُنكِرُونَ ۝ ﴾[1]

ترجمہ: ”کیا انہوں نے اپنے رسول کو نہیں پہچانا پس وہ اس کے منکر ہیں۔“

سے اسی جانب اشارہ فرمایا ہے۔

الحاصل: صادقین وکاذبین کے صفات وسمات میں، اقوال وافعال میں، صورت وسیرت میں، ظاہر وباطن میں وہی فرق ہے کہ جو ظلمت اور نور میں ہے لیکن انبیاء کرام کی بعض صفات جمیلہ زائغین کے حق میں موجب فتنہ ہو جاتی ہیں تاکہ تکلیف کا مقصد یعنی ابتلاء وامتحان باقی رہ سکے۔ کما اشار الیہ تعالیٰ شانہ:

---

[1] القرآن: ۶۹/۲۳

﴿وَمَآ اَرْسَلْنَا قَبْلَكَ مِنَ الْمُرْسَلِيْنَ اِلَّآ اِنَّهُمْ لَيَاْكُلُوْنَ الطَّعَامَ وَيَمْشُوْنَ فِى الْاَسْوَاقِ وَجَعَلْنَا بَعْضَكُمْ لِبَعْضٍ فِتْنَةً ط﴾ [1]

ترجمہ: ”اور نہیں بھیجا ہم نے آپ سے پہلے پیغمبروں کو مگر اس حال میں کہ وہ کھانا بھی کھاتے تھے اور بازاروں میں بھی چلتے تھے اور ہم نے ایک کو دوسرے کے لئے امتحان اور آزمائش بنایا ہے۔“

امام راغب اصفہانی رحمہ اللہ تعالیٰ نے کتاب ”الذریعة الی مکارم الشریعة“ میں ایک باب ما یعرف به صحبة النبوة کے عنوان سے اسی غرض کے لئے منعقد فرمایا ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں۔

”لكل نبی آیاتان احداهما عقلية يعرفها اولوا البصائر من الشهداء والصالحين ومن يجرى مجراهم والثانية حسية يدركها اولوا الابصار من العامة“

ترجمہ: ”ہر نبی کے لئے دو قسم کی نشانیاں ہیں ایک عقلی جس کو ارباب بصیرت شہداء وصالحین پہچانتے ہیں اور دوسری حسی کہ جس کو عوام پہچانتے ہیں۔“

”فالاولى مالهم من اصولهم الزكية وصورهم المرضية وعلومهم الباهرة ودلائلهم المتقدمة عليهم والمستصحبة وانوارهم الساطعة التى لا تخفى على اولى البصائر كما قال الشاعر فى مدح النبى صلى الله عليه وسلم“

ترجمہ: ”عقلی نشانی انبیاء کرام کے پاکیزہ اصول پسندیدہ صورتیں ہیں

[1] القرآن: ۲۰/۲۵

اوران کے علوم قاہرہ اور دلائل و براہین سابقہ و لاحقہ اوران کی وہ انوار و برکات ہیں کہ جن کا ارباب بصیرت پر مخفی رہنا ناممکن ہے جیسا کہ کسی شاعر نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مدح میں کہا ہے" ؎

لو لم تكن فيه آيات مبينة
كانت بديهته تنبيك بالخير

ترجمہ: "اگر بالفرض آپ میں خدا کی اور نشانیاں نہ بھی ہوتیں تو آپ کا ظاہر ہی باطن کی خبر دینے کے لئے کافی تھا۔"

"وذلك ان حق النبي صلى الله عليه وسلم ان يكون من اكرم تربة فى العالم وحيث يكون عقل اربابها اوفر ولهذا لم يبعث نبى من الاطراف التى تضعف عقول اصحابها ولهذا قال تعالىٰ ان الله اصطفى آدم و نوحا الاية ونبه بقوله ذرية بعضها من بعض انه جعل النبوة فى بيت واحد ولا تخرج عنه لكونه اشرف ويجب ان يكون عليهم انوار تروق من رأها واخلاق تتملق من ابتلاها كما قال تعالىٰ والقيت عليك محبة منى وقال لنبينا صلى الله عليه وسلم انك لعلى خلق عظيم ويجب ان يكون كلامه ذا حجة وبيان يشفى سامعه اذا كان مخصصا بنور العقل ولذلك قال تعالىٰ وكذالك اوحينا اليك روحا من امرنا الايه وهذه الاحوال اذا حصلت لا يحتاج ذوالبصيرة معها الى معجزة ولا يطلبها كما لا يطلب الانبياء من الملائكة فيما يخبرونهم به حجة ولذا ما عرض النبى صلى الله

علیه وسلم علی الصدیق رضی الله عنه الاسلام تلقاه بالقبول حتی قال ما احد عرضت علیه الاسلام الا کانت له کبوة غیر ابی بکر فانه لم یتأمل فیه واما الایة الثانیة فهی المعجزة التی تدرکها الحواس وذلك یطلبه احد رجلین اما ناقص عن الفرق بین الکلام الالهی وبین البشری وعن ادراك سائر ماتقدم ذکره فیحتاج ما یدرکه حسه لقصوره عن ادراك ذالك واما ناقص ومع نقصه هو معاند فقصده بما یطلبه العناد کما قال تعالٰی حکایة عن الکفار وقالوا لن نؤمن لك حتی تفجرلنا من الارض ینبوعا ﴿۹۰﴾ الایة کذا فی کتاب الذریعة الی مکارم الشریعة صفحه۲۹"

ترجمہ: ''اس لئے کہ ہر نبی کے لئے یہ ضروری ہے کہ وہ ایسے خاندان سے ہو کہ جو سب سے اعلیٰ ارفع ہو اور سب سے زیادہ عاقل اور فہیم ہو۔ اسی لئے کوئی نبی ضعیف العقل خاندان سے نہیں ہوا اور اسی لئے حق تعالیٰ شانہ کا ارشاد ہے کہ اللہ نے آدم علیہ السلام اور نوح علیہ السلام کو منتخب فرمایا۔ ''الی اخر الایة'' اور ''ذریة بعضها من بعض'' سے اس طرف اشارہ فرمایا کہ اللہ نے نبوت کو اسی گھرانہ میں منحصر کر دیا ہے نبوت اس گھرانہ سے نہ نکلے گی اس لئے کہ یہ گھرانہ سب سے بہتر ہے۔ انبیاء کرام کے چہروں پر ایسے انوار نمایاں ہوتے ہیں کہ جو دیکھنے والے کو ہیبت میں ڈالتے ہیں اور ان کے اخلاق لوگوں کو اپنی طرف جذب کرتے ہیں جیسا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے قصہ میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ اے موسیٰ علیہ السلام میں نے اپنی طرف سے تیرے اوپر محبت ڈال

دی ہے اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے حق میں ہے "انك لعلی خلق عظیم" آپ بڑے اخلاق پر ہیں اور نبی کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ اس کا کلام مدلل اور مبرہن اور سامع کے لئے شافی ہو بشرطیکہ سامع نور عقل سے منور ہو اور اسی لئے ارشاد الٰہی ہے "وکذالك اوحینا الیك روحا من امرنا الایة" اور ان احوال کے حاصل ہونے کے بعد صاحب بصیرت کو کسی معجزہ کی حاجت باقی نہیں رہتی اور نہ وہ معجزہ طلب کرتا ہے جیسا کہ انبیاء کرام در بارہ وحی، ملائکہ سے کوئی حجت اور دلیل نہیں طلب کرتے اور اسی وجہ سے جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ پر اسلام پیش کیا تو ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فوراً قبول کر لیا چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ میں نے جس کسی پر بھی اسلام پیش کیا اس کو کچھ نہ کچھ تذبذب ہوا۔ سوائے ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے کہ اس نے اسلام کے قبول کرنے میں تامل نہیں کیا۔

دوسری نشانی معجزہ ہے جس کا حواس ظاہر ادراک کرتے ہیں معجزہ کا طالب یا تو وہ ناقص العقل ہوتا ہے کہ جو کلام الٰہی اور کلام بشری میں فرق نہیں کر سکتا اور نہ امور سابق الذکر کا ادراک کر سکتا ہے اس لئے ایسی شئے کا محتاج ہوتا ہے کہ جو حس ظاہر سے مدرک ہو سکے یا معجزہ کا طالب کوئی معاند ہوتا ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے کفار کا کلام نقل کیا ہے کہ: کافروں نے یہ کہا کہ ہم آپ پر ایمان ہرگز نہ لائیں گے جب تک آپ ہمارے لئے زمین سے کوئی چشمہ جاری نہ کر دیں۔"[1]

امام راغب رحمہ اللہ تعالیٰ ایک دوسرے باب میں فرماتے ہیں کہ علوم نبویہ کا

[1] کذا فی کتاب الذریعۃ

ادراک جب میسر ہوتا ہے کہ جب عقل سلیم ہو اور اتباع ہوی اور زیغ اور عناد سے پاک ہو۔

سلامت عقل بمنزلہ دوائے صحت ہے اور علوم نبویہ بمنزلہ غذائے لطیف ہیں کہ جن کے استعمال سے صحت کی حفاظت مقصود ہے۔

پس جس طرح مریض الجسم کو قبل از صحت غذائے لطیف کا استعمال مضر پڑتا ہے۔ اسی طرح مریض النفس اور سقیم القلب کو روحانی غذا یعنی تعلیم انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام مفید نہیں ہوتی تاوقتیکہ اتباع ہوی اور زیغ اور عناد کے روحانی مرض سے صحت یاب نہ ہو جائے بلکہ مضر ہوتی ہے۔

کما قال تعالٰی شانہ: ﴿وَاِذَا مَآ اُنْزِلَتْ سُوْرَةٌ فَمِنْهُمْ مَّنْ يَّقُوْلُ اَيُّكُمْ زَادَتْهُ هٰذِهٖٓ اِيْمَانًا ۚ فَاَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فَزَادَتْهُمْ اِيْمَانًا وَّهُمْ يَسْتَبْشِرُوْنَ ۝ وَاَمَّا الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ فَزَادَتْهُمْ رِجْسًا اِلٰى رِجْسِهِمْ وَمَاتُوْا وَهُمْ كٰفِرُوْنَ ۝﴾[1]

تَرجَمہ: ''جب کوئی جدید سورت نازل کی جاتی ہے تو بعض بطور تمسخر یہ کہتے ہیں کہ اس سورت نے کس کو ایمان کی ترقی دی۔ لیکن جو لوگ حقیقۃً مؤمن ہیں تو یہ سورت ان کے ایمان میں ترقی دیتی ہے اور وہ اس ایمان کی ترقی سے مسرور ہوتے ہیں اور جن کے قلوب میں نفاق کا مرض ہے تو یہ سورت ان کی گندگی میں اور اضافہ کر دیتی ہے اور کفر ہی کی حالت میں مرتے ہیں۔''

شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ تعالیٰ شرح عقیدہ اصفہانیہ میں لکھتے ہیں کہ جب معمولی امور میں صدق و کذب مخفی نہیں رہتا اور صادق کاذب سے ممتاز ہو جاتا ہے تو

[1] القرآن: ۹/۱۲۴، ۱۲۵

نبوت و رسالت کی شان تو بہت ہی اعلیٰ اور ارفع ہے وہاں صدق و کذب کیسے ملتبس ہوسکتا ہے اور ایک افضل اور ارذل کا، اکمل اور انقص کا امتیاز کیسے مخفی رہ سکتا ہے۔

صادق کا صدق اور کاذب کا کذب ضرور ظاہر ہو کر رہتا ہے انسان اپنی کسی سیرت اور عادت کو کتنا ہی کیوں نہ چھپائے مگر چند ہی روز میں صفحات وجہ اور فلتات لسان پر اس کا ظہور ہو جاتا ہے

ومهما تكن عند امرى من خليقة
وان خالها تخفى على الناس تعلم

ترجمہ: ''انسان میں جو فضیلت بھی ہوتی ہے وہ ظاہر ہو جاتی ہے اگرچہ وہ انسان یہ خیال کرے کہ یہ ظاہر نہ ہوگی۔''

شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ تعالیٰ نے شرح عقیدہ اصفہانیہ میں معرفت بالنبوۃ کے طریق پر مفصل کلام کیا ہے۔ عنقریب ان طرق کو مختصراً ہدیہ ناظرین کریں گے۔

طریق دوم: حافظ فضل اللہ التورپشتی رحمہ اللہ تعالیٰ نے اثبات نبوت کے دو طریقے ذکر فرمائے ہیں۔[1]

اول یہ کہ چند بندگان خدا کا کہ جو امانت و دیانت، حسن صورت اور حسن سیرت اور برگزیدگی حسب و نسب اور علو ہمت اور کمال عقل و فطانت اور کمال فہم و فراست کے ساتھ موصوف ہوں۔ ان کا یہ دعوی فرمانا کہ ہم اللہ کے نبی اور اس کے رسول ہیں تمہاری ہدایت کے لئے بھیجے گئے ہیں اور پھر ان کے ہاتھ سے ایسے افعال کا ظاہر ہونا کہ جو قدرت بشری اور طاقت انسانی سے بالکل خارج ہوں۔ مثلاً حضرت ابراہیم کے لئے آگ کا برد اور سلام ہو جانا اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے لئے ایک پارہ چوب کا ثعبان مبین ہو جانا اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی دعا سے مردوں کا زندہ ہو جانا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے انگشتان مبارک سے پانی کا جاری ہونا اور علی ہذا اسی قسم

---

[1] المعتمد فی المعتقد صفحہ ۱۳۵۸

کے افعال کا ظاہر ہونا کہ جن کو سوائے اس عزیز حکیم اور قدیر علیم کے کوئی نہیں کر سکتا۔ ان کے صادق اور مصدوق اور مرسل من اللہ ہونے کی روشن دلیل ہے۔

خدا کے خاص افعال کا ان خاص بندوں کے ہاتھ پر ظاہر ہونا ان کے فرستادگان خدا ہونے کی برہان مبین اور آیۂ بینہ ہے۔ اس قسم کی براہین اور آیات بینات کا ظہور کسی کذاب اور مفتری کے ہاتھ پر ناممکن ہے۔

چنانچہ ساحرین فرعون معجزہ عصا کو دیکھتے ہی سمجھ گئے کہ یہ قدرت الٰہی کا ایک کرشمہ ہے سحر نہیں اس لئے کہ سحر، سحر کو نیست نہیں کر سکتا۔ یہ کوئی خدا ہی کا فعل ہے کہ جس نے تمام ساحرین کے سحر کو یکلخت ہباءً منثورا بنا دیا۔ اور ان کو اس امر کا پورا یقین ہو گیا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام معاذ اللہ ہماری طرح کوئی ساحر نہیں بلکہ خدا کے فرستادہ ہیں جب ہی تو خدا کے افعال اور اس کی قدرت کے ایسے عجیب وغریب کرشمے ان کے ہاتھ پر ظاہر ہو رہے ہیں۔

طریقہ سوم: یہ کہ انبیاء کرام کا گزشتہ اور آئندہ کے حوادث اور فتن اور اشراط ساعت کی اطلاع دینا اور پھر سر مو کسی بات میں فرق نہ نکلنا۔

فناء دنیا کے بعد حشر ونشر، جنت وجہنم، ثواب وعقاب کے احوال بیان فرمانا اور تمام انبیاء سابقین ولاحقین کا باوجود اختلاف زمان اور اختلاف مکان کے متفق اللسان اور ایک دوسرے کا مصدق ہونا یہ بھی ان کے مرسل من اللہ اور فرستادہ خدا ہونے کی دلیل ہے۔

﴿وَلَوْ كَانَ مِنْ عِنْدِ غَيْرِ اللّٰهِ لَوَجَدُوْا فِيْهِ اخْتِلَافًا كَثِيْرًا ۝﴾[1]

ترجمہ: ”اگر وہ غیر اللہ کے پاس سے ہوتا تو اس میں بہت اختلاف پاتے۔“

---

[1] القرآن: ۸۲/۴

طریقہ چہارم: حجۃ الاسلام امام غزالی قدس سرہ ”المنقذ من الضلال“ میں لکھتے ہیں کہ کسی نبی کی نبوت کا علم اس کے حالات معلوم ہونے پر موقوف ہے خواہ وہ حالات مشاہدہ سے معلوم ہوئے ہوں یا تواتر سے۔ مثلاً جو شخص علم طب اور علم فقہ سے کچھ بھی واقف ہوگا وہ فقہاء اور اطباء کو ان کے حالات سے معلوم کرسکتا ہے۔

جس طرح امام شافعی رحمہ اللہ تعالیٰ کا فقیہ ہونا اور جالینوس کا طبیب ہونا مشاہدہ احوال یا سماع اقوال اور مطالعہ تصانیف سے معلوم ہوسکتا ہے اور اگر پھر بھی کسی کو شک ہے تو جس طرح ایک طبیب کا طبیب ہونا اس کی بتلائی ہوئی دواؤں کے تجربہ سے معلوم ہوسکتا ہے اسی طرح ایک طبیب روحانی (نبی اور رسول) کا طبیب روحانی ہونا اسی طرح معلوم ہوسکتا ہے کہ اس کے تعلیم کردہ اذکار وعبادات پر عمل کیا جائے ان پر عمل کرنے سے خود بخود تجربہ ہو جائے گا کہ امراض قلبیہ اور اسقام روحانیہ کا قلب سقیم سے کس طرح ازالہ ہوتا ہے اور کس طرح وہ مریض قلب چند ہی روز میں ان مہلک امراض سے شفایاب ہو جاتا ہے اور اگر کوئی فلسفی المزاج مریض طبیب کا نسخہ دیکھ کر یہ کہے گا کہ گل بنفشہ اور زکام میں کیا مناسبت ہے۔ اور پھر یہ کہ دواؤں کی مقدار میں اس قدر تفاوت کیوں ہے کسی کا وزن چار ماشہ ہے اور کسی کا دو اور کسی کا تین ماشہ ہے۔ نیز یہ کہ اس خاص مقدار کو مرض کے ازالہ میں کیا دخل ہے۔ بلکہ وہ اور دو چار فلسفیانہ دلیلیں بھی اس پر قائم کرے گا کہ گل بنفشہ اور ملہٹی جو کہ محض ایک گھاس ہے وہ درد سر کے لئے جو ایک غیر محسوس اور غیر مبصر شئے ہے کیسے مفید اور مزیل ہوسکتی ہے۔ طبیب حاذق اس احمق اور سفیہ مریض سے یہی کہے گا کہ تمہارے مرض کی دوا یہی ہے دو تین روز تک صبح وشام اس کا استعمال کرو تم کو خود معلوم ہو جائے گا کہ شفا ہوتی ہے یا نہیں۔ باقی گل بنفشہ کی زکام سے مناسبت اور ادویہ کے مختلف الاوزان ہونے کی حکمت نہ بیان کرے گا۔

اسی طرح اطباء روحانی یعنی انبیاء و مرسلین سے اگر کوئی سقیم القلب فلسفی یہ

دریافت کرے کہ صوم وصلوۃ، حج وزکوۃ کو استقام قلبیہ اور امراض روحانیہ کے ازالہ میں کیا دخل ہے اور پھر صلوۃ کے مختلف الانواع اور مختلف المقادیر ارکان سے ترکیب کی کیا وجہ ہے کہ قیام تو اس قدر طویل کر دیا گیا اور رکوع کو اس قدر قصیر اور پھر رکوع ایک اور سجود دو۔ پھر صبح کی دو اور ظہر وعصر کی چار چار اور مغرب کی تین رکعتیں کیوں ہیں۔ اور نیز اس مجموعہ کو صیانت عن الفحشاء والمنکر میں کیا دخل ہے تو وہ اطباء روحانی یعنی انبیاء ومرسلین اس مریض روح اور سقیم قلب سے کہ جس کے روح اور قلب میں فلسفہ کے مہلک مرض نے ناسور ڈال دیئے ہیں یہ فرمائیں گے۔

﴿يَا أَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَاءَتْكُمْ مَوْعِظَةٌ مِنْ رَبِّكُمْ وَشِفَاءٌ لِمَا فِي الصُّدُورِ وَهُدًى وَرَحْمَةٌ لِلْمُؤْمِنِينَ ۝﴾ [1]

ترجمہ: ''اے لوگو یہ تمہارے رب کی جانب سے نصیحت اور امراض قلبیہ کے لئے شفاء ہے۔ اور مؤمنین کے لئے ہدایت اور رحمت ہے۔''

حیرت اور صد حیرت ہے کہ جب ایک نجومی کہ جس کا کذب بارہا تجربہ میں آچکا ہو وہ اگر یہ کہہ دے کہ فلاں فلاں ساعت میں جب فلاں فلاں ستارہ طلوع کرے تو یہ کام ہرگز نہ کرنا چاہئے تو سب سے پہلے یہی احمق اور سفیہ فلسفی اس کی تصدیق کے لئے تیار ہو جائے گا۔

لیکن جب اللہ کا نبی اور اس کا صادق مصدوق رسول کہ جس کا صدق اس کے دشمنوں کو بھی مسلم ہو اس کے اعداء بھی اس کو صادق امین کہتے ہوں۔ وہ اگر یہ کہتا ہے کہ طلوع اور غروب اور استواء نہار کے وقت نماز مت پڑھو تو یہ نادان فلسفی کسی خنار و مکار کے شعبدہ کی تصدیق کر دے گا لیکن حضرت موسیٰ علیہ السلام کے معجزہ عصا پر کہ جس نے ساحرین فرعون کے سحر کو یکلخت نیست و نابود کر دیا۔ ایمان نہ لائے گا۔ بلکہ دلیلیں اس پر قائم کر دے گا کہ ایک پارہ چوب کا ثعبان مبین ہو جانا

[1] القرآن: ۱۰/ ۵۷

قطعاً ناممکن اور محال ہے۔

طریقہ پنجم:[1] انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام کا پیشتر ہی سے علی رؤس الاشہاد یہ اعلان فرمانا کہ جو نبوت ورسالت کی تصدیق کرے گا وہ مظفر ومنصور اور محمود العاقبۃ ہوگا اور جو تکذیب کرے گا وہ ذلیل اور رسوا ہوگا عذاب الٰہی سے ہلاک اور برباد ہوگا۔ اور پھر ہو بہو اسی طرح واقع ہونا اور سر مو اس میں تفاوت نہ ہونا اگر یہ ان کی صداقت اور ان کے مرسل من اللہ ہونے کی کھلی ہوئی دلیل نہیں تو اور کیا ہے۔

طریق ششم:[2] دریائے نیل کی قوم موسیٰ اور قوم فرعون میں یہ تفریق کہ قوم موسیٰ کے پار ہو جانے کے لئے منفلق اور جدا ہو جانا اور اس کے بعد ہی فوراً قوم فرعون کے غرق کے لئے رواں ہو جانا۔

ریح عقیم کا قوم عاد میں سے فقط مکذبین اور مستہزئین کو اہلاک کے لئے منتخب کر لینا اور مؤمنین قانتین کو مستثنیٰ کر دینا، حجارۃ من طین کا فقط ایک بیت من المسلمین کو چھوڑ کر چن چن کے کافروں پر برسنا اور وہ بھی اس شان سے کہ ہر پتھر پر ایک کافر کا نام لکھا ہونا اور پھر اس پتھر کا اسی کے سر پر گرنا جس کے لئے نامزد ہو چکا ہے اور اس میں کسی قسم کی خطا نہ ہونا۔ الحاصل آسمان سے اس طرح پتھروں کا برسنا وغیرہ ذالك، کیا یہ اس امر کی بین دلیل نہیں ہے کہ مؤمنین کی یہ غیبی نصرت اور آسمانی اعانت فقط ایمان بالانبیاء اور تصدیق بالرسل کا ثمرہ ہے اور مکذبین کی یہ تدمیر اور ان کا اس طرح استیصال محض تکذیب انبیاء اللہ کا نتیجہ ہے۔

چنانچہ فرعون کو غرق کے وقت یہ منکشف ہو گیا کہ بنی اسرائیل کے لئے دریائے نیل کا یہ انفلاق حضرت موسیٰ علیہ السلام پر ایمان لانے کا ثمرہ ہے اور قبطیوں کے غرق کے لئے فوراً رواں ہو جانا محض موسیٰ علیہ السلام کی تکذیب کا نتیجہ ہے اسی لئے اس نے فوراً کلمہ ایمان زبان سے کہا مگر اس وقت کہ جب کوئی نفع نہیں۔

---

[1] کذافی شرح العقیدۃ الاصفہانیہ صفحہ ۹۱ [2] شرح عقیدہ اصفہانیہ صفحہ ۹۲

قال تعالیٰ: ﴿حَتّٰۤی اِذَاۤ اَدْرَکَهُ الْغَرَقُ قَالَ اٰمَنْتُ اَنَّهٗ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا الَّذِیْۤ اٰمَنَتْ بِهٖ بَنُوْۤا اِسْرَآءِیْلَ وَاَنَا مِنَ الْمُسْلِمِیْنَ﴾[1]

ترجمہ: ''یہاں تک کہ جب غرق نے اس کو پکڑا تو یہ کہا کہ ایمان لایا میں اس خدا پر کہ جس خدا پر بنی اسرائیل ایمان لائے اور اس کے سوا کوئی معبود نہیں اور میں مسلمانوں سے ہوں۔''

اور علیٰ ہذا حضرت ابراہیم علیہ السلام کے لئے دہکتی ہوئی آگ کا یکلخت بردوسلام ہو جانا اس کی واضح دلیل ہے کہ اس نعم المولیٰ اور نعم النصیر کی اعانت اور نصرت ان کی ساتھی ہے ورنہ انسان کا یہ کام نہیں کہ وہ ایسی دہکتی آگ کو بردوسلام بنا سکے۔

اور علیٰ ہذا حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے دست مبارک پھیرنے سے اکمہ[2] اور اکمہ (کوڑھی) اور ابرص کا باذن اللہ شفایاب ہو جانا اور مردوں کا باذن اللہ زندہ ہو جانا کہ جس سے تمام اطباء اور حکماء عاجز ہیں اور تھے اور قیامت تک رہیں گے۔ یہ تائید الٰہی نہیں تو اور کیا ہے ؎

صد ہزاراں طب جالینوس بود
پیش عیسیٰ ودمش افسوس بود

طریق ہفتم: انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام کی لائی ہوئی شریعت اور ان کے علوم میں ذرا غور کرنے سے یہ بات بالبداہۃ معلوم ہو جاتی ہے کہ اس قسم کے علوم و معارف کا صدور اسی شخص سے ہو سکتا ہے کہ جو خدا کا برگزیدہ اور سب سے زائد علم اور سب سے زائد سچا اور سرتاپا محاسن و مکارم محامد وشمائل والا ہو، علوم و معارف کا منبع اور سرچشمہ ہو۔ بخلاف کسی کذاب ومفتری اور فاسق وفاجر اور گمراہ وجاہل کے کہ اس سے اس قسم کے پاکیزہ علوم و معارف کا ظاہر ہونا ناممکن اور محال ہے۔[3]

شیخ الاسلام حافظ ابن تیمیہ رحمہ اللہ تعالیٰ علم بالنبوۃ کے ان طرق اور اسباب کو ذکر

---

[1] القرآن: ۱۰/۹۰ [2] مادر زاد اندھا کوڑھی [3] شرح العقیدۃ الاصفہانیہ صفحہ ۹۲

کر کے فرماتے ہیں کہ حق یہ ہے کہ علم بالنبوۃ کے طریقے مختلف اور متعدد ہیں۔ نبوت کا علم کبھی معجزات سے ہوتا ہے اور کبھی بغیر معجزات کے مختلف طرق اور متعدد اسباب سے نبوت کا علم حاصل ہو سکتا ہے ان طرق و اسباب کی تحدید اور انضباط بہت دشوار ہے علم کے اسباب غیر محدود ہیں ان کی تحدید کیونکر ممکن ہے یہی وجہ ہے کہ محدثین کے نزدیک جرح مبہم تو مقبول نہیں، تعدیل مبہم مقبول ہے۔ اس لئے کہ تعدیل کا علم تو صدہا طرق سے ممکن ہے اس کے طریقے منضبط نہیں ہو سکتے۔ جرح کے اسباب منضبط ہو سکتے ہیں علی ہذا کسی کا صدق ایک طریق سے نہیں صدہا طرق سے معلوم ہو سکتا ہے اس کے اخلاق و عادات سے طول معاشرہ سے اور کثرۃ ممارستہ سے، خلوت و جلوت کے احوال کی تحقیق و تفتیش سے۔

یہی وجہ ہے کہ قضاۃ کو جب گواہوں کا حال اور ان کا صدق اور کذب معلوم کرنا ہوتا ہے تو اہل محلّہ سے دریافت کرتے ہیں اس لئے کہ اہل محلّہ کو اس کے صدق و کذب کا پورا تجربہ ہوتا ہے۔ الحاصل صدق و کذب کا مخفی رہنا قریب قریب ناممکن ہے انسان کا صدق اور کذب چند صحبتوں اور چند مجلسوں ہی میں معلوم ہو جاتا ہے۔ جب کہ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ تعالیٰ، سعید بن المسیب، امام شافعی رحمہ اللہ تعالیٰ، مالک بن انس، سفیان ثوری، یحی بن سعید القطان، امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ تعالیٰ کا صدق چند ہی صحبتوں میں آفتاب سے زائد روشن نظر آنے لگتا ہے تو انبیاء و مرسلین کا صدق تو ہزارہا آفتاب و ماہتاب سے کہیں زائد روشن ہوگا۔ "بلی وانا علی ذلك من الشاهدين"

بایزید بسطامی اور فضیل بن عیاض قدس اللہ اسرارہم کا صدق چند مجلسوں ہی میں جب اس درجہ منکشف ہو سکتا ہے کہ لیل کا نہار ہونا اور نہار کا لیل ہونا تو انسان کے نزدیک ممکن ہے مگر بایزید اور فضیل بن عیاض کا کاذب ہونا ناممکن اور محال ہے تو انبیاء و مرسلین اور المصطفین الاخیار کا صدق کیوں نہیں منکشف ہو سکتا۔

"وايضا فالمتنبى الكذاب كمسيلمة والعنسى ونحوهما يظهر لمخاطب من كذبه فى اثناء الامور اعظم مما يظهر من كذب غيره فانه اذا كان الاخبار عن الامور المشاهدة لا بد ان يظهر كذب الكاذب فما الظن بمن يخبر عن الامور الغائبة التى تطلب ومن لوازم النبوة التى لابدمنها الاخبار عن الغيب الذى انبأه اللّٰه تعالٰى فان من لم يخبر عن غيب لا يكون نبيا"

ترجمہ: "جھوٹا مدعی نبوت جیسا مسیلمہ کذاب اور اسود عنسی وغیرہما اس قسم کے لوگوں کا کذب دوسرے لوگوں سے بہت زیادہ ظاہر ہو جاتا ہے۔ اس لئے کہ جب مشاہد اور محسوس امور میں کاذب کا کذب ضرور ظاہر ہو کر رہتا ہے تو جو مدعی نبوت غیب کی جھوٹی خبریں دیتا ہو اس کا کذب کیسے مخفی رہ سکتا ہے کیونکہ نبوت کے لوازم سے ہے کہ جو نبی ہوتا ہے وہ اس غیب سے کہ جو اس کو اللہ نے بتلایا ہے لوگوں کو مطلع کرتا ہے۔ پس جو غیب سے خبر نہ دے وہ نبی نہ ہوگا۔"

"المتنبى عن الامور الغائبة عن حواسهم من الحاضرات والمستقبلات والماضيات فلا بد ان يكذب فيها ويظهر لهم كذبه وان كان قد يصدق احيانا فى شىء كما يظهر كذب الكهان والمنجمين ونحوهم و كذب المدعين للدين والولاية والمشيخة بالباطل فان الواحد من هؤلاء وان صدق فى بعض الوقائع فلا بد ان يكذب فى غيرها بل يكون كذبه اغلب من صدقه بل تتناقض اخباره واوامره."

ترجمہ: ''پس متنبی کاذب جب ماضی اور حال اور مستقبل کے امور غائبہ کی خبر دے گا تو ضرور ہے کہ جھوٹ بولے اور اس کا جھوٹ ظاہر ہو اگرچہ وہ کسی وقت سچ بھی نکل آئے جیسا کہ کاہنین اور منجمین اور مدعیان ولایت کا کذب ظاہر ہو کر رہتا ہے کیونکہ ان میں سے کوئی اگر کسی واقعہ میں سچا بھی ہو جائے تو دوسرے واقعات میں ضرور کاذب نکلتا ہے بلکہ اس کا کذب اس کے صدق سے بہت زیادہ ہوگا۔ اس کی خبریں متضاد اور متناقض ہوں گی۔''

''وهذا امر جرت بسنة الله لن تجد لها تبديلا''

ترجمہ: ''اسی طرح اللہ کی سنت جاری ہے جس کو کوئی بدل نہیں سکتا۔''

''قال الله تعالیٰ ولو كان من عند غير الله لوجدوا فيه اختلافا كثيرا ﴿﴾ واما النبی الصادق المصدوق فهو فيما يخبربه عن الغيوب توجد اخبار صادقة مطابقة وكلما زادت اخباره ظهر صدقه وكلما قويت مباشرته وامتحانه ظهر صدقه كالذهب الخالص الذی كلما سبك خلص وظهر جوهره بخلاف المغشوش فانه عند المحنة ينكشف ويظهر ان باطنه خلاف ظاهره وهذا جاء فی النبوات المتقدمة ان الكذب لا يدوم امره اكثر من مدة قليلة اما ثلثين سنة واما اقل فلا يوجد مدعی النبوة الا ولا بد ان ينكشف ستره ويظهر امره والانبياء الصادقون لا يزال يظهر صدقهم آه.''[1]

ترجمہ: ''قال تعالیٰ: وَلَوْ كَانَ مِنْ عِنْدِ غَيْرِ اللّٰهِ لَوَجَدُوْا

[1] شرح العقیدۃ الاصفہانیہ: صفحہ ۱۳

فِيْهِ اخْتِلَافًا كَثِيْرًا.[۱] یعنی اگر غیر اللہ کے پاس سے ہوتا تو اس میں بہت اختلاف پاتے لیکن نبی صادق کی تمام خبریں صادق اور مطابق واقع ہوتی ہیں اور جتنی اس کی خبریں زیادہ ہوتی ہیں اور جتنا اس کا زائد امتحان کیا جاتا ہے اتنا ہی زائد اس کا صدق ظاہر ہو جاتا ہے جیسا کہ خالص سونا جتنا بھی اس کو تپایا جائے اتنا ہی اس کا خالص ہونا ظاہر ہوتا جائے گا بخلاف کھوٹے سونے کے کہ امتحان سے فوراً اس کا کھوٹ ظاہر ہو جاتا ہے۔ اور اس کے باطن کا خلاف ظاہر ہونا بھی منکشف ہو جاتا ہے اسی لئے پچھلی نبوتوں میں یہ آیا ہے کہ کذاب کا قصہ ہمیشہ کے لئے مشتبہ نہیں رہ سکتا تیس سال یا کچھ کم وبیش ہی میں بات کھل جاتی ہے۔ کوئی مدعی نبوت ایسا نہیں پایا گیا کہ جس کا پردہ چند ہی روز میں فاش نہ ہو گیا ہو بخلاف انبیاء صادقین کے کہ ہمیشہ ان کا صدق ہی ظاہر ہوتا رہتا ہے۔"

نبوۃ ورسالت محض عطیہ الٰہی اور موہبہ ربانی ہے

نبوۃ ورسالت کوئی اکتسابی شئے نہیں کہ جو مجاہدات وریاضت وغیرہ سے حاصل ہو سکے محض حق تعالیٰ شانہ کا عطیہ ہے۔

کما قال تعالیٰ: ﴿اَللّٰهُ اَعْلَمُ حَيْثُ يَجْعَلُ رِسَالَتَهٗ ۭ﴾[۲]

ترجمہ: "اللہ خوب جانتا ہے کہ کہاں رکھے اپنی پیغمبری کو۔"

﴿رَفِيْعُ الدَّرَجٰتِ ذُو الْعَرْشِ ۚ يُلْقِي الرُّوْحَ مِنْ اَمْرِهٖ عَلٰى مَنْ يَّشَاۗءُ مِنْ عِبَادِهٖ لِيُنْذِرَ يَوْمَ التَّلَاقِ ۝﴾[۳]

ترجمہ: "وہ بلند مرتبوں والا اور عرش کا مالک ہے۔ ڈالتا ہے روح اپنے حکم سے جس پر چاہتا ہے اپنے بندوں میں سے کہ وہ ڈرائے ملاقات

---

[۱] القرآن: ۴/۸۲ [۲] القرآن: ۶/۱۲۴ [۳] القرآن: ۴۰/۱۵

کے دن (قیامت) سے۔"

كما قال تعالىٰ: ﴿يُنَزِّلُ الْمَلٰٓئِكَةَ بِالرُّوْحِ مِنْ اَمْرِهٖ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖٓ اَنْ اَنْذِرُوْٓا اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنَا فَاتَّقُوْنِ ۝﴾[1]

ترجمہ: "اتارتا ہے اللہ تعالیٰ فرشتوں کو وحی دے کر اپنے حکم سے جس پر چاہے اپنے بندوں میں سے یہ کہ آگاہ کر دو کہ کوئی معبود نہیں بجز میرے پس مجھ سے ڈرو۔"

كما قال تعالىٰ: ﴿مَا يَوَدُّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ وَلَا الْمُشْرِكِيْنَ اَنْ يُّنَزَّلَ عَلَيْكُمْ مِّنْ خَيْرٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ ۝ وَاللّٰهُ يَخْتَصُّ بِرَحْمَتِهٖ مَنْ يَّشَآءُ ۭ وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ ۝﴾[2]

ترجمہ: "نہیں چاہتے کافر، اہل کتاب اور نہ مشرکین کہ نازل کی جائے تم پر کوئی بھلائی تمہارے رب کی طرف سے اور اللہ خاص کر لیتا ہے اپنی رحمت کے لئے جس کو چاہتا ہے اور اللہ بڑے فضل والا ہے۔"

حجۃ الاسلام امام غزالی قدس اللہ سرہ معارج القدس میں لکھتے ہیں کہ جس طرح نوع انسان کی انسانیت اور نوع ملائک کی ملکیت مکتسب نہیں۔ اسی طرح نوع انبیاء و مرسلین کی نبوت و رسالت بھی مکتسب نہیں۔

﴿ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ﴾

ترجمہ: "یہ بڑائی اللہ کی ہے دیتا ہے جس کو چاہے اور اللہ کا فضل بڑا ہے۔"

---

[1] القرآن: ۲/۱۶ [2] القرآن: ۲/۱۰۵

امکان خوارق!

سنتے بنہاد و اسباب و طرق
طالبان را زیر ایں از رق تتق
بیشتر احوال برسنت رود
گاہ قدرت خارق سنت شود
سنت و عادت نہادہ بامزہ
باز کردہ خرق عات معجزہ[۱]

جو امر بلا اسباب عادیہ خلاف عادت نبی کے ہاتھ پر ظاہر ہو اس کو معجزہ کہتے ہیں مثلاً ایک آدمی کا کھانا ایک آدمی کو سیر کر دے تو یہ معجزہ نہیں کیونکہ عادت کے مطابق ہے البتہ اگر ایک آدمی کا کھانا صدہا آدمیوں کو سیر کر دے اور ایک گلاس پانی سے صدہا آدمی سیراب ہو جائیں تو یہ معجزہ ہے یا مثلاً ایک مشت خاک صدہا آدمیوں کو اندھا اور خیرہ بنا دے تو یہ معجزہ کہلائے گا۔ کیونکہ یہ خارق عادت بلا سبب عادی کے ظہور میں آیا ہے اور جو شئے اسباب اور آلات کے ذریعہ سے ظاہر ہو وہ خارق عادت نہیں کہلائے گی جیسے دوا سے بیمار کا تندرست ہو جانا اور سحر اور طلسم کے ذریعہ عجیب وغریب کرشموں کا ظاہر ہونا خارق عادت نہیں کہلائے گا اس لئے کہ یہ تمام چیزیں اسباب پر مبنی ہیں جو سیکھنے اور سکھانے سے معلوم ہو سکتی ہیں۔

پس جو خارق عادت بلا اسباب عادیہ کے نبی کے ہاتھ پر ظاہر ہو تو وہ معجزہ کہلاتا ہے اور اگر کسی ولی اور صالح کے ہاتھ پر ظاہر ہو تو اس کو کرامت کہتے ہیں اور اگر کسی عامی مسلمان کے ہاتھ پر ظاہر ہو تو اس کو معونت کہتے ہیں۔ معجزہ کا مفہوم خود اس پر دلالت کرتا ہے کہ معجزہ کوئی محال شئے نہیں بلکہ ممکن ہے۔ البتہ عالم اسباب کی عادت

[۱] عارف رومی قدس سرہ السامی

جاریہ اور سنت مستمرہ کے خلاف ہے فقط منکرین کے عاجز کرنے کے لئے ظاہر کیا گیا ہے۔

لیکن بعض قاصرین فہم وفراست خوارق کو محال سمجھتے ہیں اور دلیل یہ پیش کرتے ہیں کہ مسببات کا اپنے اسباب اور علل سے منفک ہونا محال ہے اہل حق کے نزدیک تمام حقائق امکانیہ خواہ وہ جواہر واعراض ہوں اور خواہ اجسام اور عقول ہوں اور خواہ نفوس اور افلاک اور عناصر اور ان کے خواص و آثار ہوں سب کے سب اسی علیم و قدیر کی قدرت وحکمت کی تجلیات اور تخلیق وتکوین کی مظاہر اور شؤون ہیں اسی نے اپنی قدرت کاملہ اور حکمت بالغہ سے ان تمام کائنات کو کتم عدم سے نکال کر وجود کا خلعت عطا فرمایا ہے کسی حقیقت کا وجود بھی ذاتی نہیں۔ محض موہبہ ربانی اور عطیہ الٰہی ہے ۔

نیا ور دم از خانہ چیزے نخست
تو دادی ہمہ چیز و من چیز تست

یہ تمام عالم اسی کی صفات ازلیہ کا مرآت اور مظہر ہے اس آئینہ عدم میں اس کے وجود ازلی کے انعکاس سے وجود حادث آیا۔ اور اس مرآت جہالت و عجز میں قدرت ازلیہ اور علم ازلی کی تجلی سے ایک معمولی سی ناقص اور حادث قدرت اور علم نمودار ہونے لگا۔ اسی طرح حقائق امکانیہ کی تمام صفات اور تمام خواص و آثار کو سمجھئے کہ عکس اور ظل سے زائد حقیقت نہیں رکھتے ۔

کل ما فی الکون وہم او خیال
او عکوس فی المرایا او ظلال

رباعی

در عرصۂ کائنات بادقت فہم
بسیار گزشتم بسرعت چوں بہم

گشتیم همہ چشم ندیدیم درو
جز ظل صفات آمدہ ثابت در وہم

الحاصل یہ تمام عالم اسی کے دست قدرت کا ایک نقش ونگار ہے جس طرح یہ عالم اپنے وجود میں اس علیم وقدیر کا محتاج اور دست نگر ہے اسی طرح اپنے بقاء یعنی اپنے وجود کے استمرار وامتداد میں بھی اسی کا محتاج اور دست نگر ہے۔ تمام اعیان واعراض، خواص اور آثار کا خالق اور اصل فاعل وہی ہے اور اس علیم وحکیم نے ان اسباب و وسائط کو اپنی تخلیق وتکوین اور اپنے افعال کا روپوش بنایا ہے ؎

توز طفلی چوں سببہا دیدۂ
در سبب از جہل بر چفیدۂ
با سببہا از مسبب غافلی
سوئے ایں روپوشہا زاں مائلی
چوں سببہا رفت بر سر میزنی
ربنا فاغفر لنا ہا میکنی [1]

اسباب وعلل اور وسائط کو اس لئے نہیں پیدا فرمایا کہ ناظرین ان کو فاعل مستقل اور موثر خیال کریں۔ بلکہ اس لئے پیدا فرمایا کہ اصحاب فہم وفراست ان تمام اسباب و وسائل کو اس کی قدرت کاملہ کے دلائل سمجھیں۔

اصحاب فہم وفراست کہ جن کی بصیرت متابعت انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام کے سرمہ سے سرگیں ہے۔ وہ خود جانتے ہیں کہ یہ اسباب و وسائل اپنے وجود اور اپنے بقاء میں تعالیٰ شانہ کے محتاج ہیں اور فی الحقیقت جماد محض ہیں وہ دوسرے میں کس طرح تاثیر کر سکتے ہیں۔ تاثیر اور احداث، ایجاد اور اختراع جماد کا کام نہیں۔ یہ کام تو صرف علیم وقدیر اور فعال لمایرید کا ہے۔

---

[1] ازلب لباب مثنوی: صفحہ ۳۰۴

عقل مند جب جماد سے ظاہراً کوئی فعل صادر ہوتا ہوا دیکھتا ہے تو اس کو فاعل حقیقی کا روپوش خیال کرتا ہے اور یہ یقین کرتا ہے کہ یہ جماد فاعل اور موثر نہیں۔ بلکہ کوئی اور دست قدرت ہے جو من وراء الحجاب کارفرما ہے کسی خوشنما مصحف کو دیکھ کر اس کے زریں نقوش کو بجائے کاتب کے اور صاحب قلم کے، قلم کی طرف منسوب کرنا اور صرف قلم ہی کو ان نقوش کے لئے مؤثر قرار دینا غایت بلادت ہے ؎

نقش باشد پیش نقاش و قلم
عاجز و بستہ چو کودک در شکم
پیش قدرت خلق جملہ بارگاہ
عاجزاں چوں پیش سوزن کارگاہ

اور علی ہذا ضرب اور قتل میں بجائے ضارب و قاتل کے صرف تیر اور تلوار کو موثر حقیقی خیال کرنا کمال غباوت (حماقت) ہے۔ ٹھیک اسی طرح ان اسباب و وسائط کو کہ جو افعال الٰہیہ کے لئے محض روپوش ہیں موثر اور اصل فاعل سمجھ لینا کمال ابلہی ہے کہ صرف واسطہ اور حجاب پر اپنی نظر کو مقصور کر کے صاحب قدرت اور مالک اسباب و وسائط کا انکار کر دیا۔

﴿يُضِلُّ بِهٖ كَثِيْرًا وَّيَهْدِىْ بِهٖ كَثِيْرًا﴾[1]

ترجمہ: ”گمراہ کرتا ہے خدائے تعالیٰ اس مثال سے بہتیروں کو اور ہدایت کرتا ہے اُس سے بہتیروں کو۔“

جس چیز پر بھی نظر ڈالئے قدرت کا عجیب تماشہ نظر آتا ہے عالم کواکب اور نجوم کی طرف ایک نظر اٹھا کر دیکھئے کیا کیا عجائب قدرت نظر آتے ہیں۔ فضائی اور جوی حوادث آندھی اور کڑک اور بجلی اور بادل اور بارش کو دیکھئے۔ کوہ و بیاباں، دریا اور سمندر شجر اور حجر، نباتات اور معدنیات کو ذرا دیکھئے اور ذرا اپنے پر بھی نظر کیجئے کہ اصل میں

---

[1] القرآن ۲/۲۶

کیا تھے اور اب کیا ہو گئے عجائب قدرت کا ایک دریائے ناپید نظر آئے گا اور سمجھ جائیں گے کہ اس کی قدرت کی کوئی حد اور نہایت نہیں۔ اس کی قدرت کے لئے کوئی قید اور شرط نہیں وہ قادر مطلق اور قادر بالذات ہے کوئی شئے تمہاری ناقص قدرت کے لحاظ سے کتنی ہی عجیب کیوں نہ ہو مگر اس کی قدرت قدیمہ کے لحاظ سے کوئی عجیب نہیں۔ وہ قادر مطلق کسی واسطہ اور سبب کا محتاج نہیں۔ لیکن اس قدیر وحکیم نے اس عالم کو عالم اسباب بنایا ہے اور اس کے لئے اسباب وقوانین مقرر کئے ہیں اور مسببات کو اسباب کے ساتھ مربوط کیا ہے اور اس کی یہ عادت ہے کہ اس عالم میں جو کچھ ظاہر ہوتا ہے وہ اسباب ووسائط کے توسط سے ظاہر ہوتا ہے مثلاً انسان کی پیدائش کے لئے یہ قانون مقرر کیا کہ اول نطفہ ہو پھر مضغہ ہو الی آخرہ۔ نباتات کے لئے یہ قاعدہ مقرر کیا کہ اول زمین میں تخم ڈالا جائے اور پھر اس کی آبیاری کی جاوے الی آخرہ۔ وہ چاہتا تو سب کچھ ایک ہی آن میں بلا ان اسباب ووسائط کے پیدا ہو جاتا مگر اس کی حکمت اسی کو مقتضی ہوئی کہ اسی طریق سے پیدا کیا جائے یہ اس کی سنت ہے باقی ان اسباب و وسائط اور اس مدت معینہ کو تکوین اور حدوث اشیاء میں کوئی دخل نہیں اور نہ کوئی بڑے سے بڑا عاقل ان اسباب ووسائط اور وقت معین کا حدوث اشیاء میں دخیل اور موثر ہونا عقلاً ثابت کر سکتا ہے۔ موثر حقیقی اس کی قدرت اور ارادہ ہے۔ بہر حال عالم اسباب میں اس کی سنت یہ ہے کہ اشیاء کا ظہور اسباب کے توسط سے ہوتا ہے لیکن کبھی کبھی اپنے خاص خاص بندوں کے اعزاز اور اکرام، تائید اور تصدیق کے لئے اپنی عادت اور سنت کے خلاف ایسے خوارق اور عجیب وغریب امور ظاہر کرتا ہے کہ وہ خوارق ایک طرف تو اس کی قدرت قدیمہ کی دلیل بنیں اور دوسری طرف اس کے انبیاء ومرسلین کی نبوت ورسالت کی برہان مبین بنیں۔ اور چونکہ یہ اسباب وعلل اسی کے پیدا کئے ہوئے ہیں اس لئے ان کا رفع بھی بالکل مناسب نہیں اس لئے کہ رفع اسباب وعلل سے ان کے اسرار وحکم کے ارتفاع کا ایہام ہوتا ہے کہ جو قدرت ازلیہ نے ان اسباب

وعلل میں ودیعت رکھے ہیں۔ کما قال تعالٰی شانہ: "رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا" اور اسی وجہ سے انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام نے ظاہراً اسباب و وسائط کو ملحوظ ومرعی رکھا ہے۔ لیکن معنیٰ تسلیم وتفویض سے سرمو نہیں ہٹے چنانچہ یعقوب علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ظاہراً اسباب کی مراعاۃ سے یہ ارشاد فرمایا:

﴿يٰبَنِيَّ لَا تَدْخُلُوْا مِنْۢ بَابٍ وَّاحِدٍ وَّادْخُلُوْا مِنْ اَبْوَابٍ مُّتَفَرِّقَةٍ﴾ [1]

ترجمہ: "اے بیٹو! (مصر میں) ایک دروازہ سے نہ داخل ہونا۔ بلکہ جدا جدا دروازوں سے داخل ہونا۔"

اور معنیٰ تفویض وتسلیم کو ملحوظ رکھ کر یہ ارشاد فرمایا۔

﴿وَمَآ اُغْنِيْ عَنْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ مِنْ شَيْءٍ ۭ اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ ۭ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ ۚ وَعَلَيْهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُتَوَكِّلُوْنَ﴾ [2]

ترجمہ: "میں تم کو اللہ کی کسی چیز سے بچا نہیں سکتا سوائے اللہ کے کسی کا حکم نہیں اسی پر مجھ کو بھروسہ ہے اور بھروسہ کرنے والوں کو اسی پر بھروسہ چاہیے۔"

اور حضرت یعقوب علیہ السلام کی اسی ظاہری ومعنوی رعایت کی حق تعالیٰ شانہ نے اپنے اس ارشاد سے تحسین فرمائی۔

﴿وَاِنَّهٗ لَذُوْ عِلْمٍ لِّمَا عَلَّمْنٰهُ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ﴾ [3]

ترجمہ: "اور بے شک وہ صاحب علم تھے اس لئے کہ ہم نے ان کو تعلیم دی تھی لیکن اکثر لوگ اس علم سے واقف نہیں۔"

اور اسی ظاہری ومعنوی رعایت کو علم اور تعلیم الٰہی سے تعبیر فرمایا۔ قرآن کریم نے

---

[1] القرآن: ۱۲/۶۷ [2] القرآن: ۱۲/۶۷ [3] القرآن: ۱۲/۶۸

اور بھی متعدد مواقع میں توسط اسباب کی طرف اشارہ کیا ہے۔
کما قال تعالیٰ:
﴿یَاۤاَیُّهَا النَّبِیُّ حَسْبُكَ اللّٰهُ وَمَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ﴾[1]
ترجمہ: ”اے نبی کافی ہے آپ کو اللہ اور آپ کی پیروی کرنے والے مؤمنین۔“

تاثیر اسباب وعلل کی حقیقت

جس طرح کہ اسباب وعلل کا وجود موہبہ ربانی ہے اسی طرح اسباب وعلل کی تاثیر بھی اسی علیم وقدیر کا عطیہ ہے۔ اور بے چون وچگون دست قدرت کا ایک نقش ہے جس طرح اسباب وعلل کا وجود اس کی مشیت اور حکم کے تابع ہے۔ اسی طرح اسباب وعلل کی تاثیر بھی اس کی مشیت اور ارادہ کے تابع ہے۔ فعال لما یرید جب چاہتا ہے اس وقت اسباب وعلل اثر کرتے ہیں۔ ورنہ نہیں۔

﴿مَا شَآءَ اللّٰهُ كَانَ وَمَا لَمْ یَشَأْ لَمْ یَكُنْ ۝ اَعْلَمُ اَنَّ اللّٰهَ عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ﴾

جس طرح وہ علیم وقدیر جب چاہے اسباب وعلل کے وجود کو سلب کر سکتا ہے اسی طرح اسباب وعلل کی صفت تاثیر کو بھی جب چاہے سلب کر سکتا ہے۔ اور اگر بالفرض والتقدیر اسباب وعلل کی تاثیر خدا تعالیٰ کی مشیت اور ارادہ پر موقوف نہ ہو بلکہ اسباب وعلل اپنی تاثیر میں مستقل ہوں تو خدا سے استغناء اور بے نیازی بلکہ خود اسباب وعلل کا خالق ہونا لازم آتا ہے کیونکہ جو شئے مستقل بالتاثیر ہو وہی خالق ہے نیز اسباب وعلل کو مستقل بالتاثیر ماننے کے بعد خدا تعالیٰ کو مستقل بالتاثیر اور

[1] القرآن: ۸/۶۴

متفرد بالایجاد ماننا ناممکن ہے۔

خلاصہ یہ کہ اسباب وعلل تمام ترمحض عادی ہیں حق تعالیٰ شانہ کی سنت اور عادت اسی طرح جاری ہے کہ ان اسباب وعلل کی مباشرت کے بعد اپنی قدرت ومشیت سے مسبب کو پیدا فرما دیتے ہیں لیکن کبھی کبھی باوجود تمام اسباب وعلل کے جمع ہو جانے کے مسبب کونہیں بھی پیدا فرماتے تاکہ اہل غفلت ہوش میں آئیں اور ان ظاہری اسباب وآلات سے اپنی نظروں کو ہٹا کر اس علیم وقدیر کی طرف متوجہ ہوں اور سمجھیں کہ اصل مؤثر اور حقیقی فاعل وہی مالک الملک ہے اور جن اسباب و وسائط کو ہم نے مؤثر سمجھ کر رکھا تھا وہ سراپا غلط تھا ؏

خود غلط بود آنچہ ما پنداشتیم

چنانچہ بعض ارباب تحقیق کا ارشاد ہے:

"سبحان من ربط الاسباب بمسبباتها ليهتدى العاملون وخرق العوائد ليتفطن العارفون فيعلمون انه فاعل مختار وان الحوادث لا تحدث بالطبع ولا الاضطرار"

تَرجَمَۃ: "پاک ہے وہ ذات جس نے اسباب کو مسببات کے ساتھ مربوط فرمایا تاکہ کام کرنے والوں کو راستہ معلوم ہو اور کبھی کبھی معتاد طریقوں کو توڑا تاکہ اہل معرفت اور ارباب بصیرت سمجھیں کہ وہی حق جل وعلا فاعل مختار ہے اور کوئی شئے مادہ اور طبیعت کے اقتضاء سے پیدا نہیں ہوتی بلکہ اسی کی قدرت واختیار سے پیدا ہوتی ہے۔"

جدید تعلیم یافتہ لوگوں کے سامنے جب کسی معجزہ کا ذکر کیا جاتا ہے تو فوراً یہ کہہ کر کہ قانون قدرت کے خلاف ہے۔ اس معجزہ کا صاف انکار کر دیتے ہیں۔

معلوم نہیں کہ قدرت خداوندی کا کونسا مرتب اور مکمل قانون ان لوگوں کے پاس ہے کہ جس کی بناء پر یہ حکم لگا دیتے ہیں کہ یہ امر قانون قدرت کے خلاف ہے۔

ظاہر ہے کہ نہ تو آسمان سے کوئی ایسی کتاب اتری ہے کہ جس میں قدرت خداوندی کے قوانین اور اصول بالتفصیل بیان کیے گئے ہوں اور نہ دنیا میں آج تک کوئی کتاب اس موضوع پر لکھی گئی اور خداوند ذوالجلال کی غیر محدود قدرت کے قوانین لکھ کون سکتا ہے۔ جو کچھ بھی لکھے گا وہ فقط متناہی اور محدود ہی نہ ہوگا بلکہ اس کو قدرت خداوندی کے ساتھ وہ نسبت بھی نہ ہوگی جو قطرہ کو دریا کے ساتھ ہوتی ہے بھلا کوئی عاقل اس کو باور کر سکتا ہے کہ ایک انسان سراپا سہو و نسیان کا تنگ دماغ خداوند ذوالجلال کے غیر متناہی قدرت کو کسی قانون اور ضابطہ میں منحصر کر دے۔ انسان اپنے مشاہدہ اور تجربہ کی بناء پر جو قانون بناتا ہے وہ اکثری ہوتا ہے نہ کہ کلی اور دائمی ہے۔

نیز خوارق عادات اگر محال ہیں تو عام لوگوں کی قوت جسمانی کے لحاظ سے محال ہو سکتے ہیں لیکن روحانی قوت کے لحاظ سے ان کو محال کہنا نادانی ہے۔

انسان بیک وقت دس من وزن بھی نہیں اٹھا سکتا لیکن ریل کا انجن ہزار ہاٹن وزن گھنٹوں میں صدہا میل گھسیٹ کر لے جاتا ہے۔

معلوم ہوا کہ فاعل جس درجہ قوی ہوگا اس کا فعل اور اس کی تاثیر بھی اسی درجہ قوی ہوگی۔ قوت برقیہ کو دیکھ لیجئے کہ اس کی ادنی حرکت سے وہ کام بسہولت انجام پا جاتے ہیں کہ جو لاکھوں انسانوں سے بھی نہ ہو سکیں۔ یہ حال تو عنصری اور جسمانی قوتوں کا ہے اس سے اندازہ کر لو کہ روحانی قوتوں کا کیا حال ہوگا اس لئے کہ روح کی قوت جسم کی قوت سے کہیں زیادہ ہے۔

جن حضرات کو حق تعالیٰ نے روحانی قوت عطا فرمائی ان کے ہاتھوں ان خوارق کا ظہور کچھ عجیب نہ سمجھو۔ حضرات انبیاء علیہم السلام سے معجزات کا ظاہر ہونا یہود اور نصاریٰ سب کے نزدیک مسلم ہے۔ اسی طرح ہنود بھی اپنے بزرگوں اور رشیوں کے خوارق عادات بیان کرتے ہیں اور فلاسفہ اور حکماء بھی ان چیزوں کے قائل ہیں۔ البتہ وہ لاابالی نوجوان جنہوں نے کسی کالج میں علم طبعیات اور علم العناصر کی ایک دو کتاب

کچھ پڑھ لی ہیں وہ ان چیزوں کو محال سمجھتے ہیں۔ مولانا رومی رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں

سنگ بر آہن زنی آتش جہد
ہم بامر حق قدم بیرں نہد

ترجمہ: ''پتھر کو لوہے پر مارنے سے جو آگ نکلتی ہے وہ اللہ ہی کے حکم سے نکلتی ہے۔''

سنگ و آہن خود سبب آمد ولیک
تو ببالا تر نگر اے مرد نیک

ترجمہ: ''سنگ و آہن بے شک آگ نکلنے کا سبب ہیں۔ مگر اے نیک مرد تو اوپر نظر کر یعنی اس علیم و قدیر اور کبیر متعال کی قدرت و ارادہ کی طرف نظر کر۔''

کایں سبب را آں سبب آورد پیش
بے سبب کے شد سبب ہرگز زخویش

ترجمہ: ''اس سبب ظاہری کو وہ سبب حقیقی یعنی امر کن ہی وجود میں لایا ہے کیا یہ ظاہری سبب بغیر سبب حقیقی یعنی مشیت الٰہیہ کے خود بخود سبب بن گیا ہے۔''

ایں سبب را آں سبب عامل کند
باز گاہے بے پرو عاطل کند

ترجمہ: ''اس ظاہری سبب کو وہی اصلی اور حقیقی سبب یعنی قدرت ازلیہ ہی با اثر بناتی ہے۔ اور کبھی اس کو بالکل معطل اور بے کار محض بنا دیتی ہے۔''

باد آتش می شود از امر حق
ہردو سرمست آمدند از خمر حق

ترجمہ: ''حکم الٰہی سے ہوا آگ بن جاتی ہے اس لئے کہ دونوں یعنی باد و آتش خمر حق سے مخمور ہیں۔''

گر نبودے واقف از حق جان باد
فرق کے کردے میان قوم عاد

ترجمہ: ''اگر جان باد (ہوا) امر الٰہی سے واقف اور باخبر نہ تھی تو قوم عاد میں فرق کیسے کرتی تھی کہ مؤمنوں کو چھوڑ کر صرف کافروں ہی کو ہلاک کرتی تھی۔''

ہود گرد مؤمناں خطے کشید
نرم شد باد کانجامی رسید

ترجمہ: ''ہود علیہ السلام نے نزول عذاب کے وقت مؤمنین کے گرد ایک خط کھینچ دیا تھا جب ہوا وہاں پہنچتی تو نرم ہو جاتی۔''

ہر کہ بیروں بود زاں خط جملہ را
پارہ پارہ می شکست اندر ہوا

ترجمہ: ''اور جو کافر اس خط سے باہر تھے ان کو پارہ پارہ اور ریزہ ریزہ کر ڈالتی تھی۔''

موج دریا چوں بامر حق بتاخت
اہل موسیٰ را ز قبطی واشناخت

ترجمہ: ''دریا کی موج چونکہ اللہ کے حکم سے دوڑی اس لئے اس نے اہل موسیٰ اور اہل فرعون کو الگ الگ پہچانا اور اہل موسیٰ کو بچایا اور اہل فرعون کو غرق کیا۔''

خاک قاروں راچوں فرماں در رسید
بازرد تختش بقعر خود کشید

ترجمہ: ”خاک قارون کو جب فرمان الٰہی پہنچا تو قارون کو مع تخت و زر کے اپنے اندر کھینچ لیا۔“ [1]

پرورد در آتش ابراہیم را
ایمنی روح سازد بیم را

ترجمہ: ”وہ قادر مطلق آگ میں ابراہیم کی تربیت کرتا ہے اور خوف کو امن و اطمینان بنا دیتا ہے۔“

از سبب سوزیش من سودائیم
وز سبب سازش سوفسطائیم

ترجمہ: ”اس کی سبب سوزی سے میں سودائی یعنی حیران بنا ہوا ہوں۔ سبب سوزی سے یہ مراد ہے کہ اسباب سب موجود ہیں مگر قدرت الٰہیہ نے ان کی تاثیر کو سلب کر لیا اس لئے مسبب مرتب نہیں ہوتا۔ اور اسی سبب سازی سے مثل سوفسطائی کے بنا ہوا ہوں۔“

در سبب سازیش سر گرداں شدیم
وز سبب سوزیش ہم حیراں شدیم

ترجمہ: ”اس کی سبب سازی سے سرگرداں اور اس کی سبب سوزی سے حیران ہیں۔“ [2]

انبیاء در قطع اسباب آمدند
معجزات خویش بر کیواں زدند
بے سبب مر بحر را بشگافتند
بے زراعت چاش گندم یافتند

---

[1] مثنوی دفتر اول صفحہ ۱۷

[2] مثنوی دفتر اول: صفحہ ۱۸

دیگہا ہم آرد شد از سعی شاں
پشم بزا بریشم آمد کشکشاں
جملہ قرآں ہست در قطع سبب
عز درویش و ہلاک بولہب
مرغ بابیلے دوسہ سنگ افگند
لشکر رفت حبش رابشکند
پیل را سوراخ سوراخ افگند
سنگ مرغے کو بیالا پر زند
دمّ گاو کشتہ بر مقتول زن
تاشود زندہ ہماں دم در کفن
حلق ببریدہ جہد از جائے خویش
خون خود جوید زخوں پالائے خویش
ہمچنیں ز آغاز قرآں تا تمام
قطع اسباب است وعلت والسلام[1]

ان بے وجہ شیفتگانِ اسباب وعلل اور فریفتگانِ وسائط و وسائل کا عجب حال ہے کہ جب کسی نادر الوقوع اور خارق عادت امر کو سنتے ہیں محض ظاہری استبعاد اور اس کے غیر معتاد ہونے کی وجہ سے اس کے انکار پر آمادہ ہو جاتے ہیں۔ حالانکہ اس سے بڑھ کر عجائب قدرت اور بدائع صنعت ان کی نظروں کے سامنے ہوتے ہیں۔

تراب کا نبات ہو جانا اور پھر اس کا غذا بننا اور غذا سے دم اور دم سے نطفہ اور پھر اس کا علقہ اور پھر مضغہ ہو جانا اور پھر اس سے ایک حیوان سمیع وبصیر کا ظاہر ہونا کہ جس میں قوت ذائقہ اور شامہ اور لامسہ بھی ہوں اور پھر رفتہ رفتہ اس کا ضعف سے قوت کی

---

[1] مثنوی دفتر سوم: صفحہ ۲۲۵

جانب اور جہل سے علم کی طرف منتقل ہونا سب کو معلوم ہے۔

ان عجیب وغریب اطوار وادوار سے اور ان بدائع وصنائع سے تعجب نہیں کرتے لیکن جب یہ کہا جاتا ہے کہ فلاں مرد صالح کے ہاتھ پھیر دینے سے حق تعالیٰ شانہ نے فلاں مردہ کو زندہ اور فلاں مریض کو شفایاب فرمادیا تو آمادہ انکار اور تعجب ہو جاتے ہیں حالانکہ یہ اس درجہ عجیب نہیں جتنا کہ ماء مہین سے ایک سمیع وبصیر انسان کی تکوین اعجب ہے۔ ہاں اگر یہ کہا جاتا ہے کہ فلاں مرد صالح نے اپنی قدرت اور اختیار سے اس کو اچھا کر دیا تو البتہ انکار کی ایک معقول وجہ ہو سکتی تھی کہ ممکن میں یہ قدرت کہاں سے آئی۔ لیکن جب یہ کہا جائے کہ اللہ تعالیٰ نے فلاں مرد صالح کے دعا مانگنے پر اپنی قدرت کاملہ سے اس کو اچھا کر دیا تو کیا استبعاد ہے۔

اور علی ہذا ایک عصا کا ثعبان مبین ہو جانا اتنا نادر نہیں جتنا کہ ایک اشرف المخلوقات کا سلالۃ من طین سے پیدا ہونا نادر اور غریب ہے۔ اور علی ہذا ایک پتھر سے ناقہ صالح علیہ الصلوٰۃ والسلام کا خروج بھی مستبعد نہیں۔

انسان اور ناقہ دونوں حیوانیت میں شریک ہیں۔ پس جس طرح انسان ایک جماد یعنی سلالۃ من طین سے پیدا ہو سکتا ہے اسی طرح ناقہ صالح علیہ الصلوٰۃ والسلام کا بھی ایک جماد یعنی صخرہ سے خروج ممکن ہے۔

اور موسم برسات میں دفعۃً زمین سے حیوانات کا خروج وظہور سب کو معلوم ہے۔ رہا صغر وکبر کا فرق تو وہ قابل التفات نہیں۔ جسم پر سواد وبیاض کا توارد اس امر کی بین دلیل ہے کہ جسم کی نفس ماہیت عقلاً نہ سواد کو مقتضی ہے اور نہ بیاض کو، اسی طرح جسم پر اتصال وانفصال کا تناوب اور تعاقب بھی اس کی واضح دلیل ہے کہ جسم کی نفس حقیقت عقلاً نہ اتصال کو مقتضی ہے اور نہ انفصال کو۔

جسم کی نفس ماہیت کو اتصال وانفصال دونوں سے یکساں علاقہ ہے نہ اتصال کا طاری ہونا اس کی حقیقت کے منافی ہے اور نہ انفصال کا طاری ہونا اس کی ماہیت کے

مبائن ہے تو پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے انشقاق قمر اور موسیٰ علیہ السلام کے لئے انفلاق بحر اور قیامت کے قریب انفطار سموات اور انتشار کواکب کو کیوں محال سمجھتے ہو۔

نفس ماہیت کے لحاظ سے تمام اجسام ارضیہ اور اجرام فلکیہ متساویۃ الاقدام ہیں۔ اتصال وانفصال کا محل نفس جسم من حیث جسم ہے اتصال وانفصال اپنے ورود اور طریان کے لئے فقط حقیقت جسمیہ کو مقتضی ہیں۔ طریان اتصال وانفصال میں بلندی اور پستی، رقت اور سیلان کو اصلاً دخل نہیں۔

اور علیٰ ہذا جسم کی نفس حقیقت استقرار فی المکان کو مقتضی نہیں ورنہ کسی جسم کا خواہ صغیر ہو اور خواہ کبیر اس کی جگہ سے منتقل کرنا ممکن نہ ہوتا۔ جسم خفیف کو ہر شخص اپنی جگہ سے اٹھا سکتا ہے۔ جسم اگر ثقیل ہو تو اس کو جر ثقیل کے ذریعہ سے اٹھایا جا سکتا ہے۔

بہر حال اتنا ضرور معلوم ہو گیا کہ جسم خواہ خفیف ہو اور خواہ ثقیل اس کا اپنی جگہ سے منتقل اور مرتفع ہو جانا ناممکن اور محال نہیں تو پھر ﴿وَرَفَعْنَا فَوْقَكُمُ الطُّوْرَ﴾[1] تَرجَمہ: ''اور بلند کیا تمہارے اُوپر کوہِ طور کو'' کا کیوں انکار ہے۔ لسان و شفتین کی حرکت اور ظہور اصوات والفاظ میں کسی قسم کا عقلی التزام سمجھ میں نہیں آتا کیا یہ لسان و شفتین گونگے میں نہیں پھر بتلایئے کہ گونگے سے نطق و گویائی کو کس نے سلب کر لیا۔ لسان اور شفتین کی حرکت سے کلام کا ظاہر ہونا نہ نفس انسانیت کی وجہ ہیں ورنہ انسانیت تو گونگے اور شیر خوار بچہ میں بھی موجود ہے۔

اور نہ حیوانیت کی وجہ سے ہے اس لئے کہ حیوانیت تو بہائم اور طیور میں بھی ہے اور نہ نفس جسمیت کی وجہ سے ہے اس لئے کہ جسمیت تو اشجار و احجار میں بھی ہے اور نہ دھن کی صورت مخصوصہ کی وجہ سے ہے کیونکہ انسان اور بندر کی صورت میں بہت کچھ تشابہ اور تماثل موجود ہے مگر با ایں ہمہ بندر کلام نہیں کرتا۔ طوطا اور مینا جن کی صورت،

---

[1] القرآن ۲/۶۳

صورت انسانی سے بہت بعید ہے چند روز کی تعلیم سے بولنے لگتے ہیں۔

الحاصل: صفت کلام کی علت نہ طبیعت انسانیہ اور حیوانیہ ہے اور نہ ماہیت جسمانیہ اور دہن کی ہیئت مخصوصہ بلکہ اس قدیر و علیم اور عزیز و حکیم کی قدرت اور مشیت ہے محض اپنی قدرت اور مشیت سے انسان کے چند مضغہائے لحم یعنی لسان اور شفتین اور چند جمادات یعنی اسنان و دندان کی حرکت کے بعد گویائی پیدا فرما دیتا ہے۔

پس اگر وہ قادر مطلق کسی شیر خوار بچہ یا کسی جانور یا کسی شجر و حجر میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت و رسالت کی تصدیق و شہادت کے لئے نطق اور گویائی پیدا فرمادے تو کیا استبعاد ہے۔

اور علی ہذا کسی جانور کا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر اپنے آقا کی شکایت کرنا یا آپ کے دست مبارک پر کسی سنگریزے کا تسبیح پڑھنا اور کسی درخت اور پتھر کا آپ کو سلام کرنا یا قیامت کے دن اعضاء اور جوارح کا بندے کے اعمال کی شہادت دینا اور زمین کا اس اطاعت اور معصیت کو بیان کرنا جو اس پر کی گئی کیوں محال سمجھتے ہو۔ محال ہونے کی کوئی دلیل تو بتلایئے۔

ظہور خوارق کی حکمت

نبوت اور رسالت ایک قسم کی سفارت ہے اللہ اور بندوں کے درمیان میں اور ظاہر ہے کہ سفارت کے لئے شان امتیازی کا ہونا ضروری ہے جس سے اس کا سفیر ہونا معلوم ہو۔

اسی طرح اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبروں کے ہاتھ پر اپنی قدرت کے کرشمے اور نشانات ظاہر فرمائے ہیں۔ جس سے دیکھنے والوں کو یہ معلوم ہو جائے کہ یہ اللہ تعالیٰ کے فرستادہ ہیں۔ کیونکہ یہ امور قدرت بشریہ سے بالا اور برتر ہیں بغیر تائید خداوندی کے ان کا ظاہر ہونا محال ہے۔ اور نیز ان حضرات کو مستحق اطاعت جانیں اور ان کی

اطاعت کو اللہ تعالیٰ کی اطاعت سمجھیں۔

حافظ تورپشتی رحمہ اللہ تعالیٰ المعتمد فی المعتقد میں فرماتے ہیں کہ حق تعالیٰ شانہ کی طرف سے حضرات انبیاء کو دو چیزیں عطا ہوتی ہیں۔ ایک تعلیم اور دوسری تائید۔ تعلیم کا معنی یہ ہے کہ بذریعہ وحی یا الہام کے اپنے احکام سے مطلع کرنا، تائید کے معنی دلائل اور براہین ہیں ان کو قوت پہنچانا، اصل نبوت تعلیم ہے اور تائید نبوت کی دلیل ہے۔ ان حضرات کا سراپا پیکر عصمت ہونا۔ (جو بھی ان کو دیکھے معصومیت کی تصویر سمجھے) فہم و فراست، عقل و فطانت، قوت حافظہ اور قوت ادراک و احساس، حسن صورت اور حسن سیرت میں سارے عالم سے فائق اور ممتاز ہونا ان کا مستجاب الدعوات ہونا، قسم قسم کی برکات اور معجزات اور کرامات کا ان کے ہاتھوں پر ظاہر ہونا۔ یہ سب چیزیں باب تائید سے ہیں۔ یہ تمام امور ان کی نبوت کے براہین اور دلائل ہوتے ہیں۔ انتہی کلامہ ملخصًا۔

تمام صفات میں دو صفتیں شان امتیازی رکھتی ہیں۔ ایک صفت علم اور دوسری صفت قدرت۔ پس جس طرح اللہ تعالیٰ حضرات انبیاء کو وہ علم عطا فرماتا ہے کہ جہاں تک کسی کے فہم کی رسائی نہ ہو سکے۔ اسی طرح ان حضرات کو ایسے خوارق اور معجزات عطا کرتا ہے کہ جو تمام عالم کی قوت اور قدرت سے بالا اور برتر ہوتے ہیں تاکہ عالم پر ان حضرات کی صفت علم اور صفت قدرت کا کمال اور تفوق ظاہر ہو جائے اور یہی معجزات ان حضرات کے غلبہ کا اور ان کے دشمنوں کی مغلوبی اور عاجزی کا سبب بنتے ہیں۔

کما قال تعالیٰ: ﴿فَلَا يَصِلُوْنَ اِلَيْكُمَا ۚ بِاٰيٰتِنَآ ۚ اَنْتُمَا وَمَنِ اتَّبَعَكُمَا الْغٰلِبُوْنَ ۝﴾ [1]

تَرجَمَہ: ”پھر وہ نہ پہنچ سکیں گے تم تک ہماری نشانیوں سے تم اور جو

[1] القرآن: ۲۸/۳۵

تمہارے ساتھ ہو غالب رہو گے۔“

اظہار خوارق سے کبھی مخالفین کو عاجز کرنا مقصود ہوتا ہے کبھی محض نبی کی تشریف وتکریم مقصود ہوتی ہے کہ نبی کی شان اور بلند ہو۔ کبھی اہل ایمان کو بشارت دینا اوران کے قلوب کو مطمئن کرنا مقصود ہوتا ہے۔

کما قال تعالیٰ: ﴿وَمَا جَعَلَهُ اللّٰهُ اِلَّا بُشْرٰى وَلِتَطْمَئِنَّ بِهٖ قُلُوْبُكُمْ ۚ﴾ [1]

ترجمہ: ”اور یہ تو دی اللہ نے فقط خوشخبری اور تاکہ مطمئن ہو جائیں اس سے تمہارے دل۔“

کبھی یہ مقصد ہوتا ہے کہ جو لوگ خواب غفلت میں پڑے سو رہے ہیں وہ جاگیں اور آنکھیں کھول کر حضرات انبیاء اوران کی تعلیم کی طرف دیکھیں۔

کما قال تعالیٰ: ﴿لَقَدْ عَلِمْتَ مَآ اَنْزَلَ هٰٓؤُلَاۗءِ اِلَّا رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ بَصَاۗىِٕرَ ۚ﴾ [2]

ترجمہ: ”تو جان چکا ہے کہ یہ چیزیں کسی نے اتاریں۔ مگر آسمان اور زمین کے مالک نے سمجھانے کے واسطے۔“

کبھی یہ مقصد ہوتا ہے کہ سلسلہ اسباب و مسببات کو دیکھ کر کہیں اسباب ہی کو مؤثر نہ سمجھ بیٹھیں۔ یا وہ لوگ جو اسباب کو کسی درجہ میں بھی مؤثر نہیں سمجھتے لیکن کسی وقت بمقتضائے بشریت خلاف سبب ہونے پر تعجب کر بیٹھتے ہیں ان کے تعجب رفع کرنے کے لئے خرق عادت ظاہر کیا جاتا ہے تاکہ جو نظر بمقتضائے بشریت غلطی سے تھوڑی دیر کے لئے اسباب کی طرف چلی گئی تھی وہ پھر مسبب الاسباب کی طرف واپس آجائے جیسا کہ فرشتے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پاس فرزند کی بشارت لے کر آئے تو حضرت ابراہیم علیہ السلام بہت بوڑھے ہو چکے تھے اوران کی بیوی

[1] القرآن: ۸/۱۰ [2] القرآن: ۱۷/۱۰۲

بوڑھی بھی تھیں اور بانجھ بھی تو بشارت سن کر تعجب سے منہ پر ہاتھ مارنے لگیں۔ یہ تعجب محض ظاہری اسباب کی بناء پر تھا ورنہ معاذ اللہ ان کو خدا کی قدرت میں کوئی شک نہ تھا فرشتوں نے کہا تم کیوں تعجب کرتی ہو یعنی تمہارا تعجب خود قابل تعجب ہے تم تو پیغمبر کے گھر میں رہتی ہو جہاں صبح و شام اللہ کی برکتیں اور رحمتیں اترتی رہتی ہیں اور اس سے بڑھ کر خوارق اور عجائب کا ظہور ہوتا رہتا ہے۔

کبھی یہ مقصد ہوتا ہے کہ ایک جماعت کثیر کو کوئی نفع عام پہنچایا جائے مثلاً انگشتان مبارک سے پانی جاری ہونا جس سے صدہا لوگ سیراب ہو گئے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے لئے دریائے نیل کا خشک ہو جانا بنی اسرائیل کی نجات کا باعث ہوا۔ اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ہاتھ سے مردوں کا زندہ ہونا اور اندھوں کا بینا ہو جانا وغیر ذلک ظاہری اور باطنی بینائی دونوں کا سبب بنا نیز مؤمنین کا ایمان زیادہ ہوا اور منکروں کو عبرت ہوئی خدا اور رسول کی عظمت ظاہر ہوئی۔

سحر اور معجزہ میں فرق

سحر اور معجزہ میں متکلمین نے متعدد فرق ذکر کئے ہیں اول یہ کہ سحر ایک فن ہے کہ جو تعلیم اور تعلّم کے ذریعہ سے حاصل ہو سکتا ہے اور معجزہ تعلیم و تعلّم سے حاصل نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ قرآن عزیز میں ارشاد ہے:

﴿وَلٰكِنَّ الشَّيٰطِيْنَ كَفَرُوْا يُعَلِّمُوْنَ النَّاسَ السِّحْرَ ۚ وَمَآ اُنْزِلَ عَلَى الْمَلَكَيْنِ بِبَابِلَ هَارُوْتَ وَمَارُوْتَ ۭ وَمَا يُعَلِّمٰنِ مِنْ اَحَدٍ حَتّٰى يَقُوْلَآ اِنَّمَا نَحْنُ فِتْنَةٌ فَلَا تَكْفُرْ ۭ فَيَتَعَلَّمُوْنَ مِنْهُمَا مَا يُفَرِّقُوْنَ بِهٖ بَيْنَ الْمَرْءِ وَزَوْجِهٖ ۭ وَمَا هُمْ بِضَاۗرِّيْنَ بِهٖ مِنْ اَحَدٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ ۭ وَيَتَعَلَّمُوْنَ مَا

يَضُرُّهُمْ وَلَا يَنفَعُهُمْ ۚ الاية ﴾ [۱]

ترجمہ: ”لیکن شیطانوں نے کفر کیا کہ لوگوں کو جادو سکھاتے تھے اور ہاروت و ماروت کسی کو سحر نہیں سکھاتے تھے مگر یہ کہہ دیتے تھے کہ ہم منجانب اللہ آزمائش اور امتحان کے لئے بھیجے گئے پس کفر مت کرو پس سیکھتے تھے ان سے وہ چیز جس سے میاں اور بیوی کے درمیان جدائی ڈالیں۔ اور اس سحر سے وہ کسی کو ضرر نہیں پہنچا سکے مگر اللہ کے حکم سے اور وہ ایسی چیز کو سیکھتے تھے جو ان کو ضرر دے نہ کہ نفع۔“

اس آیت میں حق تعالیٰ نے متعدد بار سحر کے تعلیم اور تعلّم کا ذکر کیا ہے جس سے یہی مفہوم ہوتا ہے کہ سحر ایک فن ہے کہ جو تعلیم اور تعلّم کے ذریعہ سے حاصل ہوسکتا ہے۔ بخلاف معجزہ کے کہ وہ تعلیم و تعلّم اور مباشرت اسباب سے حاصل نہیں ہوسکتا۔ اسی وجہ سے حق تعالیٰ نے معجزات کی بابت یہ ارشاد فرمایا:

﴿ قُلْ اِنَّمَا الْاٰیٰتُ عِنْدَاللّٰهِ ﴾ [۲]

ترجمہ: ”کہہ دیجئے کہ جز این نیست کہ نشانیاں تو اللہ کے پاس ہیں۔“

اس کی مثال دوا اور دعا کی سی ہے اس لئے کہ کوئی مریض اگر دوا سے صحت یاب ہو جائے تو اس کو علاج کہتے ہیں کیونکہ علاج کے معنے مباشرت اسباب کے ہیں اور اگر کوئی مریض دعا کے ذریعہ سے آرام پا جائے تو اس کو کرامت کہتے ہیں اس لئے کہ اس صورت میں اسباب ظاہریہ کو کوئی دخل نہیں۔

دوسرا فرق یہ ہے کہ سحر کا معارضہ ہوسکتا ہے ایک ساحر دوسرے ساحر کے سحر کو باطل کرسکتا ہے مگر معجزہ کا کوئی مقابلہ نہیں کرسکتا اور نہ اس کو باطل کرسکتا ہے چنانچہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ساحرین فرعون سے مخاطب ہو کر یہ فرمایا۔

﴿ مَاجِئْتُمْ بِهِ السِّحْرُ ۝ ﴾ [۳]

---

[۱] القرآن: ۲/۱۰۲ [۲] القرآن: ۶/۱۰۹ [۳] القرآن: ۱۰/۱۸

ترجمہ: ”یعنی جو کچھ تم نے پیش کیا ہے وہ سب جادو ہے۔“
اور اس دعوے کی دلیل یہ بیان فرمائی۔
﴿اِنَّ اللّٰهَ سَیُبْطِلُهٗ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا یُصْلِحُ عَمَلَ الْمُفْسِدِیْنَ﴾ [1]
ترجمہ: ”تحقیق اللہ اس کو ضرور باطل فرمائے گا تحقیق اللہ مفسدین کے کام نہیں سنوارتا۔“
یعنی اس کے سحر ہونے کی دلیل یہ ہے کہ حق تعالیٰ تمہارے اس عمل کو عن قریب باطل فرمادیں گے۔ اسی وجہ سے سب سے پہلے ساحرین نے ایمان قبول کیا۔
حسن المحاضرہ میں جلال الدین سیوطی رحمہ اللہ تعالیٰ نے تصریح کی ہے کہ ساحرین کی تعداد تقریباً ڈھائی لاکھ تھی۔ (الخ)۔
ساحرین یہ سمجھ گئے کہ بے شک حضرت موسیٰ علیہ السلام اللہ کے سچے رسول ہیں اور اسی وجہ سے ہمارا سحر ان کے معجزہ کے مقابلہ میں بے کار ہے۔

فائدہ جلیلہ

شیخ اکبر رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے قصہ میں ”تَلْقَفْ مَا صَنَعُوْا“ سے یہ مراد نہیں کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے عصا نے ساحرین کے حبال اور عصی کو بالکل نگل لیا تھا۔ بلکہ مراد یہ ہے کہ ان حبال اور عصی کو کہ جو سحر کے ذریعہ سے سانپ اور بچھو بنادی گئی تھیں۔ ان کی ہیئت کو زائل کر کے پھر ان حبال اور عصی کو اپنی اصلی حالت پر لوٹا دیا کہ جو حالت ان حبال اور عصی کی قبل از سحر تھی اس لئے کہ ”اِنَّمَا صَنَعُوْا کَیْدُ سَاحِرٍ“ اور ”اِنَّ اللّٰهَ لَا یُصْلِحُ عَمَلَ الْمُفْسِدِیْنَ“ اور ”تَلْقَفْ مَا صَنَعُوْا“ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان ساحرین کا

---

[1] القرآن: ۸۱/۱۰

عمل اور تدبیر باطل کی گئی اور ظاہر ہے کہ خود حبال اور عصی ان کا عمل نہ تھا۔ ان کا عمل ان حبال اور عصی کو سانپ اور بچھو کی شکل پر کر دینا تھا۔ "فافھم ذلک فانہ دقیق و لطیف"

تیسرا فرق یہ ہے کہ ایک ساحر کا سحر دوسرے ساحر کے سحر کے منافی ہو سکتا ہے مگر ایک نبی کا معجزہ دوسرے نبی کے معجزہ کے منافی نہیں ہو سکتا۔

چوتھا فرق یہ ہے کہ بعض مرتبہ سحر کی کوئی حقیقت واقعیت نہیں ہوتی جیسا کہ قرآن عزیز میں ارشاد ہے:

﴿يُخَيَّلُ اِلَيْهِ مِنْ سِحْرِهِمْ اَنَّهَا تَسْعٰى ﴾[1]

ترجمہ: "ان کے سحر سے خیال کیا جاتا تھا کہ وہ دوڑ رہے ہیں۔"

﴿سَحَرُوْٓا اَعْيُنَ النَّاسِ وَاسْتَرْهَبُوْهُمْ ﴾[2]

ترجمہ: "لوگوں کی آنکھوں پر جادو کر دیا۔"

معلوم ہوا کہ سحر فقط تخیل اور نظر بندی ہے اور اسی وجہ سے سحر کو بقا نہیں بخلاف معجزہ کے کہ وہ باقی رہ سکتا ہے جیسے صالح علیہ السلام کا ناقہ اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا قرآن کریم۔ قرآن کریم کا اگر سحر ہونا ممکن ہوگا تو تمام اشعار عرب اور تواریخ عالم کا سحر ہونا بھی ممکن ہوگا۔

پانچواں فرق یہ ہے کہ سحر بدون شرائط مخصوصہ اور اوقات مخصوصہ کے عمل میں نہیں آ سکتا بخلاف معجزہ کے کہ اس کے لئے زمان اور مکان مخصوص نہیں۔

چھٹا فرق یہ ہے کہ سحر ہوائے نفس اور اغراض دنیویہ کے لئے ہوتا ہے بخلاف معجزہ کے کہ وہ محض دینی غرض کے لئے ہوتا ہے۔

ساتواں فرق یہ ہے کہ سحر و شعبدہ سفہاء اور جہلاء ہی میں رائج ہوتا ہے اور وہی لوگ اس کو قبول کرتے ہیں۔ بخلاف معجزہ کے کہ وہ علی رؤس الاشہاد عقلاء اور عظماء

---

[1] القرآن: ۲۰/۶۶ [2] القرآن ۷/۱۱۶

کے سامنے ظاہر کیا جاتا ہے اور عقلاء ہی اسی کو قبول کرتے ہیں۔

معجزہ اور کرامت

جو خرق عادت مکذبین نبوت کے الزام اور تعجیز کے لئے نبی کے ہاتھ پر ظاہر ہو وہ معجزہ ہے اور اگر اس خرق عادت سے مقصود محض تشریف اور تکریم ہو تو وہ کرامت ہے خواہ نبی کے ہاتھ پر ظاہر ہو یا ولی کے، لہٰذا معجزہ نبی کے ساتھ مخصوص ہے اور کرامت عام ہے۔

معجزہ اور کرامت کا یہ فرق علامہ شہاب خفاجی رحمہ اللہ تعالیٰ نے نسیم الریاض شرح شفائے قاضی عیاضؒ کے باب رابع کے ابتدا ہی میں ذکر کیا ہے[1] اور قاضی عیاض رحمہ اللہ تعالیٰ کی عبارت سے یہی فرق مفہوم ہوتا ہے جیسا کہ علامہ شہاب نے اس کو فرق مذکور کی تائید میں پیش کیا ہے۔ اور معجزہ اور کرامت کا لغوی مفہوم بھی اسی فرق کی تائید کرتا ہے۔

ایک فرق معجزہ اور کرامت میں یہ ہے کہ معجزہ کا اظہار ضروری ہے بخلاف کرامت کے کہ اس کا اخفاء ضروری ہے۔ "الا عن ضرورة" یہ فرق علامہ یافعی رحمہ اللہ تعالیٰ سے منقول ہے۔ "کما فی الیواقیت والجواهر"

بعض آئمہ نے یہ فرق بیان کیا ہے کہ کرامت کبھی کبھی ولی کے بغیر علم اور بغیر قصد ہی کے صادر ہو جاتی ہے بخلاف معجزہ کے کہ اس کا ظہور نبی کے علم اور قصد کے بعد ہوتا ہے بسا اوقات ولی کو اپنی کرامت کا علم نہیں ہوتا۔ بخلاف نبی کے کہ اس کو معجزہ کا علم ضروری ہے۔

کرامت اور استدراج

جو خرق عادت عباد اللہ المخلصین اور اخیار و صالحین میں سے کسی کے ہاتھ پر ان

---

[1] نسیم الریاض جلد ۲ صفحہ ۴۴۰

کی تشریف وتکریم کے لئے ظاہر ہو وہ کرامت ہے جیسا کہ معلوم ہو چکا ہے اور اگر کسی فاسق وفاجر یا ملحد اور کافر کے ہاتھ پر اس کا ظہور ہو تو وہ مکر اور استدراج ہے۔

خواتم الحکم میں مواقع النجوم سے نقل کیا ہے کہ کرامت اعمال صالحہ کا نتیجہ ہے اور استدارج اعمال سیئہ کا فاسق وفاجر کے ہاتھ امر خارق کا ظہور من جانب اللہ ایک فتنہ اور ابتلاء عظیم ہوتا ہے۔

کرامت اور استدراج کا فرق خود صاحب کرامت اور صاحب استدراج کے فرق سے بخوبی معلوم ہوسکتا ہے صالح اور طالح کا فرق کوئی دقیق نہیں محض صورت دیکھ کر انسان معلوم کر سکتا ہے کہ یہ صالح ہے اور وہ طالح ہے

مرد حقانی کی پیشانی کا نور
کب چھپا رہتا ہے پیش ذی شعور

اور اگر امر خارق کسی مستور الحال کے ہاتھ پر ظاہر ہو کہ جس کا صالح اور فاسق ہونا معلوم نہ تو اس کو معونت کہتے ہیں۔

حافظ تورپشتی رحمہ اللہ تعالیٰ میں فرماتے ہیں کہ زمانہ فتن میں جو کچھ دجال سے احیاء واماتت اور خوارق کا ظہور ہوگا اس کے اسرار وحکم تو اللہ ہی کو معلوم ہیں لیکن یہ ظہور موجب التباس اور اشتباہ نہیں اس لئے کہ اول تو تمام انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام فتنہ دجال سے آگاہ فرما چکے ہیں۔ دوم یہ کہ دجال ایک شخص کو اس پر ایمان نہ لانے کی وجہ سے قتل کرے گا اور پھر زندہ کرے گا۔ بعد زندہ ہونے کے پھر اس سے کہے گا کہ کیا اب اس خرق عادت کے بعد بھی تو ایمان نہ لائے گا تو وہ شخص جواب میں یہ کہے گا کہ مجھ کو تو تیرا دجل پہلے سے بھی زیادہ منکشف ہو گیا۔ اس کے بعد دجال اس کو پھر قتل کرنا چاہے گا لیکن قتل پر قادر نہ ہوگا۔ حالانکہ کسی کا قتل خوارق میں سے نہیں ہے جس سے صاف معلوم ہو جائے گا کہ وہ پہلی مرتبہ جو احیاء مقتول اس کے ہاتھ سے ظاہر ہوا

---

[1] المعتمد فی المعتقد صفحہ ۵۹

تھا وہ محض اللہ کا فعل تھا۔ اس دجال عاجز کے ہاتھ پر اس کا ظہور محض ابتلاء اور امتحان کے لئے تھا۔

سوم یہ کہ اس کا نفس دعوی اس کے کذب کی بین دلیل ہوگا ہر عاقل جانتا ہے کہ ایک جسم محدود، سراپا عجز و احتیاج کا دعوائے الوہیت کیسے صادق ہوسکتا ہے۔

چہارم یہ کہ اس کا اعور یعنی ایک چشم ہونا اور بقول متنبی اس کا نصف الاعمی اور نصف البصیر ہونا دعوائے الوہیت کی تکذیب کے لئے بالکل کافی ہے کہ معاذ اللہ خدا ہوکر اپنی آنکھ کی بھی اصلاح نہ کرسکا۔

چنانچہ حدیث شریف میں ہے۔

"عن عبداللّٰہ رضی اللّٰہ عنہ قال قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم ان اللّٰہ لا یخفی علیکم ان اللّٰہ تعالیٰ لیس باعور وان المسیح الدجال اعورعین الیمنی" [1]

(نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کانا یک چشم نہیں اور مسیح دجال کی دائیں آنکھ کانی ہوگی)۔ [2]

لہٰذا جس میں یہ عیب ہو وہ خدا کیسے ہوسکتا ہے۔

پنجم یہ کہ صحیح مسلم میں حذیفۃ بن الیمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے حدیث دجال میں یہ روایت آئی ہے۔

"مکتوب بین عینیہ کافر یقرأہ مؤمن کاتب وغیر کاتب الخ"

(دجال کی پیشانی پر کافر لکھا ہوا ہوگا جس کو ہر مؤمن پڑھے گا خواہ وہ پڑھا لکھا ہو یا بے پڑھا ہو)۔

---

[1] بخاری جلد ۲ صفحہ ۱۰۵۵ [2] بخاری و مسلم

پس ان امور کے ہوتے ہوئے وہ خوارق کس طرح موجب التباس اور اشتباہ بن سکتے ہیں۔ ہاں موجب فتنہ اور ابتلاء ضرور ہیں۔

اللهم انا نعوذ بك من عذاب القبر ونعوذ بك من فتنة المسيح الدجال ونعوذ بك من فتنة المحيا والممات آمين برحمتك يا ارحم الراحمين يا ذاالجلال والاكرام.

خذلان ونکبت

خوارق کی ایک قسم خذلان ونکبت بھی ہے وہ یہ کہ کوئی خرق عادت مدعی نبوت کے مقصد اور مطلب کے بالکل خلاف ظاہر ہو۔ مثلاً مسیلمہ کذاب کہ جس نے خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں نبوت کا دعویٰ کیا۔ اظہار اعجاز کی غرض سے کسی یک چشم کی آنکھ پر تھوک لگایا تا کہ یہ آنکھ درست ہو جائے لیکن قضائے الٰہی سے دوسری آنکھ بھی نابینا ہوگئی۔ اس کا نام خذلان اور نکبت ہے۔ یعنی من جانب اللہ یہ اس کی تکذیب اور رسوائی ہے۔ یہ قسم حقیقت میں معجزے کے مشابہ اور مماثل نہیں بلکہ اس کا عکس اور مقابل ہے۔

خصائص نبوت

❶ سلاطین عالم کسی شخص کو مسند وزارت کے لئے منتخب کرتے ہیں تو ایسے شخص کو منتخب کرتے ہین جو ان کا نہایت ہی مطیع اور مخلص ہو۔ حکومت کا پورا خیر خواہ ہو۔ اعدائے سلطنت سے کسی قسم کا ساز باز نہ رکھتا ہو۔

❷ اخلاق حسنہ اور اوصاف جمیلہ محامد و مکارم سے آراستہ ہو۔ ذمائم اور محقرات الامور سے بالکلیہ مبرا اور منزہ ہو۔

❸ حسب ونسب میں سب سے فائق اور برتر ہو۔

❹ فہم وفراست عقل وفطانت میں سب سے اعلیٰ اور ارفع ہو سفاہت وغباوت اور

قصور عقل کے دھبہ سے بالکل پاک ہو۔

۵ صدق و امانت اس کا طغرائے امتیاز ہو۔ کذب و خیانت کے تو ہم سے بھی بمراحل بعید ہو۔

۶ دربار شاہی کے آداب کی پوری پوری رعایت رکھتا ہو اس کی کسی حرکت اور سکون سے بادشاہ کی ہمسری کا ادعاء متوہم نہ ہوتا ہو دیگر وزراء کے ساتھ اس کا معاملہ ان کے منصب وزارت اور شان تقرب کے مناسب ہو۔

۱ اسی طرح ملیک مقتدر اور احکم الحاکمین کے وزراء کہ جن کو انبیاء و رسل سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ ان کے لئے یہ ضروری ہے کہ ان کے قلوب اس رب العالمین کے اخلاص اور محبت سے اس درجہ لبریز ہوں کہ معصیت و نافرمانی کے ارادے کی بھی ان میں گنجائش نہ ہو۔ اس ملیک مقتدر کی حکومت کے قائم کرنے کے لئے اس کا نام بلند کرنے کے لئے ہر قسم کے شدائد کا تحمل ان کو لذیذ معلوم ہوتا ہو۔

ایسا نہ کہ حکومت کے باغیوں کو اپنے لئے موجب رحمت و برکت سمجھتے ہوں ان کے ظل مشئوم کو اپنے لئے ظل ہمایونی خیال کرتے ہوں جیسے غلام قادیانی۔

غرض یہ کہ ان کے قلوب میں اس ملیک مقتدر کی محبت و اطاعت اس درجہ راسخ ہو کہ ارادۂ معصیت کی بھی گنجائش نہ رہی ہو اور اسی فطری اجتناب عن المعاصی کا نام ''عصمت'' ہے۔

ایمان و اسلام سے ان کا قلب اس درجہ لبریز ہو کہ کفر و دجل کے لئے جزء لا یتجزء کی مقدار کی بھی اس میں جگہ نہ ہو۔ حاشا ایسا ہرگز ہرگز نہ ہو کہ جس کو خود دجال کہتے ہوں اسی سے قتال و جدال کو حرام بتلاتے ہوں اور نہایت تضرع اور ابتہال سے اس کے بقاء کی دعاء کرتے ہوں۔

۲ فطرۃً اخلاق حسنہ اور اوصاف جمیلہ محامد و فضائل، مکارم و شمائل سے مزین اور مجلی ہوں۔ قابل نفرت امور سے بالطبع متنفر ہوں اور ان کے نفوس قدسیہ جبلۃً تمام ذمائم

سے منزہ ہوں جیسا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بچپن میں اپنے عم محترم حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ساتھ تعمیر کعبہ کے لئے پتھر لا رہے تھے کہ یکا یک آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا بدن مبارک کھل گیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فوراً بے ہوش ہو گئے اور جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے جسم مبارک کو ڈھانپ دیا گیا تو فوراً ہوش میں آ گئے۔

ایک مرتبہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ولیمہ میں شرکت کا موقع ہوا۔ دعوت میں لہو ولعب کا سامان بھی موجود تھا اس بناء پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر صبح تک غشی طاری رہی۔

اور اسی وجہ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم لہسن اور پیاز کا استعمال نہ فرماتے تھے۔ ایک مرتبہ کسی نے دریافت کیا تو یہ جواب ارشاد فرمایا کہ میں جس سے کلام اور مناجات کرتا ہوں تم اس سے کلام اور مناجات نہیں کرتے یعنی فرشتہ۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جب حضرت خدیجہ الکبریٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے وحی کا تذکرہ فرمایا تو حضرت خدیجہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے امتحاناً یہ کہا کہ مجھ کو اپنی رداء مبارک میں لے لیجئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو اپنی رداء مبارک میں لے لیا۔ اندر لیتے ہی وحی منقطع ہوگئی۔ حضرت خدیجہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے کہا کہ بے شک آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس جو آتا ہے وہ یقیناً فرشتہ ہے شیطان نہیں۔ اس لئے کہ ملائکہ اللہ بین الزوجین کبھی حائل نہیں ہوتے پھر حضرت خدیجہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے یہ دریافت کہ اس روحانی شئے کا لباس آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو کس قسم کا دکھائی دیتا ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا سفید اور سبز۔ حضرت خدیجہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے کہا کہ وہ یقیناً فرشتہ ہے کیونکہ سفید اور سبز بہترین رنگ ہے۔ ملائک اور روحانیین کا یہی لباس ہوتا ہے۔ بخلاف شیاطین کے کہ ان کا لباس سیاہ ہوتا ہے۔

۳ حسب ونسب انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کا نہایت پاک اور مطہر ہوتا ہے موجودہ زمانہ کے انساب میں کوئی نسب ان کے نسب سے بہتر نہیں ہوتا۔ انہیں کا نسب سب

سے اعلیٰ اور اشرف ہوتا ہے۔

چنانچہ ہرقل شاہ روم نے جب ابوسفیان سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے نسب کے متعلق دریافت کیا تو یہ جواب دیا:

"ھو فینا ذو نسب" (وہ ہم میں بڑے نسب والا ہے)۔

"وفی روایة البزار: قال ھو فی حسب مالا یفضل علیه احد قال ھذه آیة" [1]

تَرجَمَۃ: "اور بزار کی روایت میں ہے کہ: حسب و نسب میں اس سے بڑھ کر کوئی نہیں۔ شاہ روم نے سن کر یہ کہا کہ یہ ایک علامت ہے ان کی نبوت کی۔"

اور انبیائے کرام ہمیشہ سب سے اعلیٰ بہتر و برتر خاندان میں مبعوث ہوتے رہے ہیں۔ چنانچہ حدیث میں ہے۔ "ما بعث اللّٰه نبیا الا فی منعة قومه او فی ثروة من قومه"

(۴) انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام کا فہم وفراست کے اعتبار سے بھی سب سے ارفع اور اکمل ہونا ضروری ہے۔ قصور فہم کسی طرح شایان شان نبوت نہیں ورنہ قصور فہم کی وجہ سے وحی الٰہی کے سمجھنے میں غلطی پیش آجانا بہت ممکن ہوگا۔

جو شخص قصور عقل کی وجہ سے شاہی خطاب اور اس کے فرامین کو نہیں سمجھ سکتا وہ ایک لمحہ کے لئے مسند وزارت پر نہیں بٹھلایا جاسکتا۔

انبیائے کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام کی بعثت سے مقصد یہ ہوتا ہے کہ بندوں کو یہ معلوم کرا دیا جاوے کہ کون سی شئے خدا کے نزدیک پسندیدہ ہے اور کون سی ناپسندیدہ تاکہ لوگ مرضیات کو اختیار کریں اور غیر مرضیات سے پرہیز کریں اور معاذ اللہ جب یہ جائز رکھا جائے کہ انبیاء کرام بھی وحی الٰہی کی مراد سمجھنے میں غلطی کر سکتے ہیں تو ایسی

[1] فتح الباری: جلد۵ صفحہ۱۶۲

صورت میں بعثت رسل کا کوئی فائدہ مرتب نہ ہوگا۔ کیونکہ جو التباس مرضی الٰہی اور غیر مرضی الٰہی میں قبل از بعثت تھا وہی التباس بعد البعثت بھی باقی رہا۔

❺ انبیاء اللہ کا غدر وخیانت سے پاک ہونا صدق وامانت کے ساتھ موصوف ہونا بھی ضروری ہے۔ چنانچہ ہرقل شاہ روم نے جب ابوسفیان سے یہ دریافت کیا کہ تم نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو قبل از دعوائے نبوت متہم بالکذب پایا ہے ابوسفیان نے کہا کہ نہیں۔

شاہ روم نے پھر یہ سوال کیا کہ کیا وہ کبھی غدر اور بے وفائی بھی کرتے ہیں۔ ابوسفیان نے کہا کہ نہیں۔ اس پر ہرقل شاہِ روم نے یہ کہا کہ انبیاء اللہ کی یہی شان ہوتی ہے انتہی۔

شاہ روم کی مراد یہ ہے کہ صدق وامانت نبوت کا خاصہ لازمہ ہے اور کذب اور خیانت نبوت کے یکسر منافی ہے کسی حالت میں بھی کذب وغدر کا صدور ممکن نہیں۔

اور یہ مطلب ہرگز نہیں کہ اگر کسی مجہول الحال شخص کا کذب ایک محدود زمانہ تک ثابت نہ ہو۔ اور اس کے بعد وہ دعوائے نبوت کرے اور ہزاراں ہزار جھوٹ بولتا رہے تو یہ جھوٹ اس کے ادعائے نبوت میں کسی طرح قادح نہ ہوگا جیسا کہ متنبی قادیان علیہ ما علیہ۔

❻ انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کا کلام وحدہ لاشریک لہ کی ہمسری کے رائحہ سے بھی پاک ہوتا ہے۔

کما قال تعالٰی: ﴿مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّؤْتِيَهُ اللّٰهُ الْكِتٰبَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُوْلَ لِلنَّاسِ كُوْنُوْا عِبَادًا لِّيْ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلٰكِنْ كُوْنُوْا رَبّٰنِيّٖنَ بِمَا كُنْتُمْ تُعَلِّمُوْنَ الْكِتٰبَ وَبِمَا كُنْتُمْ تَدْرُسُوْنَ ۝ وَلَا يَاْمُرَكُمْ اَنْ تَتَّخِذُوا الْمَلٰٓئِكَةَ وَالنَّبِيّٖنَ اَرْبَابًا ۭ اَيَاْمُرُكُمْ بِالْكُفْرِ بَعْدَ اِذْ اَنْتُمْ

مُّسْلِمُوْنَ ۝ ﴾[1]

ترجمہ: ”جس آدمی کو اللہ تعالیٰ کتاب اور علم اور نبوت عطا فرمائے اس کے لئے یہ ناممکن ہے کہ وہ لوگوں کو یہ کہے کہ تم میرے بندے ہو جاؤ بلکہ وہ تو یہ کہے گا کہ تم سب اللہ والے ہو جاؤ اس لئے کہ تم کتاب الٰہی کو پڑھتے اور پڑھاتے ہو۔ اور نہ تم کو یہ حکم دے گا کہ تم فرشتوں اور پیغمبروں کو خدا بناؤ۔ کیا تم کو مسلمان ہونے کے بعد کفر کا حکم دے گا۔“

نیز انبیائے کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام سے ایک دوسرے کی تحقیر کا صادر ہونا ناممکن اور محال ہے۔

کما قال تعالیٰ: ﴿ اٰمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِ مِنْ رَّبِّهٖ وَالْمُؤْمِنُوْنَ ؕ كُلٌّ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهٖ قف ﴾[2]

ترجمہ: ”ایمان لایا پیغمبر اس چیز پر کہ جو اللہ کی جانب سے اس کی طرف اتاری گئی اور مؤمنین بھی ایمان لائے سب ایمان لائے اللہ پر اور اس کے فرشتوں پر اور اس کی تمام کتابوں پر اور تمام پیغمبروں پر، تفریق نہیں کرتے پیغمبروں کے درمیان میں کہ بعض پر ایمان لائیں اور بعض کا انکار کریں۔“

﴿ اِنَّ الَّذِيْنَ يَكْفُرُوْنَ بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ وَيُرِيْدُوْنَ اَنْ يُّفَرِّقُوْا بَيْنَ اللّٰهِ وَرُسُلِهٖ وَيَقُوْلُوْنَ نُؤْمِنُ بِبَعْضٍ وَّنَكْفُرُ بِبَعْضٍ وَّيُرِيْدُوْنَ اَنْ يَّتَّخِذُوْا بَيْنَ ذٰلِكَ سَبِيْلًا ۝ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ حَقًّا ۚ وَاَعْتَدْنَا لِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابًا مُّهِيْنًا ۝ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ وَلَمْ يُفَرِّقُوْا بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ

[1] القرآن: ۳/۷۹، ۸۰ [2] القرآن: ۲/۲۸۵

أُولَٰٓئِكَ سَوْفَ يُؤْتِيهِمْ أُجُورَهُمْ ۗ وَكَانَ اللَّهُ غَفُورًا رَّحِيمًا ﴿١٥٢﴾ [1]

ترجمہ: ''تحقیق وہ لوگ کہ جو اللہ اور اس کے پیغمبروں کا انکار کرتے ہیں اور اللہ اور اس کے رسولوں میں تفریق کرنا چاہتے ہیں اور یہ کہتے ہیں کہ ہم بعض پیغمبروں کی تصدیق اور بعض کی تکذیب کرنا چاہتے ہیں اور اس کے بین بین ایک نیا راستہ نکالنا چاہتے ہیں۔ ایسے ہی لوگ بلاشبہ پکے کافر ہیں ان کافروں کے لئے ایک ذلیل کرنے والا عذاب تیار ہے اور جو لوگ ایمان لائے اللہ پر اور بلا تفریق اس کے تمام پیغمبروں پر تو اللہ تعالیٰ ان کو اجر عطا فرمائے گا اور ان کے گناہوں کی مغفرت کرے گا اور ان پر رحم فرمائے گا۔''

الحاصل: اس ملیک مقتدر اور احکم الحاکمین نے اپنی خلافت و وزارت کے لئے انبیاء کرام کو منتخب فرمایا ہے۔ مگر چونکہ وہ علیم وخبیر اور علیم بما فی الصدور بھی ہے۔ یعلم السر والخفی بھی ہے اس لئے وہ اپنی وزارت و نیابت کے لئے ایسے ہی اشخاص کو منتخب فرماتا ہے کہ جو ظاہراً اور باطناً ہر طرح سے خدا کے مطیع اور فرماں بردار ہوں۔ پورے مخلص اور جاں نثار ہوں یہ ناممکن اور قطعاً محال ہے کہ وہ علیم وخبیر غلطی سے ایسے شخص کو وزارت کے لئے منتخب فرمائے گا جو ظاہراً تو اس کا مطیع اور باطناً اس کا نافرمان ہو یہی وجہ ہے کہ انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام معصوم ہوتے ہیں اور کبھی مرتبۂ نبوت اور منصب رسالت سے علیحدہ نہیں کئے جاتے۔ بخلاف سلاطین عالم کے کہ ان کے انتخاب میں بسا اوقات غلطی ہوتی ہے اور غیر مطیع کو مطیع سمجھ جاتے ہیں۔ اور یہی وجہ ہے کہ بعض مرتبہ سلاطین کو اس کی ضرورت پیش آتی ہے کہ وزراء کو منصب وزارت سے علیحدہ کیا جائے۔

---

[1] القرآن: ۴/۱۵۰ تا ۱۵۲

اور جس طرح وزراء باوجود عظیم تقرب کے شہنشاہیت میں شریک نہیں سمجھے جاتے۔ ہاں بارگاہ سلطانی میں کسی کی سفارش کر سکتے ہیں۔

اسی طرح انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام بھی خدائی میں شریک نہیں ہوتے۔ صرف بارگاہ ایزدی میں اذن واجازت کے بعد کسی کی سفارش فرماسکتے ہیں۔ اسی کا نام اہل اسلام کے نزدیک شفاعت ہے۔

مناظرہ حنفاء وصائبین

دربارۂ تفضیل انبیاء وروحانیین

جمہور اہل سنت والجماعت کا مسلک یہ ہے کہ حضرات انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام ملائکہ سے افضل ہیں حق جلاوعلا نے آدم علیہ السلام کو مسجود ملائک بنایا اپنی خلافت عطا فرمائی۔ اور فرشتوں سے بڑھ کر علم عطا فرمایا۔ اور سورہ انعام میں حضرت نوح اور حضرت ابراہیم اور یعقوب اور اسحاق اور داؤد اور سلیمان اور موسیٰ اور ہارون اور زکریا اور یحییٰ اور عیسیٰ علیہم الصلوٰۃ والسلام وغیرہم کا ذکر کر کے فرماتے ہیں۔ ”وَكُلًّا فَضَّلْنَا عَلَى الْعَالَمِيْنَ“[1] یعنی ان میں سے ہر ایک کو تمام جہان والوں پر فضیلت دی۔ اور ظاہر ہے کہ عالمین میں فرشتے بھی داخل ہیں معلوم ہوا کہ حضرت انبیاء ملائکہ سے افضل ہیں۔ امام شہرستانی رحمہ اللہ تعالیٰ نے ملل ونحل میں اس مسئلہ پر حنفاء اور صائبین کا ایک مناظرہ ذکر فرمایا ہے جو نہایت لطیف اور لذیذ ہے اس کا خلاصہ اہل علم کے ذوق کے لئے پیش کرتے ہیں۔

صائبین: ملائکہ انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام سے افضل ہیں اس لئے کہ ملائکہ روحانی اور مجرد ہیں اور انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام جسمانی اور مادی، اور ظاہر ہے کہ روحانی اور مجرد مادی اور جسمانی سے افضل ہوتا ہے۔

---

[1] القرآن ۶/۸۷

حنفاء: یہ تفصیل اس وقت صحیح ہوسکتی ہے کہ جب مفاضلہ فقط روحانی اور فقط جسمانی میں قائم کیا جائے لیکن اگر ایک جانب فقط روحانیت ہو اور دوسری جانب روحانیت اور جسمانیت دونوں ہوں اور وہ جسمانیت روحانیت کے ہر طرح سے محکوم اور مطیع ہو تو اس صورت میں عقل سلیم محض روحانی کے مقابلہ میں اس شئے کو ترجیح دے گی کہ جو جسمانیت اور روحانیت دونوں کی جامع ہو۔

اور ماسبق میں ہم ذکر کر چکے ہیں کہ انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام بشریت اور ملکیت دونوں کے جامع ہوتے ہیں اور ان کی قوۃ ملکیہ اور روحانیت ملائکہ کی روحانیت سے بدرجہا بڑھی ہوئی ہوتی ہے۔ اس کی ایسی مثال ہے کہ جب فقط معنی کا فقط لفظ کے ساتھ موزانہ کیا جائے تو یقیناً فقط معنی کو محض لفظ پر ترجیح ہوگی۔ لیکن اگر محض معنی کا ان لطیف معنی کے ساتھ موازنہ کیا جائے جو بہترین الفاظ سے مزین ہوں تو ظاہر ہے کہ انہی معنی کو ترجیح ہوگی کہ جو عمدہ لباس سے آراستہ ہوں۔ انسان اگرچہ برہنہ ہو مگر بہرحال لباس سے گو وہ کیسا ہی قیمتی کیوں نہ ہو افضل اور بہتر ہے لیکن ایک برہنہ انسان اس انسان پر کسی طرح فائق نہیں ہوسکتا کہ جو انسان بہترین لباس سے مزین بھی ہو۔ نیز روحانیت تجرد کی وجہ سے اگرچہ نہایت کامل اور اکمل ہے لیکن دوسرے کے لئے مکمل نہیں اور ظاہر ہے کہ مفاضلہ کے وقت اسی کو ترجیح اور فضیلت ہونی چاہئے کہ جو کاملیہ اور مکملیہ دونوں کا جامع ہو اور وہ ذات ہرگز قابل ترجیح نہیں کہ جو فقط کامل ہو مگر کمال تکمیل سے عاری ہو۔

صائبین: ملائکہ کرام قوۃ شہویہ اور غضبیہ سے بالکل پاک ہیں بخلاف نوع انسانی کے کہ وہ کسی طرح قوۃ غضبیہ اور شہویہ سے خالی نہیں اور یہی دونوں قوتیں اخلاق ذمیمہ کا سرچشمہ ہیں اس لئے کہ حرص وغیرہ قوۃ شہویہ سے پیدا ہوتی ہے اور کبر و حسد وغیرہ قوۃ غضبیہ سے۔ لہٰذا اس نوع کو کہ جو ان دونوں قوتوں اور اس کے مفاسد سے منزہ ہیں۔ اس نوع پر ضرور فضیلت ہونی چاہئے کہ جس کا دامن ان ادناس اور معائب

سے پاک نہیں۔

حنفاء: نوع انسانی بے شک قوۃ غضبیہ اور شہویہ سے خالی نہیں اور بے شک قوۃ غضبیہ وشہویہ اور قوۃ ملکیہ اور روحانیہ میں ایک عظیم تجاذب ہے لیکن قوۃ غضبیہ اور شہویہ کو مطلقاً اخلاق ذمیمہ کا سرچشمہ بتلانا صحیح نہیں بلکہ جس صورت میں قوۃ ملکیہ کو پورا تسلط ہو اور قوۃ روحانیہ ہر طرح سے حاکم ہو۔ اور قوۃ غضبیہ اور شہویہ من کل الوجوہ قوت ملکیہ کے محکوم اور مطیع ہو تو اس صورت میں قوۃ ملکیہ قوۃ غضبیہ سے بجائے کبر حسد کے شوکت اور شجاعت، غیرت اور حمیت کا کام لے سکتی ہے بلکہ قوۃ غضبیہ کا نہ ہونا ایک قسم کا نقص ہے اس لئے کہ قوۃ غضبیہ سے خالی ہونا جبن اور بزدلی کے مرادف ہے۔

اور علی ہذا قوۃ ملکیہ قوۃ شہویہ سے بجائے حرص اور طمع کے موت اور موانست، تواضع اور مسکنت کا کام لے سکتی ہے اور جس طرح قوۃ غضبیہ سے خالی ہونا عیب ہے اسی طرح قوۃ شہویہ سے خالی ہونا بھی عیب ہے اس لئے کہ جو شخص قوۃ شہویہ سے عاری ہوگا وہ موانست اور ترحم سے بھی ضرور خالی ہوگا اس لئے کہ ترحم قوۃ شہویہ ہی سے پیدا ہوتا ہے۔

الحاصل نفوس ملکیہ صرف قوۃ ملکیہ پر مشتمل ہوتے ہیں اور نفوس بشریہ قوۃ ملکیہ کے علاوہ قوۃ غضبیہ اور شہویہ (جو کہ روحانیت کے لئے سخت منافر اور مزاحم ہیں) پر بھی مشتمل ہوتے ہیں لیکن انبیاء کرام سے باوجود ان عوائق کے کوئی فعل قوۃ ملکیہ کے خلاف نہ صادر ہونا انتہائی کمال ہے جبان (بزدل) کا نہ حملہ کرنا اور انتقام نہ لینا کوئی کمال نہیں۔ ہاں شجاع اور توانا کا باوجود مقدرت کے عفو اور صفح سے کام لینا انتہائی کمال ہے۔ عنین کا سوء اور فحشاء سے مامون رہنا کوئی کمال نہیں ہاں کسی قوی اور جوان کا پاک دامن رہنا بے شک اس کی فضیلت کی دلیل ہے۔

اسی طرح ملائکہ کا قوت شہویہ اور غضبیہ سے خالی ہو کر معصوم رہنا کوئی زائد کمال نہیں۔ ہاں انبیاء کرام کا باوجود ان قوی موانع کے معصوم رہنا اور دو شدید سرکشوں کو یعنی

قوۃ غضبیہ اور شہویہ کو اپنا خادم بنالینا انتہائی کمال ہے۔

خلاصہ یہ کہ قوت کا نہ ہونا کمال نہیں بلکہ قوۃ کا ہونا اور اس کا بہتر محل میں استعمال کرنا یہ کمال ہے۔

(صائبین): روحانیت تمام تر نورانی ہیں اور جسمانیت ظلمانی اور ظاہر ہے کہ نورانی اور ظلمانی شرف میں مساوی بھی نہیں ہو سکتے فضیلت تو در کنار۔

(حنفاء): یہ قاعدہ مسلم نہیں کہ ہر روحانی نورانی ہوتا ہے اس لئے کہ اگر روحانی سے مالیس بجسمانی (یعنی جو جسمانی نہ ہو) مراد ہے تو اس معنی کے اعتبار سے روحانیت میں شیاطین اور جنات بھی داخل ہو جاتے ہیں اور ملائکہ کے ساتھ شیاطین اور جنات کا بھی عیاذاً باللہ انبیاء کرام سے افضل ہونا لازم آئے گا اور اگر روحانی سے یہ مراد ہے کہ جو شئے روح سے پیدا کی گئی ہو تب بھی یہ قاعدہ مسلم نہیں اس لئے کہ بعض روحیں خبیث اور شریر بھی ہوتی ہیں لہٰذا سب کو نورانی کہنا کیسے صحیح ہو سکتا ہے بلکہ حقیقت امر یہ ہے کہ جس شئے میں جس قدر طاعت الٰہی غالب ہوگی اسی قدر نورانیت اور روحانیت بھی غالب ہوگی اور جس قدر طاعت الٰہی سے بعد ہوگا۔ اسی قدر ظلمانیت اور شیطانیت کا غلبہ ہوگا۔

(صائبین): روحانیت تمام تر علوی ہیں اور جسمانیت تمام تر سفلی۔ اور علوی سفلی سے یقیناً افضل ہوتا ہے۔

(حنفاء): جہت کے اعتبار سے عالی ہونا علو مرتبت کی دلیل نہیں۔ ممکن ہے کہ کوئی شئے جہت کے اعتبار سے عالی ہو۔ لیکن مرتبہ کے لحاظ سے سافل بلکہ اسفل ہو اور علی ہذا کوئی شئے جہت کے اعتبار سے سافل ہو لیکن مرتبہ کے اعتبار سے عالی بلکہ اعلی ہو۔ یہ ضروری نہیں کہ بالا خانہ کا رہنے والا تہ خانہ کے رہنے والے سے افضل ہو۔

(صائبین): روحانیت تمام تر لطیف ہیں اور جسمانیت کثیف اور لطیف کا کثیف سے افضل ہونا بالکل ظاہر ہے۔

(حنفاء): ذات اور حقیقت کے لحاظ سے فضیلت قائم کرنا اور اس اعتبار سے کسی شئے کی افضیلت پر استدلال کرنا درحقیقت ابلیس کی نقل ہے۔ اس لئے کہ اس قسم کے استدلال کا بانی وہی ہے۔

کما قال تعالیٰ: ﴿خَلَقْتَنِیْ مِنْ نَّارٍ وَّخَلَقْتَهٗ مِنْ طِیْنٍ﴾ [۱]

تَرجَمہ: ''مجھ کو بنایا تو نے آگ سے اور اُس کو بنایا مٹی سے۔''

لیکن اس رجیم نے اس پر نظر نہ کی کہ طبیعت ناریہ بالذات مضر اور محرق ہے اور طبیعت ترابیہ بالذات مفید اور منبت ہے نیز جس قسم کی رزانت اور وقار مٹی میں ہے آگ میں اس کا ایک کرشمہ بھی نہیں۔ آگ میں ایک قسم کا اضطرار ہے کہ جس سے طبیعت ترابیہ بالکل پاک ہے۔ نیز ابلیس نے اس پر نظر نہ کی کہ حضرت آدم علیہ السلام کو دست قدرت سے پیدا ہونے کی ایسی فضیلت حاصل ہے کہ ابلیس اس سے محروم ہے۔

الحاصل حقیقت اور ذات کے اعتبار سے شرف ثابت کرنا صحیح نہیں بلکہ شرف اور فضل کا مدار طاعت الٰہی پر ہے حقیقی روحانیت اور حقیقی حیات حق تعالیٰ کی اطاعت سے حاصل ہوتی ہے اور یہی تمام فضائل کا سرچشمہ ہے اور اسی پر شرف اور فضل کا مدار ہے۔

(صائبین): روحانیات بہ نسبت جسمانیات کے قوت علمیہ اور عملیہ میں ہر طرح سے اکمل ہوتی ہیں قوۃ علمیہ کے کمال کی دلیل یہ ہے کہ ان کو وہ مخفی امور معلوم ہوتے ہیں کہ جو جسمانیت کو نہیں معلوم ہوتے نیز روحانیت کے علوم کلی ہوتے ہیں اور جسمانیات کے علوم جزئی۔ نیز روحانیات کے علوم فعلی اور فطری ہوتے ہیں اور جسمانیات کے علوم انفعالی اور اکتسابی۔ اور قوت علمیہ کے کمال کی دلیل یہ ہے کہ ملائکہ لیل ونہار عبادت کرتے رہتے ہیں مگر کبھی ان کو تکان نہیں ہوتا۔

کما قال تعالیٰ: ﴿یُسَبِّحُوْنَ الَّیْلَ وَالنَّهَارَ لَا یَفْتُرُوْنَ﴾ [۲]

---

[۱] القرآن ۷۶/۳۸ [۲] القرآن: ۲۰/۲۱

ترجمہ: ”لیل و نہار مسلسل اللہ کی تسبیح پڑھتے ہیں کبھی اس میں فترت نہیں ہوتی۔“

بخلاف جسمانیت کے کہ ان سے اس قدر شاق امور کا تحمل نہیں ہوسکتا۔

(حنفاء): انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کے علوم کلی بھی ہوتے ہیں اور جزئی بھی، فعلی بھی ہوتے ہیں اور انفعالی بھی، فطری بھی ہوتے ہیں اور اکتسابی بھی۔

انبیاء کرام قوت ملکیہ اور قوت علمیہ سے علوم کلیہ کا ادراک فرماتے ہیں اور حواس ظاہرہ سے علوم جزئیہ کا ادراک کرتے ہیں نیز جب انبیاء کرام ملأ اعلیٰ اور عالم ملکوت کی طرف متوجہ ہوتے ہیں تو اس وقت ان کو علوم کلیہ فطری طور پر دفعتاً حاصل ہوتے ہیں اور جب وہ عالم شہادت کی جانب متوجہ ہوتے ہیں تو تدریجی طور پر حواس ظاہرہ کے ذریعہ سے علوم جزئیہ کا اکتساب فرماتے ہیں۔ ہمارے معقولات انبیاء کرام کے حق میں محسوسات اور مبصرات سے زائد روشن اور اجلی ہوتے ہیں۔ ہمارے نظریات ان کے حق میں فطریات سے زائد اقرب ہوتے ہیں۔ اور ان حضرات کی نظریات اس درجہ دقیق اور غامض ہوتی ہیں کہ دوسروں کے فہم وہاں پہنچنے سے قاصر رہتے ہیں۔

رہا یہ امر کہ ملائکہ لیل و نہار تسبیح وتہلیل کرتے ہیں سو اس کے متعلق یہ عرض ہے کہ مزید عبادت اور مزید خدمت کی بے شک کافی دلیل ہے مگر فضیلت کی دلیل نہیں۔

خدمت و اطاعت اگر چہ کسی حد تک پہنچ جائے مگر منصب وزارت سے اشرف نہیں عبادت کا مفہوم صرف خدمت اور اطاعت ہے اور نبوت و رسالت کا مفہوم نیابت شاہی اور خلافت سلطانی ہے۔ اب آپ خود سمجھ لیجئے کہ خدمت اور نیابت، اطاعت اور خلافت میں کون افضل ہے اور کون مفضول۔

(صائبین): ملائکہ میں تصریف اجسام اور تقلیب اجرام کی ایسی عظیم الشان قوت موجود ہے کہ نوع انسانی میں اس کا کوئی شمہ بھی نہیں چنانچہ حضرت جبرئیل علیہ السلام کا قوم لوط کی بستیوں کو کہ جس میں چھ لاکھ اور بقول بعض چھ کروڑ کی آبادی تھی۔ آسمان

پر لے جا کر الٹ دینا خود قرآن عزیز میں مذکور ہے۔

(حنفاء): یہ قوت ملائکہ ساتھ مخصوص نہیں بلکہ اس قسم کی قوت جنات اور شیاطین میں بھی موجود ہے تو کیا اس وجہ سے شیاطین اور جنات کے لئے بھی کوئی فضیلت حاصل ہوسکتی ہے۔

(صابئین): ملائکہ کا اختیار چونکہ خیر کی جانب متوجہ ہوتا ہے اور نوع انسانی کا اختیار خیر وشر دونوں جانب کو متضمن ہوتا ہے۔ لہٰذا وہ اختیار کہ جو فقط خیر پر مقصور ہو اس اختیار سے بہتر ہے کہ جو خیر وشر دونوں میں دائر ہو۔

(حنفاء): روحانیت کا اختیار صرف ایک جانب پر مقصور ہونے کی وجہ سے جبر اور اضطرار کو متضمن ہے اور اختیار بشر دونوں جانبوں میں دائر ہونے کی وجہ سے وسیع ہے بشر اگر ایک جانب خدا کی آیتوں کو دیکھتا ہے تو دوسری جانب شیاطین کے دامہائے تزویر بھی دیکھتا ہے کبھی حق تعالیٰ کی طرف مائل ہوتا ہے اور کبھی مزخرفات شیطانی کی جانب۔ لیکن اگر انسان ایسی حالت میں حق تعالیٰ کی وحدانیت کا اقرار کرے اور اس کی اطاعت کو شیطان کی اطاعت پر بلا کسی قسم کے جبر واکراہ کے ترجیح دے اور اختیار کو جو خیر وشر دونوں میں دائر ہے اس کو خدا کی اطاعت پر مقصور کر دے تو یہ اختیار اس اختیار سے یقیناً افضل ہوگا کہ جو فطرۃً مجبور کرے اور صرف ایک جانب پر مقصور ہے۔

عنین کا زنا کی طرف نہ مائل ہونا کچھ قابل مدح نہیں۔ ہاں اگر ایک قوی اور جوان شخص اپنے کو محفوظ رکھے تو وہ بے شک مستحق تحسین ہوگا۔

نیز یہ بالکل ظاہر ہے کہ اس احکم الحاکمین اور قادر مطلق کا اختیار کسی ایک جانب پر مقصور نہیں بلکہ وہ سب کو محیط اور ہر خیر وشر کو متناول ہے کوئی خیر وشر اس کی قضا اور اس کے اختیار اور مشیت سے باہر نہیں اور چونکہ انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام اسی بارگاہ احکم الحاکمین کے وزیر اور نائب ہوتے ہیں اس لئے مناسب ہے کہ انبیاء کرام کا اختیار بلکہ بنی آدم کا اختیار حضرت آدم علیہ السلام کے خلیفۃ اللہ کی ہونے کی وجہ سے خداوندی

اختیار کے قائم مقام ہونا چاہئے۔ اور جس طرح اس علیم وخبیر نے اپنے خزائن علم سے حضرت آدم علیہ السلام اور حضرات انبیاء علیہم السلام کو وہ علوم عطا فرمائے کہ جو ملائکہ کرام کو نہیں دیئے۔ اسی طرح ان کو ایسا اعلیٰ اور اکمل اختیار عطا کیا کہ ملائکہ کرام کو نہیں عطا فرمایا۔

اسی لئے اگر وہ اپنے قیمتی اختیار کو برمحل صرف کرتا ہے تو ملائکہ سے بھی انسان بڑھ جاتا ہے اور اگر اس بیش بہا اختیار کو بے محل صرف کرتا ہے تو حیوانات اور بہائم سے بھی بدتر ہو جاتا ہے۔

اور جس طرح حق تعالیٰ کے اوامر ونواہی کا ظہور انبیاء کرام کی پاک زبانوں سے ہوتا ہے اسی طرح حق تعالیٰ کے افعال اور امور تکوینیہ کا ظہور ان حضرات کے ہاتھوں سے ہوتا ہے۔

اور ان امور تکوینیہ اور افعال الٰہیہ کا ان حضرات کے ہاتھوں پر ظاہر ہونا ان کے اقوال اور اوامر ونواہی کے من جانب اللہ ہونے کی تاکید اور تائید کرتا ہے کہ جس طرح یہ افعال من جانب اللہ ہیں اسی طرح یہ اقوال اور اوامر ونواہی بھی من جانب اللہ ہیں اور انہی افعال الٰہیہ کو جو انبیاء کرام کے ہاتھوں پر ظاہر ہوتے ہیں، اصطلاح شریعت میں معجزہ کہتے ہیں۔

اور جس طرح کہ حیوانات اور بہائم انسانی افعال اور اس کی حرکات کو بہ نگاہ استعجاب دیکھتے ہیں اور انسان کے عجیب وغریب افعال کی حقیقت معلوم کرنے سے قاصر رہتے ہیں۔ اسی طرح عام بشر انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کے کرامات اور معجزات کو دیکھ کر تعجب کرتے ہیں اور ان کی کنہ اور حقیقت کے ادراک سے قاصر اور عاجز رہتے ہیں۔

لہٰذا کسی شخص کا انبیاء کرام کے معجزات سے انکار کر دینا اس مچھر اور چیونٹی کے انکار سے زیادہ نہیں کہ جو انسان کے عجیب وغریب افعال کا انکار کر دے۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اثبات رسالت نبی اکرم سیدنا محمد مصطفیٰ

صلی اللّٰہ علیہ وعلی آلہ واصحابہ وازواجہ وذریاتہ وبارک وسلم

اس علیم وحکیم کی یہ سنت ہے کہ انبیاء ومرسلین کی تائید ورسالت اور اثبات نبوت کے لئے کچھ حسی اور کچھ عقلی آیات وبراہین عطا فرماتا ہے کہ جن کے مشاہدہ کے بعد ہر اس شخص کو کہ جس کا قلب زیغ اور عناد اور غرور واستکبار، شرارت اور کج فہمی سے پاک ہو۔ بالبداہت یہ سمجھ جاتا ہے کہ یہ حضرات اللہ کے برگزیدہ بندے ہیں۔ انہیں کی تائید اور تصدیق کے لئے اور انہیں کے اعزاز اور اکرام کے لئے اور انہیں کے دشمنوں کی تحقیر وتذلیل کے لئے یہ کرشمہ ہائے قدرت ظاہر کئے جا رہے ہیں سارا عالم مل کر بھی ان کا مقابلہ نہیں کر سکتا ؎

چوں شود از رنج و علت سلیم
طعم صدق و کذب را باشد علیم

ترجمہ: ”اور جس کا قلب کج فہمی اور زیغ وعناد کے مرض میں مبتلا ہو اس پر انبیاء کرام کی تعلیم کا اثر نہیں ہوتا۔ بلکہ کسی حق بات کا بھی اس پر اثر نہیں ہوتا۔“

ومن یك ذافم مر مریض
یجد مرا به الماء الزلالا

ترجمہ: ”جس کے منہ کا مزہ تلخ ہو اس کو آب زلال بھی تلخ معلوم ہوتا ہے۔“

عقلی نشانی: ان کے پاکیزہ اصول اور ان کے قاہر و باہر معارف و علوم مبین اور ان کے مبارک چہروں کا انوار نبوت و رسالت سے درخشاں و تاباں ہونا ہے جس کا ادراک ارباب بصیرت اور اصحاب عقول کو پہلی ہی نظر میں ہو جاتا ہے ؎

مرد حقانی کی پیشانی کا نور
کب چھپا رہتا ہے پیش ذی شعور

اور حسی نشانی جیسے ابراہیم علیہ السلام کے لئے نار کا برد و سلام ہو جانا اور موسیٰ علیہ السلام کے لئے دریا کا پھٹ جانا اور دھوپ کے وقت وادی تیہ میں ابر کا سایہ کرنا اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے لئے احیاء موتی اور ابراء اکمہ وابرص۔ اس قسم کی آیات بینات کا ظاہر ہونا جس سے ان کا مؤید من اللہ ہونا صاف ظاہر ہوتا ہے اور دیکھنے والوں پر یہ بات بخوبی منکشف ہو جاتی ہے کہ اس قسم کے عجیب و غریب خوارق اور معجزات کا صدور و ظہور بدوں تائید الٰہی اور امداد غیبی و سماوی کے ناممکن اور محال ہے اسی سنت کے مطابق حق تعالیٰ شانہ نے نبی اکرم محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت و رسالت کی تصدیق کے لئے دونوں قسم کی آیات و معجزات ظاہر فرمائے۔

معجزاتِ عقلیہ

❶ آپ کے اخلاق و اعمال، شمائل و احوال آپ کے علوم و معارف آپ کے جوامع الکلم اور محاسن اشارات کہ جن کے دقائق و اسرار کے ادراک سے اذکیائے عالم قاصر و عاجز ہیں۔

آپ کی کامل و مکمل شریعت آپ کی ملت حنفیہ سمحہ و بیضاء جس کی شان یہ ہے "لیلها ونهارها سواء" جن حضرات نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق اور شمائل و احوال کا مشاہدہ کیا اور آپ کے خطبات اور کلمات طیبات کو گوش ہوش سے سنا ان کو سنتے ہی اس کا کامل یقین ہو گیا کہ یہ کوئی اکتسابی شئے نہیں بلکہ تعلیم الٰہی اور

تائید سمائی ہے۔

اس لئے کہ ایک شخص کہ جس نے ایک حرف پڑھا اور نہ لکھا نہ کسی سے تعلیم پائی اور نہ طلب علم کے لئے کبھی کوئی سفر کیا۔ اور ایسے قبیلہ اور ایسے شہر اور ایسے زمانہ میں ظاہر ہوا کہ جہاں علم کا نام ونشان بھی نہ تھا۔ ملک کا ملک جہالت اور رذائل اخلاق اور فواحش کا معدن ومنبع بنا ہوا تھا۔ ایسی قوم میں رہ کر ایک یتیم اور امی کا تمام رذائل سے پاک اور منزہ رہنا اور مکارم اخلاق اور محاسن آداب صدق وامانت، صبر وشکر، زہد وعدل عفت وعصمت۔ تواضع وشجاعت حیاء ومروت، جود وکرم، غرض یہ کہ تمام مکارم ومحاسن اور شمائل وآداب کا منبع وسرچشمہ ہو جانا۔ اور ایسے علوم ومعارف کا بیان کرنا کہ اولین وآخرین میں کہیں اس کی نظیر نہ ہو۔ اگر یہ تعلیم ربانی اور موہبت رحمانی نہیں تو بتلاؤ یہ کیا ہے۔ "ذالك فضل الله يؤتيه من يشاء والله ذوالفضل العظيم"

اور حق تعالیٰ شانہ کے اس ارشاد میں اسی طرف اشارہ ہے:

وقال تعالىٰ: ﴿اَمْ لَمْ يَعْرِفُوْا رَسُوْلَهُمْ فَهُمْ لَهٗ مُنْكِرُوْنَ﴾[۱]

ترجمہ: "کیا یہ لوگ اپنے رسول سے ناواقف ہیں جو اس کے منکر ہو رہے ہیں۔"

وقال تعالىٰ: ﴿وَمَا كُنْتَ تَتْلُوْا مِنْ قَبْلِهٖ مِنْ كِتٰبٍ وَّلَا تَخُطُّهٗ بِيَمِيْنِكَ اِذًا لَّارْتَابَ الْمُبْطِلُوْنَ﴾[۲]

ترجمہ: "آپ اس سے پہلے نہ کوئی کتاب پڑھتے تھے اور نہ اپنے ہاتھ سے کچھ لکھتے تھے اگر بالفرض ایسا ہوتا تو ممکن تھا کہ یہ باطل پرست آپ کی نبوت میں کوئی شبہ نکالتے۔"

وقال تعالىٰ: ﴿فَقَدْ لَبِثْتُ فِيْكُمْ عُمُرًا مِّنْ قَبْلِهٖ ۭ اَفَلَا

۱۔ القرآن: ۲۳/۶۹ ۲۔ القرآن: ۲۹/۴۸

تَعْقِلُوْنَ ﴿۱۶﴾ ؎

ترجمہ: ”آپ کہہ دیجئے کہ میں تو اس سے پہلے عمر کا ایک حصہ تم میں گزار چکا ہوں کیا پھر بھی نہیں سمجھتے۔“

یتیمے کہ ناکردہ قرآن درست
کتب خانہ چند ملت بشست
نہ از لات و عزیٰ بر آورد گرد
کہ توریت و انجیل منسوخ کرد

قرآن اور حدیث پر ایک اجمالی نظر ڈال لیجئے خود معلوم ہو جائے گا کہ علوم و معارف کا دریائے ذخار ہے کوئی خیر ایسی نہیں کہ جس کا حکم نہ دیا گیا ہو اور کوئی شر ایسا نہیں کہ جس سے منع نہ کیا گیا ہو زندگی کا کوئی شعبہ ایسا نہیں کہ جس کے احکام نہ بتلائے گئے ہوں وغیرہ وغیرہ۔

عبداللہ بن سلام رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہجرت فرما کر مدینہ منورہ تشریف لائے تو میں بھی آپ کی زیارت کے لئے حاضر ہوا۔

”فلما استبنت وجهه عرفت ان وجهه ليس بوجه الكذاب“

ترجمہ: ”پس جب کہ میں نے آپ کا روئے مبارک دیکھا تو پہچان لیا کہ آپ کا چہرہ جھوٹے کا چہرہ نہیں۔“

مولانا رومی قدس سرہ السامی فرماتے ہیں ؎

در دل ہر امتی کز حق مزہ است
روئے و آواز پیمبر معجزہ است

؎ القرآن: ۱۰/۱۶

چوں پیمبر از برون بانگے زند
جان امت در درون سجدہ کند

اور عبداللہ بن رواحہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں ؂

لو لم تکن فیه آیات مبینة
لکان منظره ینبیك بالخبر

ترجمہ: اگر آپ میں بالفرض نبوت و رسالت کی کھلی نشانیاں نہ بھی ہوتیں تب بھی آپ کا چہرہ مبارک ہی نبوت و رسالت کی خبر دے دیتا۔"

❷ ادائے رسالت میں طرح طرح کی مشقتیں برداشت کرنا اور کبھی کبھی مال و جاہ کی طرف ذرہ برابر التفات نہ ہونا اور دشمنوں کی شدید سے شدید تکالیف اور اذیتوں پر فقط صبر ہی نہیں بلکہ دعاء ہدایت فرمانا۔ "اَللّٰهُمَّ اهْدِ قَوْمِيْ فَاِنَّهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ" یہی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے برگزیدہ ہونے کی روشن دلیل ہے۔ خدا کا برگزیدہ بندہ ہی ایسا صبر کرسکتا ہے۔

دعوائے نبوت کے بعد کفار مکہ نے اموال کثیرہ اور حسین سے حسین عورتیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے پیش کیں مگر اس نبی امی فداہ نفسی وابی وامی نے جس کو خدا نے مجسم زہد وعفت بنا کر بھیجا تھا ذرہ برابر اس کی طرف التفات نہ کیا اور دشمنوں پر فتح پا لینے کے بعد بھی پھر اسی طرح دنیا سے بے التفاتی اور توجہ الی اللہ باقی رہی یہ کیا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے نبی برحق اور رسول صادق ہونے کی صریح دلیل نہیں۔

وقال تعالیٰ: ﴿وَجَآءَ مِنْ اَقْصَى الْمَدِيْنَةِ رَجُلٌ يَّسْعٰى قَالَ يٰقَوْمِ اتَّبِعُوا الْمُرْسَلِيْنَ ۝ اتَّبِعُوْا مَنْ لَّا يَسْـَٔلُكُمْ اَجْرًا وَّهُمْ مُّهْتَدُوْنَ ۝﴾[1]

ترجمہ: "ایک شخص شہر سے دوڑتا ہوا آیا اور اپنی قوم سے یہ کہنے لگا کہ

---

[1] القرآن: ۳۶/۲۰،۲۱

اے قوم! خدا کے فرستادوں کا اتباع کرو ایسے لوگوں کی راہ پر چلو جو تم سے کسی قسم کا معاوضہ کے طلب گار نہیں، اور خود راہ راست پر ہیں۔"

۳ آپ کا مستجاب الدعوات ہونا بھی آپ کے نبی برحق ہونے کی صریح دلیل ہے آپ نے جو دعا فرمائی وہ بارگاہ الٰہی میں قبول ہوئی۔

ہجرت کے وقت جب سراقہ بن مالک نے انعام قریش کی طمع میں آپ کا تعاقب کیا اور مسلح گھوڑے پر سوار ہو کر آپ کے قریب پہنچا تو آپ نے بددعاء کی یکا یک گھوڑے کا نصف حصہ زمین میں غائب ہو گیا۔ سراقہ نے کہا کہ میں جانتا ہوں کہ آپ کی بددعاء سے میرا گھوڑا زمین میں دھنسا ہے۔ آپ مجھ کو اس بلا سے رہائی دیجئے میں آپ سے پختہ عہد کرتا ہوں کہ جو آپ کی تلاش میں پھرتا ہوگا اس کو واپس کر دوں گا۔ چنانچہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا فرمائی اسی وقت زمین نے اس کے گھوڑے کو چھوڑ دیا۔ سراقہ مشرف باسلام ہو گئے اور یہ شعر کہے ؎

ابا حکم لو کنت . واللّٰہ شاهدًا

لامر جوادی حین ساخت قوائمه

ترجمہ: "اے ابوجہل خدا کی قسم اگر تو اس وقت موجود ہوتا جس وقت میرے گھوڑے کے پیر زمین میں دھنسے تھے۔"

علمت ولم تشکك بان محمدا

رسول ببرهان فمن ذا یقاومه

ترجمہ: "تو تو یقین کرتا اور ذرہ برابر تجھ کو شک نہ رہتا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے رسول ہیں دلائل اور براہین کے ساتھ کون ان کا مقابلہ کرسکتا ہے۔"

عتبہ بن ابی لہب نے جب آپ کی شان میں گستاخی کی تو آپ نے یہ بددعا فرمائی۔

"اَللّٰهُمَّ سَلِّطْ عَلَيْهِ كَلْبًا مِّنْ كِلَابِكَ"

ترجمہ: "اے اللہ اس پر کوئی کتا یعنی کوئی درندہ اپنے درندوں میں سے مسلط فرما۔"

چنانچہ ابولہب اپنی اولاد اور خدام کے ساتھ ایک بار شام کو تجارت کے لئے روانہ ہوئے جن میں عتبہ بھی تھا جس کے لئے آپ نے بددعا فرمائی تھی۔ ایک منزل میں پہنچ کر یہ معلوم ہوا کہ یہاں شیر رہتا ہے۔ عتبہ کے باپ ابولہب نے کہا۔

"ان ابنی اخاف علیه دعوة محمد فتعاهدوه"

ترجمہ: "میں اپنے اس بیٹے پر محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی بددعا کا خوف کرتا ہوں۔ اس کی خبر گیری کرنا۔"

قافلہ والوں نے سامان جمع کر کے ایک ٹیلہ بنایا اور عتبہ کو اس پر لٹایا۔ رات جب ہوئی شیر آیا اور تمام قافلہ والوں میں تلاش کر کے صرف عتبہ پر حملہ کیا اور اس کا سر چبا گیا۔ شیر جب عتبہ کے قریب پہنچا تو عتبہ یہ کہتا تھا۔

"یا ویل امی هو والله آكل كما دعا محمد علی قتلنی محمد وهو بمكة وانا بالشام فاقبل الاسد يتخطاهم حتى اخذ براس عتبة ففدغه"[1]

ترجمہ: "ہائے میری ماں! خدا کی قسم یہ مجھ کو کھائے گا جیسا کہ محمد نے مجھ پر بددعا کی، محمد نے مجھ کو مار ڈالا حالانکہ وہ مکہ میں ہیں اور میں ملک شام میں ہوں۔ شیر لوگوں کو پھاندتا ہوا اس تک پہنچا۔ یہاں تک کہ عتبہ کا سر چبا ڈالا۔"

شیر کا سب کو چھوڑ کر صرف عتبہ کی طرف متوجہ ہونا اس امر کی صریح دلیل ہے کہ یہ من جانب اللہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اجابت دعا ہے جس کا عتبہ نے بھی

[1] خصائص کبریٰ: جلد ۱ صفحہ ۱۴۷

زبان اور قلب سے اقرار کیا۔

بدنصیب کافروں کا عجب حال تھا آپ کا مستجاب الدعوات ہونا ان کے دلوں پر نقش تھا مگر اپنی شقاوت اور بدبختی سے ایمان نہ لاتے تھے۔

اجابت دعاء کے متعلق جس قدر معجزات ظاہر ہوئے ہیں ان کی تفصیل خصائص کبری جلد۲ صفحہ ۱۶۲ تا ۱۷۱ پر ملاحظہ فرمائیں۔

۴ توریت وانجیل اور تمام صحف سماویہ میں آپ کی بشارتوں کا موجود ہونا اور اسی بنا پر علماء بنی اسرائیل کا ایمان لانا اور آپ کی نبوت کی تصدیق کرنا۔ یہ بھی آپ کی نبوت ورسالت کی عقلی دلیل ہے۔

كما قال تعالىٰ: ﴿اَوَلَمْ يَكُنْ لَّهُمْ اٰيَةً اَنْ يَّعْلَمَهٗ عُلَمٰٓؤُا بَنِيْٓ اِسْرَآئِيْلَ ۝﴾ [1]

ترجمہ: ''کیا ان لوگوں کے لئے آپ کی نبوت کی یہ کھلی دلیل نہیں کہ علماء بنی اسرائیل آپ کو جانتے ہیں کہ یہ وہی نبی ہیں جن کی کتب سابقہ میں خبر دی گئی ہے۔''

وقال تعالىٰ: ﴿اَلَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ يَعْرِفُوْنَهٗ كَمَا يَعْرِفُوْنَ اَبْنَآءَهُمْ ۭ وَاِنَّ فَرِيْقًا مِّنْهُمْ لَيَكْتُمُوْنَ الْحَقَّ وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ ۝﴾ [2]

ترجمہ: ''جن لوگوں کو ہم نے توریت وانجیل دی ہے وہ آپ کو ایسا ہی پہچانتے ہیں جس طرح اپنے بیٹوں کو اور ایک فریق ان میں سے جان بوجھ کر حق کو چھپاتا ہے۔''

وقال تعالىٰ: ﴿اَلَّذِيْنَ يَتَّبِعُوْنَ الرَّسُوْلَ النَّبِيَّ الْاُمِّيَّ الَّذِيْ يَجِدُوْنَهٗ مَكْتُوْبًا عِنْدَهُمْ فِي التَّوْرٰىةِ وَالْاِنْجِيْلِ ﴾ [3]

---

[1] القرآن: ۲۶/۱۹۷ [2] القرآن: ۲/۱۴۶ [3] القرآن: ۷/۱۵۷

ترجمہ: ''جو لوگ ایسے رسول اور نبی امی کا اتباع کرتے ہیں جس کو وہ اپنے پاس توریت اور انجیل میں لکھا ہوا پاتے ہیں۔''

الحاصل علماء یہود و نصاریٰ کا یہ اعتراف کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم وہی نبی ہیں جن کی توریت و انجیل میں بشارت دی گئی ہے یہ آپ کے نبی برحق ہونے کی قطعی دلیل ہے اور اس قسم کے واقعات کتب سیر مثل شرح مواہب اور شفائے قاضی عیاض اور اس کی شرح نسیم الریاض اور طبقات ابن سعد میں بالتفصیل مذکور ہیں اور ہرقل شاہ روم کا واقعہ مشہور ہے اس لئے ہم نے اسی پر اکتفاء کیا۔

۵ آپ کا غیب کی خبریں دینا اور ذرہ برابر اس کے خلاف نہ ہونا یہ بھی آپ کے صادق مصدوق اور مرسل من اللہ ہونے کی صریح دلیل ہے یہی وجہ ہے کہ انبیاء و مرسلین کی کوئی پیشین گوئی کبھی غلط نہیں ہوئی اور کاہنوں اور جھوٹے مدعیان نبوت کی بالفرض اگر ایک بات صحیح نکلتی ہے تو سو غلط ہوتی ہیں۔

اس وقت بطور نمونہ صادق مصدوق محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی چند پیشین گوئیاں بیان کرتے ہیں جس سے آپ کا صادق مصدوق اور مرسل من اللہ ہونا خوب ظاہر ہو جائے اور یہ معلوم ہو جائے کہ اس قسم کے غیبی خبریں سوائے اللہ کے نبی اور رسول کے کوئی نہیں بیان کرسکتا۔

جو خبر بھی آپ نے دی ''کالشمس فی نصف النہار'' ہو کر ظاہر ہوئی سر مو بھی کوئی فرق نہ نکلا۔

۱ غلبہ روم کی پیشین گوئی فرمانا جس کا سورہ روم میں تذکرہ ہے پھر کفار مکہ کی تکذیب اور صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی تصدیق کرنا اور اس پر سو سو اونٹ کی شرط کرنا اور پھر اس پیشین گوئی کے سچ ظاہر ہونے پر صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا کفار مکہ سے سو اونٹ وصول کرنا کتب سیر میں مسطور اور لوگوں میں معروف و مشہور ہے۔

۲ قیام مکہ کے زمانہ میں جب آپ کا ظاہرا اسباب میں کوئی یار و مددگار نہ تھا ہر شخص

خون کا پیاسا تھا گھر سے باہر نکلنا بھی دشوار تھا اس وقت اپنی فتح ونصرت اور کفار کی شکست اور ہزیمت کی خبر دینا اگر وعدہ الٰہی اور تائید غیبی کے سہارے اور بھروسہ پر نہ تھا تو منکرین ومکذبین بتلائیں کہ کس بھروسہ پر علی الاعلان بانگ دہل یہ پیشین گوئی "سَيُهْزَمُ الْجَمْعُ وَيُوَلُّونَ الدُّبُرَ"[۱] ترجمہ: "اب شکست کھائے گا یہ مجمع اور بھاگیں پیٹھ پھیر کر" کی جارہی تھی جس کی تصدیق کفار کو بدر کے میدان میں ہوگئی چنانچہ حق جل شانہ ارشاد فرماتے ہیں:

﴿قُلْ لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْا سَتُغْلَبُوْنَ وَتُحْشَرُوْنَ اِلٰى جَهَنَّمَ ۚ وَبِئْسَ الْمِهَادُ ۝ قَدْ كَانَ لَكُمْ اٰيَةٌ فِيْ فِئَتَيْنِ الْتَقَتَا ۚ فِئَةٌ تُقَاتِلُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَاُخْرٰى كَافِرَةٌ يَّرَوْنَهُمْ مِّثْلَيْهِمْ رَاْيَ الْعَيْنِ ۚ وَاللّٰهُ يُؤَيِّدُ بِنَصْرِهٖ مَنْ يَّشَآءُ ۚ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَعِبْرَةً لِّاُولِي الْاَبْصَارِ ۝﴾[۲]

ترجمہ: "آپ کافروں سے کہہ دیجئے کہ تم عنقریب ضرور مغلوب ہوگے اور جہنم کی طرف تمہارا حشر ہوگا اور جہنم برا ٹھکانہ ہے۔ تمہارے لئے ان دو جماعتوں میں ایک روشن نشانی ہے جو (بدر) کے میدان میں سے ایک دوسرے سے مقابل ہوئی ایک گروہ یعنی مسلمانوں کا گروہ تو اللہ کی راہ میں لڑتا تھا اور دوسرا گروہ کافروں کا تھا (جس کا خدا تو کیا متعین ہوتا اس کی تو غرض بھی متعین نہ تھی) وہ کافر مسلمانوں کو اپنے سے دگنا دیکھ رہے تھے (جس طرح خدا بھینگے کو ایک کے دو دکھلاتا ہے) اور اللہ تعالیٰ اپنی مدد سے جس کو چاہتا ہے قوت دیتا ہے اس واقعہ میں آنکھ والوں کے لئے بڑی عبرت ونصیحت ہے۔"

"واخرج مسلم وابوداؤد والبیهقی عن انس ان النبی

---

[۱] القرآن ۴۵/۵۴ [۲] القرآن: ۱۲/۳، ۱۳

صلى الله عليه وسلم قال ليلة بدر هذا مصرع فلان ان شاء الله تعالى غدًا و وضع يده على الارض وهذا مصرع فلان ان شاء الله تعالى غدًا ووضع يده على الارض فوالذى بعثه بالحق ما اخطأوا تلك الحدود جعلوا يصرعون عليها“ [۱]

ترجمہ: ”مسلم اور ابوداؤد اور بیہقی میں انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے شب بدر میں اس میدان کا چکر لگایا اور زمین پر نشان لگا لگا کر اور ہاتھ رکھ کر بتلاتے جاتے تھے کہ ”هذا مصرع فلان غدًا ان شاء الله تعالى“ یعنی یہ جگہ کل کو فلانے کے قتل کی ہے انشاء اللہ تعالیٰ۔ پس قسم ہے اس ذات پاک کی جس نے آپ کو حق دے کر بھیجا یہ مقتولین اپنے حدود قتل سے ذرہ برابر متجاوز نہ تھے جس جگہ آپ نے نشان لگا دیا اسی جگہ پچھڑے ہوئے تھے۔“

۳ اللہ تعالیٰ نے آپ سے آپ کے مؤمنین صالحین کے لئے استخلاف فی الارض و تمکین دین کا وعدہ فرمایا۔ دنیا نے دیکھ لیا کہ وہ وعدہ الٰہی کس طرح پورا ہوا دنیا کی تاریخیں اس کی شاہد ہیں۔

۴ شام اور بیت المقدس اور مصر اور فارس اور روم وغیرہ وغیرہ کی فتح کی پیشین گوئی فرمائی چند سال گزرنے نہ پائے کہ یہ تمام ممالک آپ کے غلاموں کے زیر نگیں آگئے۔

۵ اللہ نے آپ سے یہ وعدہ فرمایا کہ اگر جن اور انس سب مل کر بھی یہ چاہیں کہ قرآن کے مثل ایک سورت بنا لائیں تو ہرگز نہ بنا سکیں گے۔

كما قال تعالىٰ: ﴿قُلْ لَّئِنِ اجْتَمَعَتِ الْاِنْسُ وَالْجِنُّ عَلٰٓى اَنْ يَّاْتُوْا بِمِثْلِ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لَا يَاْتُوْنَ بِمِثْلِهٖ وَلَوْ كَانَ

[۱] خصائص کبریٰ: جلد ۱ صفحہ ۱۹۹

بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ ظَهِيْرًا ﴿﴾ [۱]

ترجمہ: ''آپ کہہ دیجئے کہ اگر تمام انسان اور جنات متفق ہو کر یہ کوشش کریں کہ اس قرآن کے مثل اور کوئی دوسری کتاب لے آئیں تو نہ لا سکیں گے اگر چہ ایک دوسرے کے اس معاملہ میں کیسے ہی مددگار بنیں۔''

ساڑھے تیرہ سو برس گزر گئے مگر کوئی متنفس قرآن کریم کے مثل ایک سطر بھی لکھ کر پیش نہ کر سکا اور نہ تا قیامت پیش کر سکے گا ؎

صد ہزاراں نیزۂ فرعون را
در شکست از موسیٰ با یک عصا
صد ہزاراں طب جالینوس بود
پیش عیسیٰ و دمش افسوس بود
صد ہزاراں دفتر اشعار بود
پیش حرف امیش آں عار بود

❻ اللہ جل جلالہ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے قرآن کریم کی حفاظت کا وعدہ فرمایا۔

﴿اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ ﴿﴾ ﴾ [۲]

ترجمہ: ''ہم نے قرآن کریم کو نازل کیا اور ہم اس کے محافظ ہیں۔''

صدیاں گزر گئیں مگر اس کے ایک نقطہ اور ایک شوشہ میں بھی فرق نہیں آیا۔ خدا نے اپنے کلام کو حفاظ کے سینوں میں ایسا محفوظ فرما دیا کہ وہاں نہ کسی چور کی رسائی ہے۔ نہ کوئی باد و باراں اس کو نقصان پہنچا سکتا ہے ؎

مصطفیٰ را وعدہ کرد الطاف حق
گر بمیری تو نمیرد ایں سبق

---

۱ القرآن: ۸۸/۱۷ ۲ القرآن: ۹/۱۵

من کتاب ومعجزت را حافظم
بیش و کم کن راز قرآن را فعم
من ترا اندر دو عالم را فعم
طاغیان را از حدیثت دا فعم
کس نیارد بیش وکم کردون درو
تو بہ از من حافظے دیگر مجو
رونقت را روز روز افزوں کنم
نام تو برزرو برو نقسر زنم
منبر و محراب سازم بہر تو
در محبت قہر من شد قہر تو
چاکر انت شہرہا گیرند وجا
دین تو گیر دز ماہی تا بماہ
تا قیامت باقیش داریم ما
تو مترس از نسخ دین اے مصطفٰے
اے رسول ماتو جادو نیستی
صادقی ہم خرقہ موسیستی
ہست قرآن مرترا ہمچوں عصا
کفر ہا در کشد چوں اژدہا

اور چونکہ اس شان کی حفاظت قرآن کریم ہی کا خاصہ ہے اس لئے ''انا لہ لحافظون'' میں لہ کو اپنے عامل پر مقدم فرمایا تا کہ یہ تقدیم اسی تخصیص کی طرف مشیر ہو۔

یہ جو کچھ ذکر کیا گیا بطور اشارہ تھا اگر اخبار بالغیب کے متعلق تفصیلی طور پر

معجزات کا مطالعہ مطلوب ہو تو خصائص کبری للحافظ السیوطی جلد۲ صفحہ ۹۹ تا جلد۲ صفحہ ۱۶۰ اور الجواب الصحیح لمن بدل دین المسیح للحافظ ابن تیمیہ جلد۴ صفحہ ۱۲۶ تا جلد۴ صفحہ ۱۵۷ اور شرح مواہب کا مطالعہ کریں۔

معجزات حسیہ

جیسے کفار مکہ کی درخواست پر آپ کی انگلی سے چاند کے دو ٹکڑے ہو جانا، آپ کے بلانے سے درختوں کا حاضر ہو جانا، شجر اور حجر کا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو سلام کرنا، انگشتان مبارک سے پانی کا جاری ہو جانا اور تمام لشکر کا اس سے سیراب ہو جانا وغیرہ وغیرہ جن کی تفصیل کتب سیر میں مذکور ہے مثلاً الجواب الصحیح للحافظ ابن تیمیہ جلد۴ صفحہ ۱۳۰ تا ختم کتاب جلد۴ صفحہ ۳۰۰ اور خصائص کبری اور شرح مواہب اور شفائے قاضی عیاض اور اس کی شرح نسیم الریاض۔

سرور عالم محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے افضل الانبیاء ہونے کا ثبوت

اہل اسلام کا یہ مسلم عقیدہ ہے کہ نبی اکرم محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تمام انبیاء و مرسلین سے افضل و بہتر ہیں۔ اس لئے آپ کی کتاب یعنی قرآن کریم ان تمام کتابوں اور صحیفوں سے افضل ہے کہ جو انبیاء سابقین پر اتاری گئیں اور علی ہذا آپ کا دین اور آپ کی شریعت غرا تمام شرائع اور ادیان سے اکمل اور آپ کے معجزات اور دلائل نبوت اور آیات رسالت تمام انبیاء مرسلین کے معجزات سے اکثر اور بیشتر اور خود آپ کی ذات ستودہ صفات تمام اولین و آخرین سے زائد اتقی اور اعلم اور مکارم اخلاق اور محاسن شیم میں سب سے زائد اکمل اور اتم اور فقر اور درویشی میں بے نظیر اور زہد و ورع میں بے مثل اور یکتائے عالم ہے۔

تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ آپ کی کتاب یعنی قرآن کریم کا تمام کتب الٰہیہ اور صحف سماویہ سے افضل اور بہتر ہونا بالکل ظاہر اور باہر ہے۔ قرآن کریم نے جس طرح شرح وبسط سے علم ذات وصفات اور علم شرائع اور احکام اور علم اخلاق اور علوم برزخ اور علوم آخرت اور علوم مبدء و معاد اور علوم معاشرت اور علوم تجارت کو بیان کیا ہے کوئی کتاب اس کی نظیر نہیں پیش کر سکتی۔ اور اگر کسی کو اس میں شک ہے تو ایسی کتاب لا دکھائے کہ جو علوم کو حاوی اور جامع ہو اور درماندہ ہو۔ اور نہ قرآن کی طرح کوئی کتاب محفوظ ہے کہ جس میں آج تک ایک نقطہ اور ایک شوشہ کا بھی کوئی تغیر اور تبدل نہ ہوا ہو اور نہ قرآن کریم کی طرح دنیا میں کوئی ایسی کتاب ہے کہ چار دانگ عالم میں جس کے ہزاروں اور لاکھوں حافظ موجود ہوں۔ یہودی اور عیسائی اور ہندو ساری دنیا میں سے توریت اور انجیل اور وید کا کہیں ایک کچا پکا حافظ دکھلا دیں تو جانیں۔

حضرت مولانا انور شاہ قدس اللہ سرہ فرماتے ہیں ؎

خاص کردش حق با عجاز کتاب مستطاب
حجت و فرقان معجز و محکم و فصل خطاب
نجم نجمش در براعت ہست بر ترز آفتاب
حرف حرف او شفا ہست و ہدیٰ بہر رشید

اور آپ کی شریعت غراء اور آپ کا دین ایسا کامل اور مکمل کہ اس کے اسرار اور حکم اور حقائق کی حد نہیں جب اس کے کسی حکم میں غور کیا جاتا ہے تو وہ بے شمار فوائد اور منافع اور اسرار وحکم پر مبنی نظر آتا ہے علماء اسلام نے جہاں اور نئی نئی قسم کے علوم ایجاد فرمائے وہاں اسرار شریعت کا بھی ایک علم ایجاد فرمایا اس علم میں علماء اسلام نے شریعت محمدیہ کے ہر حکم کا عقل سلیم اور فہم مستقیم کے مطابق ہونا اور ہر مسئلہ کا بے شمار اسرار وحکم پر مبنی ہونا ثابت کیا جس شخص کو اس کی تحقیق اور تصدیق مقصود ہو وہ فتوحات مکیہ اور احیاء العلوم اور حجۃ اللہ البالغہ اور حافظ ابن تیمیہ اور حافظ ابن قیم قدس اللہ اسرار ہم کی

تصانیف کا مطالعہ کرے۔

یہ علم حق جل شانہ کی طرف سے صرف امت محمدیہ کو عطا ہوا کسی امت میں اس علم کا نام ونشان ہی نظر نہیں آتا فقط یہ ہی نہیں کہ قلیل وکثیر کا فرق ہو کہ اورامتوں میں یہ علم قلیل ہو اور امت محمدیہ میں کثیر بلکہ دوسری امتیں اس علم کے نام ہی سے آشنا نہیں۔

مختصر یہ کہ شریعت محمدیہ نے کوئی خیر ایسی نہیں چھوڑی کہ جس کا حکم نہ دیا ہو اور کوئی شر اور امر قبیح اور کوئی فحشاء اور منکر ایسا نہیں چھوڑا کہ جس کی ممانعت نہ کی ہو۔ شریعت محمدیہ نے حق جل شانہ کے بارہ میں ایسے صحیح صحیح اور ٹھیک ٹھیک عقائد کی تعلیم دی کہ بارگاہ ذوالجلال والاکرام کے شان کے شایان شان اور ان تمام نقائص سے تزکیہ وتقدیس کا حکم دیا کہ جو شان الوہیت کے منافی اور مباین ہوں۔ اور علی ہذا انبیاء و مرسلین صلوات اللہ وسلامہ علیہم اجمعین کے آداب اور ان کے عصمت مآب اور قدسی صفات اور ملکی سمات کے اعتقاد رکھنے کی تلقین فرمائی اور ان تمام رذائل ونقائص سے کہ جو منصب نبوت ورسالت کے مناسب نہ ہوں۔ انبیاء کرام کی تقدیس وتنزیہ کو خوب واضح اور روشن کر کے بتلایا اور بارگاہ خداوندی میں خشوع وخضوع، رکوع وسجود اور سوال مغفرت ورحمت اور توبہ اور انابت کے وہ طریقے بتلائے کہ جن کا نہ کسی آسمانی کتاب میں پتہ ہے اور نہ زمینی کتاب میں۔

شریعت محمدیہ نے مکارم اخلاق کی ایسی تکمیل اور تتمیم کی کہ کوئی ظاہری اور باطنی خلق حسن اور خصلت محمودہ ایسی نہ چھوڑی کہ جس کی تاکیداً کید نہ کی ہو۔ جیسے حلم اور صبر ورضا وتسلیم زہد وقناعت اخلاص اور توکل حب الٰہی اور اشتیاق لقاء خداوندی ذکر اور شکر، فقراء اور مساکین کے ساتھ احسان اور مواساۃ ارباب دنیا سے احتراز اور اجتناب، اکابر کی توقیر وتکریم اور اصاغر پر شفقت اور ترحم اور علی ہذا اخلاق ذمیمہ میں سے کوئی ظاہری اور باطنی خلق رذیل ایسا نہ چھوڑا کہ جس کے ترک کی تاکید اور اس کے

ارتکاب پر تہدید اور وعید شدید نہ کی ہو۔ جیسے کبر اور حسد اور حب مال اور حب جاہ، تباغض اور تحاسد کذب اور غیبت، چغل خوری، اور تمسخر، اعجاب اور خود پسندی دوسروں کی تحقیر و تذلیل، لوگوں کے عیوب کا تفحص اور تجسس وغیرہ وغیرہ۔ قرآن اور حدیث نے جس شدت سے ان اخلاق ذمیمہ سے بچنے کے تاکید کی اور جس تفصیل سے ان باطنی امراض کا علاج بتلایا ہے کوئی شریعت اور کوئی ملت اس کی نظیر تو کیا عشر عشیر بھی نہیں پیش کر سکتی اور علی ہذا شریعت محمدیہ نے معاشرت یعنی نکاح وطلاق، خلع اور لعان اور حقوق زوجین اور معاملات اور معاہدات کے وہ قواعد اور احکام جزئیہ بتلائے کہ جن سے آج دنیا کے ازکیاء اور حکماء اور ماہرین سیاست اور ارباب دول مستفید ہو رہے ہیں اگر ان کے پاس اس سے بہتر کوئی شریعت موجود تھی تو اس سے استفادہ کرتے۔ شریعت محمدیہ سے استفادہ اور شریعت اسلامیہ کے دستر خوان سے خوشہ چینی کی کیا ضرورت تھی۔

انصاف تو یہ ہے کہ اگر ہزار سال کی تعلیم کے بعد بھی کوئی شخص ایسی شریعت پیش کرے تو وہ اس کے نبی مرسل اور تمام عالم میں اس کے افضل اور اکمل ہونے کی روشن دلیل سمجھی جائے چہ جائیکہ ایک شخص کہ جس نے نہ کبھی پڑھا اور نہ لکھا اور نہ کبھی علماء کی صحبت اس کو نصیب ہوئی اور ایسی کامل اور مکمل شریعت پیش کرے جس کے سامنے تمام ازکیائے عالم دنگ اور حیران ہوں۔ بالبداہت اس کے رسول اعظم اور سرور عالم ہونے کی آفتاب سے زائد روشن دلیل ہے۔

اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا تمام اولین وآخرین سے زائد اعلم ہونا تو آپ کی شریعت کاملہ اور جامعہ اور احادیث طیبہ اور جوامع کلم اور احادیث قدسیہ سے واضح ہے۔ نیز تمام عقلاً شاگردوں کے احوال سے استاد کے علم اور فضل وکمال کا پتہ چلا لیتے ہیں شاگردوں سے جس قسم کا کمال ظاہر ہوتے دیکھتے ہیں اس سے استاذ اور معلم کے کمال کا سراغ لگا لیتے ہیں۔

اسی طرح محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک ایسی جاہل قوم کو کہ جو ہر قسم کی جہالت اور گمراہی میں گھری ہوئی تھی تعلیم دے کر ان کے ظلم اور تعدی کو عدل اور انصاف سے اور ان کے خشونت اور درشت مزاجی کو حلم اور بردباری سے اور ان کی جہالت کو علم اور معرفت سے اور ان کے باہمی بغض اور عداوت کو محبت اور الفت سے اور ان کی شقاوت اور ضلالت کو سعادت و ہدایت سے اور ان کے عصیان کو اطاعت سے اور تفرق اور تشتت کو اجتماع سے، ضعف کو قوت سے خیانت کو امانت سے اور فحش اور بے حیائی کو غیرت اور عفت اور احسان سے، رذائل کو شمائل سے بدل دینا اور علوم الٰہیات اور علوم نبوات اور علوم معاش و معاد اور علوم اخلاق اور علوم عبادت اور علوم معاشرت اور علوم معاملات اور علوم سیاست ملکیہ اور مدنیہ میں رشک افلاطون اور استاذ حکماء عالم بنا دینا کیا یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے کمال علم و معرفت کی روشن اور کھلی دلیل نہیں۔

اعتبار نہ ہو تو علماء اسلام کی تصانیف کا تمام دنیا کے علماء مذہب کی تصانیف سے مقابلہ اور موازنہ کر لیں اور خوب کر لیں وہ حقائق اور دقائق جو علماء اسلام کی تصانیف میں دریا کی طرح بہہ رہے ہیں ان کا ایک قطرہ بھی دیگر علماء مذہب کی تصانیف میں تا قیام قیامت انشاء اللہ العزیز ہرگز ہرگز نہ مل سکے گا۔

امت محمدیہ میں اس قسم کے علوم و معارف، اسرار و لطائف، انوار و برکات، خوارق و کرامات کا موجود رہنا یہ اس امر کی بین اور روشن دلیل ہے کہ ہنوز آپ کی نبوت باقی ہے اور آپ کی شریعت ابدی اور دائمی ہے۔ اس لئے کہ یہ سب کچھ آپ ہی کی نبوت کی تصدیق کی برکت اور آپ ہی کی شریعت کے اتباع کا ثمرہ ہے۔ اگر شریعت موسویہ وعیسویہ ابدی ہے تو پھر بتلائیں کہ یہود و نصاریٰ کیوں ان علوم و معارف اور انوار و کرامات سے یکسر محروم اور تہی دست ہیں اس سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ آپ کی شریعت تحریف و تبدیل سے بالکل پاک ہے اس لئے کہ تبدیل شدہ شریعت کا اتباع

موجب خیر و برکت نہیں ہوسکتا بلکہ وہ موجب لعنت و نقمت ہے۔

پس جب نبی کی امت کے علوم و معارف کا یہ حال ہے تو اندازہ کرلو کہ خود اس نبی کے علوم و معارف کا کیا حال ہوگا۔ امت تو اپنے نبی کے اجمالی علوم کی شرح اور تفصیل ہے ساڑھے تیرہ سو برس گزر گئے کہ امت محمدیہ کے علماء اپنے نبی امی فداہ نفسی وابی وامی کے علوم کی شرح اور اسی کی تفصیل اور اسی کی توضیح و تلویح میں لگے ہوئے ہیں مگر ہنوز شرح ناتمام ہے۔ دنیا کی تمام قومیں اور ساری امتیں مل کر یہ چاہیں کہ اپنے مذہب میں ابوحنیفہ رحمہ اللہ تعالیٰ اور مالک رحمہ اللہ تعالیٰ جیسا فقیہ اور مجتہد اور بخاری رحمہ اللہ تعالیٰ اور مسلم رحمہ اللہ تعالیٰ جیسا حافظ اور حسن بصری رحمہ اللہ تعالیٰ اور معروف کرخی جیسا عابد و زاہد اور ابوالحسن اشعری رحمہ اللہ تعالیٰ اور غزالی رحمہ اللہ تعالیٰ اور رازی جیسا متکلم دکھلا سکیں تو ناممکن اور محال ہے اور اگر ہے تو دکھلائیں اور بتلائیں خدا کی قسم نہیں دکھلا سکتے۔

"وتلك يمين ليست فيها باثم" (یہ وہ قسم ہے جس میں جھوٹا اور گناہ گار نہیں)۔

چنانچہ ایک حدیث میں ہے کہ ابونعیم نے ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جب حق تعالیٰ شانہ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو الواح تورات عطا کیں تو اس میں امت کے اوصاف و احوال کا ذکر پایا تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بارگاہ خداوندی میں یہ عرض کیا:

"يا رب انى اجد فى الالواح يؤتون العلم الاول والعلم الاخر فيقتلون قرون الضلالة والمسيح الدجال فاجعلها امتى قال تلك امة احمد الحديث" [1]

ترجمہ: "اے پروردگار الواح توریت میں ایک امت کا ذکر پاتا ہوں

[1] خصائص کبریٰ: صفحہ ۱۱

جن کو اگلا اور پچھلا علم عطا ہوگا اور اس امت کے لوگ ارباب ضلالت اور مسیح دجال کو قتل کریں گے اس جماعت کو میری امت بنا دے فرمایا کہ یہ امت تو محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور احمد مجتبیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہے۔"

شیخ جلال الدین سیوطی رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی امت ہے کہ جس کو اللہ نے اولین اور آخرین کا علم عطا فرمایا اور علم و معرفت کے خزائن اس پر کھول دیئے اور علم النساء اور علم انساب اور علم اعراب اور علم تصنیف کتاب اس کو عطا فرمایا اور اس امت کے علماء کو مثل انبیاء بنی اسرائیل کے بنایا۔ ابن حزم رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ثقہ کا ثقہ سے نقل کرنا اور اسی طرح سند متصل اور طریق مسلسل کے ساتھ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچا دینا اس نعمت عظمیٰ کے ساتھ حق تعالیٰ شانہ نے صرف مسلمانوں ہی کو سرفراز فرمایا ہے۔

دنیا میں آج کوئی شخص اپنے پیشوا اپنے مقتدا کا ایک کلمہ بھی "حدثنا فلان عن فلان" یعنی سند کے ساتھ نہیں پیش کرتا۔ اقوام عالم اپنے پیغمبر یا مقتدا کے اقوال وافعال کی اسانید تو کہاں پیش کرسکتی ہیں ان کے پاس تو اس کتاب کی بھی کوئی سند نہیں جس کو وہ صحیفہ آسمانی سمجھتے ہیں۔ قاضی ابوبکر ابن العربی رحمہ اللہ تعالیٰ شرح ترمذی میں فرماتے ہیں کہ تصنیف و تحقیق تفریع و تدقیق میں کوئی امت امت محمدیہ کے قریب بھی نہیں پہنچ سکی اور آپ کے تقویٰ اور خشیۃ الٰہی کا مفصل حال معلوم کرنا ہو تو کتب سیر کا مطالعہ کریں اس وقت صرف ایک حدیث پر اکتفا کرتے ہیں جس سے ناظرین آپ کے تقویٰ اور خشیت کا کچھ اندازہ کرسکیں۔ وھو ھذا۔

"عن مطرف عن ابیه قال رایت رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم یصلی وفی صدره ازیز کازیز الرحی من البکاء رواه ابوداؤد والنسائی، ولفظه رایت رسول اللّٰه یصلی ولجوفه ازیز کازیز المرجل یعنی یبکی"

ترجمہ: ''مطرف اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کونماز پڑھتے دیکھا کہ گریہ وبکا کی وجہ سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے سینہ مبارک میں سے ایک چکی کی سی آواز آتی تھی اور ایک روایت میں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اندر ایک ایسی آواز ہوتی تھی جیسے ہانڈی کو جوش اور ابال آرہا ہو۔''

اور مکارم اخلاق اور محاسن شیم کا یہ عالم تھا کہ عرب کے گردن کش اور جفاکش آپ کے ایسے مسخر اور گرویدہ بنے کہ جہاں آپ کا پسینہ گرتا تھا وہاں اپنا خون گرانے کو تیار تھے یہ بھی نہیں کہ ایک دوروز کا جوش اور ولولہ تھا کہ ختم ہوا ساری عمر اسی طرح گزار دی آپ کی محبت میں زن اور فرزند، خویش اور اقارب، مال و دولت، گھر اور وطن سب ہی چھوڑا اور ایک کے عشق میں ساری دنیا کی جنگ مول لی۔ اپنوں کو بے گانہ بنایا۔ پھر آپ کے مقابلہ میں جو شخص بھی آیا بے دریغ اس پر تلوار چلائی اس کا لحاظ نہ کیا کہ یہ میرا باپ ہے یا میرا بیٹا۔ یہ تسخیر اخلاق نہ تھی اور کیا تھی ابتداء فرینش عالم سے اب تک کوئی امت ایسی دیکھنے اور سننے میں نہیں آئی کہ جس نے اپنے نبی اور رسول کے ساتھ اس درجہ جاں نثاری کی ہو۔ واللہ یہ عشق بھی معجزہ ہے ایسا عشق نہ کہیں سنا اور نہ دیکھا۔ پھر لطف یہ کہ آپ کے عشق میں تو ایسے دیوانے اور دنیا اور آخرت کے معاملہ میں ایسے چست اور چالاک اور عاقل اور ہوشیار کہ دنیا آج ان کے کارناموں کو دیکھ کر حیران ہے۔ یہ محض تسخیر اخلاق تھی نہ کسی تلوار کا زور تھا نہ کسی مال و دولت کا، کوئی شخص اگر روئے زمین کے خزائن بھی لٹادے تو اس تسخیر کا عشر عشیر بھی اس کو حاصل ہونا ناممکن اور محال ہے۔

اور زہد اور قناعت کا یہ حال تھا کہ دو دو مہینے کبھی گھر میں تو انہ چڑھتا تھا صرف پانی اور کھجور پر گزر تھا۔ جو آتا تھا وہ اسی وقت لٹا دیا جاتا تھا اپنے خادموں اور غلاموں کو تو خزائن قیصر و کسریٰ کی کنجیاں دے گئے مگر اپنے نفس قدسی صفات اور ملکی سمات کے

لئے یہ ناجائز سمجھتے تھے کہ کوئی درہم و دینار آپ کے کاشانۂ مبارک میں ایک شب ہی گزار لے تفصیل کی گنجائش نہیں۔ کتب حدیث کو دیکھئے۔

اور علیٰ ہذا معجزات اور دلائل نبوت میں بھی آپ تمام انبیاء و مرسلین سے بڑھ کر ہیں۔ آپ کے معجزے دس بیس نہیں کہ جو شمار میں آسکیں۔ ہزاروں ہیں جن کی تفصیل کتب حدیث اور سیر سے معلوم ہوسکتی ہے اور جس طرح آپ کے معجزات کمیت اور مقدار عدد اور شمار کے اعتبار سے زائد ہیں اسی طرح کیفیت اور حقیقت کے لحاظ سے بھی آپ کے معجزات انبیاء سابقین کے معجزات سے بڑھے ہوئے ہیں مثلاً حضرت آدم علیہ السلام کو حق تعالیٰ شانہ نے تمام چیزوں کے نام بتلائے۔ کما قال تعالیٰ: ﴿وَعَلَّمَ آدَمَ الْأَسْمَآءَ كُلَّهَا﴾ تو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو جوامع کلم اور مجامع حکم عطا فرمائے۔ جوامع کلم کے یہ معنی کہ ایسے جامع کلمات کہ جو باوجود نہایت ایجاز اور غایت اختصار کے بے شمار معانی اور اسرار اور معارف اور حقائق کی طرف رہنمائی کرتے ہوں آپ کا ایک مختصر کلمہ "اِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالنِّيَّاتِ" (اعمال نیت کے تابع ہیں)۔

ایسا جامع کلمہ ہے کہ جس سے فقہاء نے صدہا مسائل مستنبط کئے ہیں تجربہ اور تحقیق اگر مقصود ہے تو علامہ ابن نجیم کی الاشباہ والنظائر کا مطالعہ کریں کتاب کے قواعد اور اصول کو انما الاعمال بالنیات ہی سے شروع فرمایا اور صدہا مسائل اس ایک کلمہ جامع سے مستنبط کئے ہیں۔

ابن منیر رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ حق تعالیٰ نے ملائکہ سے حضرت آدم علیہ السلام کو سجدہ تعظیم و تحیت کرالیا۔ تو ملائکہ کو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی امت کے زیر لوا عسکر و لشکر بنا کر بارہا بدر اور حنین کی طرح امداد اور اعانت کے لئے اتارا۔ اور آپ کی امت کے ساتھ مل کر فرشتوں نے جہاد و قتال کا کام انجام دیا۔

اور احادیث صحیحہ سے یہ ثابت ہے کہ ملائکۃ اللہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی امت

کے آحاد وافراد کی اقتداء میں نمازیں ادا کرتے ہیں اور بالخصوص صبح کی نماز میں قرآن سننے کے لئے حاضر ہوتے ہیں۔

کما قال تعالیٰ: ﴿اِنَّ قُرْاٰنَ الْفَجْرِ كَانَ مَشْهُوْدًا﴾[1]

ترجمہ: ”بے شک قرآن پڑھنا فجر کا ہوتا ہے روبرو۔“

حافظ ابن صلاح رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ملائکہ اللہ تسبیح وتحمید اور تنزیہ و تقدیس تو کرتے ہیں مگر قرآن کریم کی تلاوت سے محروم ہیں۔ تلاوت قرآن کی نعمت عظمی سے حق تعالیٰ نے صرف اس امت کو سرفراز فرمایا ہے اس لئے ملائکہ کرام بہزار اشتیاق قرآن سننے کے لئے صبح کی نماز میں بالخصوص حاضر ہوتے ہیں۔ نیز حق تعالیٰ نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک خاص شرف عطا فرمایا ہے وہ یہ ہے کہ:

کما قال تعالیٰ: ﴿اِنَّ اللّٰهَ وَمَلٰٓئِكَتَهٗ يُصَلُّوْنَ عَلَى النَّبِيِّ﴾[2]

ترجمہ: ”اللہ اور اُس کے فرشتے رحمت بھیجتے ہیں رسول پر۔“

اور فرشتوں کے درود وسلام سے جو تشریف وتکریم آپ کو عطا ہوئی وہ حضرت آدم علیہ السلام کے سجدہ تحیت کی تشریف وتکریم سے بہت زائد واعلیٰ اور ارفع ہے اس لئے کہ اول تو اس تشریف وتکریم میں ملائکہ کے ساتھ حضرت حق جل مجدہ نہ تھے اور بھلا اس کبیر متعال اور ذوالعز والجلال سے سجود میں شرکت کیسے ممکن ہے وہی تمام خلائق کا مسجود اور معبود ہے بخلاف اس تشریف وتکریم کے کہ جس کا ”اِنَّ اللّٰهَ وَمَلٰٓئِكَتَهٗ يُصَلُّوْنَ عَلَى النَّبِيِّ“ میں ذکر ہے اس میں ملائکہ کے ساتھ حق تعالیٰ شانہ بھی شریک ہیں۔

دوم یہ کہ سجدۂ تعظیم کی تشریف وتکریم وقتی تھی اور تشریف صلوۃ وسلام دائمی اور مستمر ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے لئے آگ اگر برد وسلام ہوگئی تو آپ کی دعا اور

[1] القرآن: ۷۸/۱۷ [2] القرآن: ۵۶/۳۳

برکت سے بھی بہت سے صحابہ کرام کے حق میں آگ برد وسلام بنا دی گئی چنانچہ ابن سعد نے عمرو بن میمون سے روایت کیا ہے کہ جب مشرکین مکہ نے عمار بن یاسر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو آگ میں جلایا تو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے عمار بن یاسر کے سر پر اپنا دست رکھ کر یہ کلمات پڑھے:

"یانار کونی بردا وسلاما علی عمار کما کنت علی ابراھیم"

ترجمہ: "اے آگ ابراہیم کی طرح تو عمار پر برد وسلام ہو جا۔"[1]

"اسود عنسی سود اللہ وجھہ یوم القیامۃ" (اللہ اس کے چہرہ کو قیامت کے دن سیاہ فرمائے) نے جب نبوت کا دعویٰ کیا اور صنعاء پر غلبہ حاصل کیا تو ذویب بن کلیب صحابی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو پکڑ کر آگ میں ڈال دیا۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے کی برکت سے آگ نے ان پر کوئی اثر نہ کیا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جب اس واقعہ کو صحابہ کے سامنے ذکر فرمایا تو حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی زبان سے بکمال مسرت اس وقت یہ الفاظ نکلے۔ "الحمد للہ الذی جعل فی امتنا مثل ابراھیم الخلیل" (حمد ہے اس ذات پاک کی جس نے ہماری امت میں ابراہیم خلیل اللہ کا ایک نمونہ بنایا)۔

حافظ عسقلانی رحمہ اللہ تعالیٰ اس واقعہ کو اصابہ میں لکھ کر فرماتے ہیں کہ ذویب بن کلیب رضی اللہ تعالیٰ عنہ یہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ہی زمانہ میں مشرف باسلام ہوئے اور اہل یمن میں سب سے پہلے اسلام قبول کرنے والے بھی یہی صحابی ہیں۔

دشمنان حق جل شانہ سے تبری اور بیزاری جس درجہ حق جل شان کی بارگاہ میں محبوب اور مقبول ہے اور کوئی عمل اس قدر محبوب اور پسندیدہ نہیں۔ اور اس سنت کے جاری فرمانے والے شیخ الانبیاء اور امام الحنفاء سیدنا ابراہیم علیہ السلام ہیں۔

[1] زرقانی شرح مواہب: جلد ۵ صفحہ ۱۹۴

کما قال تعالٰی: ﴿قَدْ كَانَتْ لَكُمْ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ فِيْ إِبْرٰهِيْمَ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗ ۚ إِذْ قَالُوْا لِقَوْمِهِمْ إِنَّا بُرَءٰٓؤُا مِنْكُمْ وَمِمَّا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ كَفَرْنَا بِكُمْ وَبَدَا بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةُ وَالْبَغْضَآءُ أَبَدًا حَتّٰى تُؤْمِنُوا بِاللّٰهِ وَحْدَهٗٓ﴾ [1]

ترجمہ: ''تمہارے لئے ابراہیم علیہ السلام اوران کے اصحاب میں ایک بہترین نمونہ ہے کہ جب انہوں نے اپنی قوم سے یہ کہہ دیا کہ تم سے اور جن کی سوائے اللہ کے عبادت کرتے ہو سب سے بری اور بیزار ہیں ہم تمہارے منکر ہیں اور ہم میں اور تم میں ہمیشہ کے لئے بغض اور عداوت ظاہر ہو گیا۔ یہ بغض اور عداوت اس وقت تک رہے گی جب تک تم ایک خدا پر ایمان نہ لاؤ۔''

اس لئے ایسے وقت میں اور ایسی جگہ میں ایمان لانا کہ جہاں کوئی متنفس بھی اللہ کے رسول کا نام لیوا نہ ہو بلکہ سب کے سب دشمن اور خون کے پیاسے ہوں یہ حقیقت میں سنت ابراہیمی کا اتباع ہے اسی طرح تمام یمن میں سے صرف ذویب بن کلیب کے ایمان لانے کا یہ مطلب تھا کہ گویا ذویب بن کلیب بزبان حال یہ کہہ رہے ہیں۔

''اسخطت کل الناس ارضائه''

ترجمہ: ''کہ میں نے ایک خدا کے راضی رکھنے کے لئے سب کو ناراض کردیا۔''

اس لئے عجب نہیں کہ ذویب بن کلیب رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو یہ کرامت حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اس سنت کے اتباع سے نصیب ہوئی ہو۔

ابونعیم نے عباد بن عبدالصمد سے روایت کیا ہے کہ ہم حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ

[1] القرآن: ۶۰/۴

عنہ کی خدمت میں حاضر ہوئے حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے باندی کو حکم دیا کہ دستر خوان لائے جب دستر خوان لے آئی تو فرمایا رومال لے آؤ۔ وہ ایک رومال لے کر آئی فرمایا کہ تنور سلگا لو۔ جب تنور سلگ گیا تو رومال کو تنور میں ڈالنے کا حکم دیا۔ حسب الارشاد رومال تنور میں ڈال دیا گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد جب وہ رومال نکالا گیا تو نہایت شفاف ہو کر نکلا۔ خالص دودھ کی طرح سپید نظر آتا تھا۔ ہم نے بطور تعجب پوچھا یہ کیا ہے؟ تو انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے یہ فرمایا کہ یہ وہ رومال ہے کہ جس سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم منہ پونچھا کرتے تھے جب یہ رومال میلا ہو جاتا ہے تو ہم اسی طرح تنور میں ڈال کر اس کو صاف کر لیتے ہیں اس لئے کہ آگ ان چیزوں کو نہیں کھاتی کہ جو حضرات انبیاء علیہم السلام کے چہرے پر گزر جاتی ہیں۔[1]

خود پیغمبر کو آگ کا نہ جلانا اتنا عجیب نہیں جتنا کہ آگ کا اس رومال کو نہ جلانا کہ جو نبی کے چہرۂ انور پر گزرا ہو۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا عصا اگر سانپ اور اژدہا بن کر زندہ ہو گیا تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے کھجور کی سوکھی ہوئی لکڑی کا ستون زندہ ہو کر آپ کے ہجر اور فراق میں رونے لگا عصائے موسوی نے سانپ بن کر سانپوں ہی کے افعال دکھلائے مگر اس کھجور کے ستون نے اصل حالت پر رہ کر وہ افعال دکھلائے کہ جو ذوی العقول اور ارباب کمال سے ظاہر ہوتے ہیں اس لئے کہ کسی کی محبت میں رونا اور چلانا کمال ادراک اور شعور پر دلالت کرتا ہے۔ پس ایک ستون کا فراق محمدی میں رونا کمالات محمدی کی محبت پر دلالت کرتا ہے جو بجز مرتبہ حق الیقین متصور نہیں۔ اور ظاہر ہے کہ یہ مرتبہ سوائے اصحاب بصیرت اور اہل مکاشفہ اور کس کو میسر آ سکتا ہے۔

اور علیٰ ہذا پتھروں کا آپ کو سلام کرنا اور درختوں کا آپ کی اطاعت کرنا اور آپ کے حکم سے مل جانا اور علیحدہ ہونا۔ اور قضائے حاجت کے وقت آپ پر سایہ کرنا یہ فقط

---

[1] زرقانی: جلد ۵ صفحہ ۱۹۳

حیات ہی پر دلالت نہیں بلکہ شعور اور ادراک بلکہ محبت اور الفت پر بھی دلالت کرتا ہے۔ اور اگر حضرت موسیٰ علیہ السلام کے عصا مارنے سے پتھروں سے پانی نکلتا تھا تو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی انگشتان مبارک سے پانی نکلتا تھا اور ظاہر ہے کہ پتھروں سے پانی نکلنا اتنا عجیب نہیں جتنا کہ گوشت و پوست سے پانی کا رواں اور جاری ہو جانا عجیب ہے جس سے صاف یہی معلوم ہوتا ہے کہ آپ کا دست مبارک ہی منبع فیوض اور سرچشمہ خیرات و برکات تھا۔ کسی نے کیا خوب کہا ہے ؎

وکل معجزة للرسل قد سلفت
وافی باعجب منها عند اظهار

ترجمہ: ”جتنے معجزات حضرات انبیاء سے ظاہر ہوئے آپ نے ان سے بڑھ کر ظاہر فرمائے۔“

فما العصاحيّة تسعى باعجب من
شكوى البعير ولا من مشى احجار

ترجمہ: ”عصا کا سانپ بن کر دوڑنا، اونٹ کی شکایت کرنے اور پتھروں کے چلنے سے زیادہ عجیب نہیں۔“ ؎

ولا انفجار معين الماء من حجر
اشد من سلسل من كفه جار

ترجمہ: ”اور نہ پانی کا پتھر سے رواں ہونا اتنا عجیب ہے جتنا کہ ہتھیلی سے پانی کا چشمہ جاری ہونا عجیب ہے۔“

اور اگر حضرت موسیٰ علیہ السلام کو حق تعالیٰ شانہ نے ید بیضاء کا معجزہ عطا فرمایا تو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی برکت سے متعدد صحابہ کی چھڑی اندھیری رات میں روشن ہوگئی چنانچہ صحیح بخاری وغیرہ میں ہے کہ اسید بن حضیر اور عباد بن بشر ایک مرتبہ شب کو کسی ضرورت سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت بابرکت میں حاضر ہوئے

واپسی میں دیر ہوگئی رات تاریک تھی جب آپ کے پاس سے اٹھ کر جانے لگے تو ہر ایک کے پاس ایک عصا تھا۔ ان میں سے ایک کا عصا روشن ہوگیا اور ہر دو حضرات ایک ہی عصا کی روشنی میں چلتے رہے جب ہر ایک کا راستہ جدا ہونے لگا تو پھر ہر ایک کا عصا علیحدہ روشن ہوگیا اور دونوں اپنے اپنے عصا کی روشنی میں گھر پہنچ گئے۔

خیال فرمایئے کہ موسیٰ علیہ السلام کا دست مبارک اگر جیب میں ڈالنے سے منور اور روشن ہو جاتا تھا تو اول تو وہ نبی مرسل تھے۔ دوم یہ کہ ان کے قلب منور کے قرب جوار کا بھی اثر تھا جس طرح ارواح کے قرب سے اجسام میں حیات آ جاتی ہے۔ اسی طرح اگر قلب منور کے قرب سے دست موسوی میں نور آ جائے تو کیا کچھ بعید اور دور ہے اور یہاں تو یہ دونوں صاحب نہ تو نبی تھے اور نہ ان کی لکڑی کو قلب سے قرب و جوار تھا فقط صحبت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کی برکت تھی۔

سنن ابوداؤد وغیرہ میں ایک حدیث ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جو لوگ تاریکی میں چل کر مسجد میں حاضر ہوتے ہیں ان کے لئے ایک مکمل نور کی بشارت ہے جو قیامت کے دن ان کو عطا ہوگا یہ وہی نور ہے جس کے متعلق قرآن عزیز میں ارشاد ہے:

﴿نُوْرُهُمْ يَسْعٰى بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَبِاَيْمَانِهِمْ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ اَتْمِمْ لَنَا نُوْرَنَا وَاغْفِرْ لَنَا اِنَّكَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ﴾[۱]

ترجمہ: ”ان کا نور ان کے سامنے اور داہنی جانب دوڑتا ہوگا وہ عرض کریں گے کہ اے پروردگار ہمارے لئے ہمارے نور کو پورا فرما دیجئے اور ہم کو بخش دیجئے بے شک آپ ہر چیز پر قادر ہیں۔“

اور حدیث میں جو تاریک شب میں مسجد کی حاضری پر بشارت دی گئی ہے وہ نور تام کے لفظ سے دی گئی ہے جیسا کہ قرآن عزیز میں ”اَتْمِمْ لَنَا نُوْرَنَا“ وارد

---

[۱] القرآن: ۸/۶۶۔

ہوا ہے۔

پس جس طرح قیامت کے دن شدید ضرورت کے وقت اہل ایمان اور ارباب ایقان وعرفان کو ایک نور تام عطا کیا جائے گا۔ اسی طرح اسید بن حضیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور عباد بن بشر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو ظلمت اور تاریکی میں حاضر ہونے کی وجہ سے دنیا ہی میں اس نور تام کا ایک نمونہ عطا کر دیا گیا۔

مسند احمد بن حنبل رحمہ اللہ تعالیٰ اور معجم طبرانی وغیرہ میں ہے کہ قتادۃ ابن النعمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ جو کہ صحابہ بدریین سے ہیں ایک مرتبہ عشاء کی نماز سے فارغ ہو کر جب مکان واپس ہونے لگے تو رات اندھیری تھی اور بارش بھی ہو رہی تھی اور بجلی بھی چمک رہی تھی۔ چلتے وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو چھڑی عطا فرمائی۔ وہ چھڑی روشن ہو گئی۔ اسی کی روشنی میں گھر پہنچ گئے۔ اس عشاء کی نماز میں شب کی تاریکی اور باران اور رعد و برق کی وجہ سے بہت کم لوگ حاضر مسجد ہوئے تھے۔ اس لئے قتادہ بن النعمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حاضری سے آپ کو خاص مسرت ہوئی اور ان کو یہ چھڑی عطا فرمائی۔

ابو نعیم اصفہانی کی دلائل النبوت میں ہے کہ چھڑی عطا فرماتے وقت یہ ارشاد فرمایا کہ اس چھڑی سے دس ہاتھ آگے اور دس ہاتھ پیچھے تک روشنی ہوگی۔ شاید اس دس کی خصوصیت "الحسنة بعشر امثالها"[1] کی بنا پر ہو۔ "واللّٰه سبحانه و تعالٰى اعلم"

امام بخاری رحمہ اللہ تعالیٰ نے اپنی تاریخ میں اور بیہقی اور ابو نعیم نے دلائل النبوت میں حمزہ اسلمی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کیا ہے کہ ہم ایک مرتبہ سفر میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھے۔ رات تاریک تھی شب کی ظلمت اور تاریکی کی وجہ سے ہم لوگ متفرق اور پراگندہ ہو گئے کوئی کسی طرف چلا گیا اور کوئی کسی طرف

[1] ایک نیکی کا دس گنا اجر ملتا ہے

اچانک میرے ہاتھ کی تمام انگلیاں روشن ہو گئیں جس کو دیکھ کر تمام صحابہ پھر جمع ہو گئے اور اگر حضرت موسیٰ علیہ السلام کو انفلاق بحر کا معجزہ عطا کیا گیا تو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو انشقاق قمر کا معجزہ دیا گیا۔ ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ ان دونوں معجزوں میں زمین اور آسمان کا فرق ہے۔ اسی وجہ سے ابن منیر رحمہ اللہ تعالیٰ نے انفلاق بحر کے معجزہ کو آیت الارض (زمین کی نشانی) سے اور انشقاق قمر کے معجزہ کو آیۃ السماء (آسمان کی نشانی) سے تعبیر کیا ہے۔

اور علیٰ ہذا حضرت یوشع علیہ السلام کے لئے آفتاب کا کچھ دیر کے لئے ٹھہر جانا یا کسی نبی کے لئے آفتاب کا غروب کے بعد واپس آجانا اگرچہ عظیم الشان معجزہ ہے مگر انشقاق قمر کا معجزہ اس سے کہیں زیادہ ہے کیونکہ وقوف شمس یا ردشمس کے معجزہ کا حاصل صرف اتنا ہے کہ بجائے حرکت کے سکون عارض ہو گیا یا بجائے روزمرہ کی حرکت کے حرکت معکوس وقوع میں آئی۔ اور ظاہر ہے کہ جسم کے دو ٹکڑے ہو جانا جسم کے خلاف طبیعت ہے اور سکون جسم کے لئے خلاف طبیعت نہیں بلکہ حرکت کے لئے تو سبب درکار ہے سکون کے لئے کسی سبب کی ضرورت نہیں۔ نیز اگر شق قمر کے معجزے کو لوہے یا پتھروں کے نرم ہو جانے سے ملایا جائے جو حضرت داؤد علیہ السلام کا معجزہ تھا تو معلوم ہو جائے گا کہ دونوں میں زمین اور آسمان کا تفاوت ہے اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو حق جل شانہ نے ابراء اکمہ اور ابرص اور احیائے موتیٰ کا معجزہ عطا فرمایا۔ یعنی حضرت مسیح علیہ السلام کے دست مبارک پھیرنے سے باذن الٰہی مادر زاد اندھے اور کوڑھی، بینا اور تندرست اور مردے زندہ ہو جاتے تھے۔ اور ہمارے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو حق جل وعلا نے اس قسم کے بھی معجزے عطاء فرمائے اور اس سے بڑھ کر بھی معجزات عطا کئے۔

غزوہ احد میں حضرت قتادۃ بن النعمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی ایک آنکھ باہر نکل آئی۔ حضرت قتادۃ بن النعمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ آنکھ کو ہاتھ پر لئے ہوئے آنحضرت

صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ آنخضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے آنکھ کو اپنی جگہ پر رکھ کر دعاء پڑھی۔ آنکھ پہلے سے زائد بہتر ہوگئی۔ اس کے بعد جب کبھی کوئی تکلیف پیش آئی دوسری آنکھ میں پیش آئی۔ اس آنکھ میں جس کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے دست مبارک سے رکھا تھا اس میں مدۃ العمر کبھی کوئی تکلیف پیش نہ آئی۔

ان ہی قتادۃ بن النعمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پوتے عاصم بن عمر بن قتادہ ایک مرتبہ عمر بن عبدالعزیز کی خدمت میں حاضر ہوئے تو عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ تعالیٰ نے پوچھا تم کون ہو تو عاصم بن عمر بن قتادہ نے فی البدیہہ یہ شعر پڑھے ؎

ابونا الذی سالت علی الخد عینہ
فردت بکف المصطفی ایمارد

ترجمہ: "ہمارا باپ وہی شخص ہے کہ جس کی آنکھ رخسار پر نکل آئی مگر آنخضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دست مبارک سے پھر اصلی جگہ لوٹا دی گئی۔" ؎

فعادت کما کانت لاول امرھا
فیا حسن ماعین و یا حسن ماخد

اور آنکھ جیسے پہلے تھی ویسی ہی ہوگئی۔ بلکہ اس سے بہتر ہوگئی۔

عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ تعالیٰ یہ سن کر بہت مسرور ہوئے اور عاصم کو بہت کچھ انعام دیا۔[1]

اور یہ معجزہ یعنی آنکھ گر جانے کے بعد آنکھ کو پھر اسی جگہ رکھ کر درست کر دینا مادر زاد اندھے کے اچھا کر دینے سے بدرجہا اعلیٰ اور ارفع ہے اس لئے کہ نابینا کی آنکھیں جگہ پر تو ہیں۔

---

[1] زرقانی: جلد ۵ صفحہ ۱۷۶

ابن ابی شیبہ رحمہ اللہ تعالیٰ، ابن سکن رحمہ اللہ تعالیٰ، بغوی رحمہ اللہ تعالیٰ، بیہقی رحمہ اللہ تعالیٰ، طبرانی رحمہ اللہ تعالیٰ اور ابونعیم رحمہ اللہ تعالیٰ نے روایت کیا ہے کہ فدیک بن عمرو بالکل نابینا ہو گئے تھے کوئی شئے ان کو نظر نہ آتی تھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا لعاب دہن ان کی آنکھوں پر لگایا تو لگاتے ہی بینا ہو گئے۔ اسی (۸۰) سال کی عمر تھی مگر سوئی کے ناکہ میں تاگہ ڈال لیتے تھے۔[۱]

معاذ بن عفراء کی بیوی برص کے مرض میں مبتلا تھیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت بابرکت میں حاضر ہو کر اس مرض کی شکایت کی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا عصاء مبارک ان پر پھیر دیا۔ فوراً ان کا برص جاتا رہا۔ اجنبی عورت ہونے کی وجہ سے دست مبارک نہ پھیرا بلکہ عصا مبارک کو شفاء اور برکت کا آلہ بنایا۔ اور اسی وجہ سے صحیح بخاری میں ام المؤمنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے مروی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ نے بیعت کے وقت کبھی کسی عورت کے ہاتھ کو مس نہیں کیا۔

علاوہ ازیں سنگریزوں کا آپ کے دست مبارک پر تسبیح پڑھنا شجر اور حجر کا سلام کرنا اور جس وقت آپ نے حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور ان کی اولاد کے لئے دعا فرمائی تو گھر کی چوکھٹ اور تمام دیواروں کا تین بار آمین آمین کہنا۔

"اخرجه البيهقي وابونعيم عن ابى سعيد الساعدى مرفوعا"[۲]

ستون حنانہ کا آپ کے فراق میں گریہ وزاری کرنا۔ احیاء موتی اور تکلیم موتی یعنی مردوں کے زندہ ہو کر کلام کرنے سے بدرجہا بڑھا ہوا ہے اس لئے کہ حیات اور عقل و ادراک کا شجر اور حجر میں حلول کر جانا مردہ میں حیات اور جان آ جانے سے بدرجہا

۱ خصائص کبریٰ: جلد۲ صفحہ ۶۹ ۲ کذا فی الخصائص: جلد۲ صفحہ ۷۷

عجیب ہے۔ اس لئے کہ مردہ اگرچہ فی الحال حیات سے عاری اور مجرد ہے مگر ایک وقت میں محل حیات تھا تو سہی بخلاف شجر اور حجر کے کہ اس میں حیات کا نام ونشان ہی نہیں۔

"کذا قاله ابن كثير كما ذكره الزرقانی فی شرح المواهب" [1]

ایک شبہ اور اس کا ازالہ

اگر کوئی شخص یہ سوال کرے کہ نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کے ان معجزات کا کیا ثبوت ہے اور کیسے معلوم ہوا کہ یہ معجزات آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے ظہور میں آئے۔ تو ہم یہ سوال کریں گے کہ یہود و نصاریٰ جو حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے معجزات اور دیگر ارباب مذاہب اپنے اوتاروں کے کرشمے بیان کرتے ہیں ان کا کیا ثبوت ہے اگر وہ توریت و انجیل اور وید کے بھروسہ پر ان معجزات پر ایمان رکھتے ہیں تو اہل اسلام کا قرآن اور حدیث کے بھروسہ پر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے معجزات پر ایمان لانا اور ان کی تصدیق کرنا بدرجہ اولیٰ لازم اور ضروری ہے اس لئے کہ نہ توریت و انجیل کی کسی کے پاس سند موجود ہے اور نہ وید کی۔ صحیح طور پر یہ بھی معلوم نہیں کہ کس زمانہ میں یہ کتابیں لکھی گئیں نہ ان کے راویوں کا حال معلوم۔ قرآن کریم کی سند اور تواتر کا حال تو دریافت کرنے کی ضرورت ہی نہیں، رہی حدیث سو اس کے ہر راوی کا مفصل حال معلوم ہے نام ان کا معلوم، نسب ان کا معلوم، جائے سکونت ان کی معلوم، ان کے اساتذہ اور تلامذہ کا حال معلوم، عدالت اور تقویٰ معلوم، حفظ اور ضبط کا حال معلوم۔ پھر اس پر تماشہ یہ کہ توریت و انجیل تو معتبر ہو جائیں اور قرآن اور حدیث معتبر نہ ہوں۔

---

[1] جلد ۵ صفحہ ۲۰۱

اگر بالفرض قرآن و حدیث قابل وثوق اور قابل اعتبار نہیں تو پھر دنیا کی کوئی کتاب بھی قابل اعتبار نہیں۔ اور اگر نصاری محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے معجزات کا انکار کرتے ہیں تو سن لیں کہ یہود حضرت مسیح علیہ السلام کے معجزات کا انکار کرتے ہیں شیخ الاسلام حافظ ابن تیمیہ حرانی قدس سرہ۔ (الجواب الصحیح جلد ا صفحہ ۱۸۰) میں فرماتے ہیں۔

"وان كذبوا محمدا صلى الله عليه وسلم امتنع مع هذا ان يصدقوا بنبوة محمد غيره فان الطريق الذى يعلم به نبوة موسى و عيسى يعلم به نبوة محمد بالطريق الاولى فاذا قالوا علمت نبوة موسى والمسيح بالمعجزات وعرفت المعجزات بالنقل المتواتر الينا قيل لهم معجزات محمد صلى الله عليه وسلم اعظم وتواترها ابلغ الكتاب الذى جاء به محمد صلى الله عليه وسلم اكمل وامته افضل و شرائع دينه احسن و موسى جاء بالعدل وعيسى جاء بتكميلها بالفضل ومحمد صلى الله عليه وسلم قد جمع فى شريعته بين العدل والفضل فان ساغ لقائل ان يقول هو مع هذا كاذب مفتر كان على هذا التقدير الباطل غيره اولى ان يقال فيه ذلك فيبطل بتكذيبهم محمدا صلى الله عليه وسلم جميع ما معهم من النبوات اذ حكم احد الشيئين حكم مثله فكيف بما هو اولى منه"

ترجمہ: "محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کی تکذیب کے بعد دیگر انبیاء کی

نبوت کی تصدیق ممتنع اور محال ہے اس لئے کہ جس طریق سے موسیٰ اور عیسیٰ علیہما السلام کی نبوت معلوم کی جا سکتی ہے اس سے بدرجہا بہتر اور واضح طریق سے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت معلوم ہو سکتی ہے پس اگر یہ کہیں کہ حضرت موسیٰ اور عیسیٰ کی نبوت ہم کو معجزات سے معلوم ہوئی جو بنقل متواتر ہم تک پہنچتے ہیں۔ تو ہم یہ کہیں گے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے معجزات اس سے ہزار درجہ بڑھ کر متواتر طریق سے منقول ہیں اور وہ کتاب جس کو محمد صلی اللہ علیہ وسلم لے کر آئے وہ تمام کتب سماویہ سے اعلیٰ اور اکمل اور آپ کی امت تمام امتوں سے بہتر اور افضل اور آپ کی شریعت تمام شریعتوں سے عمدہ اور احسن۔ موسیٰ عدل کی شریعت لے کر آئے اور عیسیٰ علیہ السلام فضل کی شریعت لے کر آئے اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم ایسی شریعت لے کر آئے جو عدل اور فضل دونوں کی جامع ہے۔ پس اگر بایں ہمہ کوئی شخص آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو معاذ اللہ کاذب اور مفتری کہے تو اس سے تمام انبیاء سابقین کی نبوت و رسالت کی تکذیب لازم آتی ہے۔ اس لئے کہ جو ایک شئے کا حکم ہوتا ہے وہی اس کے مماثل اور مساوی کا ہوتا ہے۔ پس جس طرح ایک نبی کی تکذیب اس نبی کی تکذیب کو مستلزم ہے جو نبوت و رسالت میں اس کے ہم پلہ ہے پس اس نبی کی تکذیب جو کمالات نبوت و رسالت میں اس سے کہیں اعلیٰ اور ارفع ہے اس کی تکذیب دوسرے انبیاء کی تکذیب کو جو کمالات نبوت میں اس سے کم ہیں بدرجہ اولیٰ مستلزم ہوگی۔

"فلو قال قائل ان هارون ويوشع وداؤد و سليمان كانوا انبياء وموسى لم يكن نبيا او ان داؤد وسليمان ويوشع ويحيٰى كانوا انبياء والمسيح لم يكن نبيا او قال ما يقوله السامره ان يوشع كان نبيا ومن بعد كداؤد وسليمان والمسيح لم يكونوا انبياء او قال ما قاله اليهود ان داؤد وسليمان واشعيا وحبقوق ومليخا

وعاموص ودانيال كانوا انبياء والمسيح بن مريم لم يكن نبيا كان هذا قولا متناقضا معلوم البطلان فان الذين نفى هؤلاء عنهم النبوة احق بالنبوة واكمل ممن اثبتوها له ودلائل نبوة الاكمل افضل فكيف يجوز اثبات النبوة للنبى المفضول دون الفاضل وصار هذا كما لو قال ان زفر وابن القاسم والمزنى والاثرم كانوا فقهاء واباحنيفه ومالكا والشافعى واحمد لم يكونوا فقهاء او قال ان الاخفش وابن الانبارى والمبرد كانوا نحاة وسيبويه والخليل والفراء لم يكونوا نحاة او قال ان صاحب الملكى والمسيحى ونحوهما كانوا اطباء وبقراط وجالينوس ونحوهما لم يكونوا اطباء او قال ان كوشيار والخرقى نحوهما كانوا يعرفون علم الهيئة وبطليموس ونحوه لم يكن له علم بالهيئة ومن قال ان داؤد وسليمان ومليخا وعاموص ودانيال كانوا انبياء ومحمد بن عبدالله لم يكن نبيا فتناقضه اظهر وفساد قوله ابين من هذا جميعه بل وكذلك من قال ان موسى و عيسى رسولا والتوراة وانجيل كتابان منزلان من عندالله ومحمدا صلى الله عليه وسلم ليس برسول والقرآن لم ينزل من الله فبطلانه فى غاية الظهور والبيان لمن تدبر ما جاء به محمد صلى الله عليه وسلم وما جاء به من قبله وتدبر كتابه والكتب التى قبله وايات نبوته وآيات نبوة هؤلاء وشرائع دينه

وشرائع دين هؤلاء.''

پس اگر کوئی کہنے والا یہ کہے کہ حضرت ہارون علیہ السلام اور حضرت یوشع علیہ السلام اور حضرت داؤد علیہ السلام اور حضرت سلیمان علیہ السلام تو نبی تھے مگر حضرت موسیٰ علیہ السلام نبی نہ تھے۔ یا یہ کہے کہ حضرت داؤد علیہ السلام اور حضرت سلیمان علیہ السلام اور حضرت یحییٰ تو نبی تھے مگر حضرت مسیح علیہ السلام نبی نہ تھے یا سامرہ کی طرح یہ کہے کہ حضرت داؤد علیہ السلام اور حضرت سلیمان علیہ السلام اور حضرت اشعیاء اور حضرت حبقوق وملیخا اور حضرت عاموص اور حضرت دانیال تو نبی تھے مگر حضرت مسیح علیہ السلام ابن مریم نبی نہ تھے۔ تو اس کا یہ قول متناقض اور متعارض اور بدیہی البطلان سمجھا جائے گا۔ اس لئے کہ جن حضرات انبیاء کی نبوت کا انکار کیا گیا وہ کمالات نبوت میں ان حضرات انبیاء سے افضل اور اکمل ہیں جن کے لئے نبوت کا اقرار کیا گیا ان کی نبوت کے دلائل، ان کی نبوت کے دلائل سے بہت زیادہ ہیں۔ عقلاً یہ کیسے جائز ہے کہ نبوت مفضول کے لئے تسلیم کی جائے اور افضل کے لئے نہ مانی جائے عالی کے لئے تو نبوت مانیں مگر اعلیٰ اور ارفع کے لئے نہ مانیں۔

یہ بعینہٖ ایسا ہے کہ زفر اور ابن قاسم رحمہ اللہ تعالیٰ اور مزنی رحمہ اللہ تعالیٰ اور اثرم رحمہ اللہ تعالیٰ کو فقیہ اور مجتہد مانا جائے مگر ابوحنیفہ رحمہ اللہ تعالیٰ اور امام مالک رحمہ اللہ تعالیٰ اور شافعی رحمہ اللہ تعالیٰ اور احمد بن حنبل رحمہ اللہ تعالیٰ کی نسبت یہ کہا جائے کہ وہ فقیہ اور مجتہد نہ تھے یا یہ کہا جائے کہ اخفش اور ابن انباری اور مبرد تو نحوی تھے مگر خلیل اور سیبویہ اور فراء نحوی نہ تھے یا یہ کہے کہ صاحب ملکی اور مسیحی تو طبیب تھے مگر بقراط اور جالینوس طبیب نہ تھے یا یہ کہے کہ کوشیار اور خرقی تو علم ہیئتہ سے واقف تھے مگر بطلیموس علم ہیئت سے واقف نہ تھا پس ٹھیک اسی طرح جو شخص یہ کہے کہ حضرت داؤد علیہ السلام اور حضرت سلیمان علیہ السلام اور حضرت ملیخا اور عاموص اور دانیال تو نبی تھے مگر معاذ اللہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم بن عبداللہ نبی نہ تھے۔ تو اس کے قول کا متناقض اور بدیہی

البطلان اور ظاہر الفساد ہونا پہلے اقوال سے بدرجہا واضح اور روشن ہے۔

اسی طرح جو شخص یہ کہے کہ حضرت موسی علیہ السلام اور حضرت عیسی علیہ السلام تو رسول ہیں اور توریت و انجیل اللہ کی اتاری ہوئی کتابیں ہیں۔ مگر (معاذ اللہ) محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے رسول نہیں، اور قرآن اللہ کی اتاری ہوئی کتاب نہیں تو اس کا یہ قول نہایت ہی ظاہر البطلان ہے جو شخص آپ کی لائی ہوئی کتاب میں اور دیگر انبیاء کی لائی ہوئی کتابوں میں اور آپ کے دلائل نبوت اور دیگر انبیاء کے دلائل نبوت میں اور آپ کی شریعت اور دیگر انبیاء کی شریعتوں میں فکر اور تامل کرے تو اس کو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا رسول اللہ اور افضل الانبیاء والمرسلین ہونا بدیہی طور پر منکشف ہو جائے گا۔

حافظ ابن تیمیہ رحمہ اللہ تعالیٰ الجواب الصحیح (جلد۳ صفحہ۲۵۸) پر فرماتے ہیں کہ حضرت موسیٰ اور ہارون اور حضرت یحییٰ اور حضرت عیسیٰ علیہم السلام کی نبوت کو ماننا اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت اور رسالت کو نہ ماننا بعینہ ایسا ہے کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کو امام برحق مانا جائے مگر ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو خلیفہ راشد نہ مانا جائے یا یہ کہا جائے کہ نورالدین شہید رحمہ اللہ تعالیٰ تو عادل تھے مگر عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ تعالیٰ عادل نہ تھے۔

ابوداؤد رحمہ اللہ تعالیٰ اور مسلم رحمہ اللہ تعالیٰ تو امام حدیث تھے مگر بخاری رحمہ اللہ تعالیٰ امام حدیث نہ تھے۔ مشتری اور عطارد، ثریا اور ماہتاب تو روشن اور منور ہیں مگر آفتاب روشن اور منور نہیں۔

عموم بعثت

محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پیشتر جس قدر بھی انبیاء اور مرسلین صلوات اللہ وسلامہ علیہم اجمعین دنیا میں تشریف لائے۔ ان کی دعوت ایک خاص قوم اور ایک خاص جماعت کے ساتھ مخصوص ہوتی تھی مگر نبی اکرم محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی

بعثت اور دعوت کسی خاص قوم اور کسی خاص ملک اور خاص زمانہ کے ساتھ مخصوص نہیں۔ آپ عرب اور عجم، شام اور روم، چین اور ہند غرض یہ کہ تمام عالم کے جن اور انس کے لئے نبی بنا کر بھیجے گئے جس طرح تمام بنی آدم اور تمام عالم کے انسان آپ کی دعوت کے مکلّف ہیں اسی طرح تمام بوادی اور عمران کے بسنے والے بنوالجان یعنی جنات بھی آپ کی دعوت عامہ کے مکلّف اور مخاطب ہیں۔

کما قال تعالٰی: ﴿قُلْ یٰٓاَیُّهَا النَّاسُ اِنِّیْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَیْكُمْ جَمِیْعًا﴾[1]

ترجمہ: ''آپ کہہ دیجئے کہ اے لوگوں! میں تم سب کی طرف اللہ کا رسول ہو کر آیا ہوں۔''

وقال تعالٰی: ﴿وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِیْرًا وَّنَذِیْرًا﴾[2]

ترجمہ: ''ہم نے آپ کو تمام لوگوں کے لئے بشیر اور نذیر بنا کر بھیجا ہے۔''

وقال تعالٰی: ﴿تَبٰرَكَ الَّذِیْ نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلٰی عَبْدِهٖ لِیَكُوْنَ لِلْعٰلَمِیْنَ نَذِیْرًا ۝﴾[3]

ترجمہ: ''بابرکت ہے وہ ذات جس نے قرآن اپنے بندہ پر نازل کیا تاکہ تمام جہان والوں کو ڈراوے۔''

وقال تعالٰی: ﴿وَلِمَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ جَنَّتٰنِ ۝ فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ۝﴾[4]

ترجمہ: ''جو خدا کے سامنے کھڑے ہونے سے ڈرے اس کے لئے جنت میں دو باغ ہیں۔ اے جن و انس تم خدا کی کن کن نعمتوں کا انکار

---

[1] القرآن: ۷/۱۵۸ [2] القرآن: ۳۴/۲۸

[3] القرآن: ۲۵/۱ [4] القرآن: ۵۵/۴۶، ۴۷

کرو گے۔“

یہ آیت سورۃ رحمٰن کی ہے۔ اس سورت میں ﴿فبای الاء ربکما تکذبان﴾ کا خطاب اول سے آخر تک برابر جن اور انس دونوں کو چلا گیا ہے۔

وقال تعالیٰ: ﴿أُولَٰئِكَ الَّذِينَ حَقَّ عَلَيْهِمُ الْقَوْلُ فِي أُمَمٍ قَدْ خَلَتْ مِن قَبْلِهِم مِّنَ الْجِنِّ وَالْإِنسِ إِنَّهُمْ كَانُوا خَاسِرِينَ ۝﴾ [1]

ترجمہ: ”ان پر بھی اللہ کا حکم نافذ ہو چکا ہے پہلی امتوں کے ساتھ جو جن اور انس سے پہلے گزر چکے ہیں بے شک یہ لوگ خسارہ میں رہے۔“

ختم نبوت

ہر چیز کی ایک ابتدا ہوتی ہے اور ایک انتہا۔ لہٰذا ضروری ہوا کہ نبوت کی بھی کوئی ابتدا اور انتہا ہو۔ نبوت کی ابتدا حضرت آدم علیہ السلام سے ہوئی بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ نوع انسانی اور نبوت و رسالت ارشاد اور ہدایت دونوں سلسلوں کا آغاز حضرت آدم علیہ السلام سے ہوا۔ یہ دنیا کا ابتدائی دور اور پہلی منزل تھی اس لئے بہت مختصر قانون ان کی ہدایت کے لئے دیا گیا۔ جوں جوں دنیا ترقی کرتی رہی اور شیطان اور نفس ابن آدم کو گمراہی اور خداوند ذوالجلال کی نافرمانی کے نئے نئے طریقے سمجھاتے رہے۔ اسی کے مناسب بارگاہ خداوندی سے کتابیں اور صحیفے نازل ہوتے رہے۔ اور بندوں کی ہدایت اور ارشاد کے لئے حضرات انبیاء علیہم السلام و مرسلین کی بعثت کا سلسلہ جاری رہا۔ یہاں تک کہ گمراہی اور شقاوت انتہاء کو پہنچ گئی اور شقاوت کی جس قدر صورتیں عقلاً ممکن تھیں وہ سب ظہور میں آ چکیں اور گمراہی ارتقاء کے آخری حد پر پہنچ گئی۔ تب حق سبحانہ وتعالیٰ نے سلسلۂ نبوت کو ایک ایسی مقدس اور برگزیدہ ذات پر ختم کیا کہ اس

---

[1] القرآن: ۴۶/۱۸

کے بعد دنیا کو کسی ہادی کی ضرورت باقی نہ رہے اور اس کو ایسی مکمل اور کامل شریعت عطا کی کہ جو ہر قسم کی سعادت اور فلاح کی کفیل اور ذمہ دار ہو اس کے بعد کسی شریعت کی کوئی حاجت باقی نہ رہے۔

پس جب کہ ایسی کامل اور مکمل شریعت عطا کر دی گئی کہ جس میں زندگی کے ہر شعبہ کے متعلق پورے پورے احکام موجود ہیں اور پھر شریعت بعینہٖ اسی طرح محفوظ ہے جس طرح عطا کی گئی تھی تغیر وتبدل، تحریف و تلبیس کا کہیں اس کے آس پاس بھی گزر نہیں وہ نور ہدایت اسی طرح جگمگا رہا ہے جیسا دیا گیا تھا گویا کہ وہ صاحب شریعت صلی اللہ علیہ وسلم اب بھی ہم میں موجود ہے اور شمع ہدایت سے ہماری رہنمائی فرما رہے ہیں تو بتلاؤ پھر دنیا کو نبوت کی کیا ضرورت باقی رہی۔ اس کامل ومکمل شریعت کے بعد دنیا کو کسی جدید پیغام کی بالکل حاجت نہیں۔ البتہ ضرورت تجدید اور تذکیر کی ہے کہ جب دنیا کی سنتیں مضمحل ہونے لگیں تو ان کی تجدید کر دی جائے۔ جس کے لئے علماء حق کی جماعت کافی ہے۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے سلسلۂ نبوت کو سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم پر تمام کیا اور خاتم النّبیین کے لقب سے آپ کو ممتاز اور سرفراز کیا۔ حدیث میں آیا ہے کہ آپ کے بعد کوئی نبی نہیں آئے گا۔ بلکہ ہر صدی پر مجدد آتے رہیں گے تاکہ لوگوں کی افراط وتفریط سے جو دین میں خلل آگیا ہے اس کو رفع کریں۔ پس یہ حضرات مجدد کے لقب سے موسوم ہوں گے نبی اور رسول نہ کہلائیں گے۔ نبوت و رسالت کے مراتب آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر ختم ہو گئے جیسے مراتب حکومت بادشاہ پر ختم ہو جاتے ہیں۔ اس لئے بادشاہ کو خاتم الحکام کہہ سکتے ہیں۔ اس لئے آپ کے دین کے ظہور کے بعد سب اہل کتاب پر آپ کا ہی اتباع ضروری ہوا۔ حاکم وقت کے موجود ہوتے ہوئے گزشتہ حاکم کا اتباع کافی اور باعث نجات نہیں۔ اسی طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کسی نبی سابق کا اتباع کافی اور موجب نجات نہیں ہو سکتا اور یہی وجہ ہے کہ سوائے آپ کے کسی نبی نے دعوائے خاتمیت نہیں کیا اس لئے کہ نبی

پر جس طرح اپنی نبوت کا اعلان فرض ہے اسی طرح اپنی خاتمیت کا اعلان بھی فرض ہے بلکہ انجیل میں ہے کہ حضرت عیسی علیہ السلام نے فرمایا جہاں کا سردار آنے والا ہے۔ معلوم ہوا کہ حضرت عیسی علیہ السلام خاتم النّبیین نہ تھے ورنہ آنے والے نبی کی بشارت نہ دیتے۔ نیز نصاری حضرت مسیح علیہ السلام کے فارقلیط کے منتظر رہے اور بہت سوں نے یہ دعوی کیا کہ جس فارقلیط کے آنے کی حضرت مسیح نے خبر دی وہ میں ہی ہوں۔ اس سے بھی صاف ظاہر ہے کہ حضرت مسیح علیہ السلام خاتم نہ تھے۔

سوال: جب صحیح حدیثوں سے حضرت عیسیٰ بن مریم صلی اللہ علی نبینا وعلیہ وسلم کا قیامت کے قریب آسمان سے دمشق کے شرقی منارہ پر اترنا ثابت ہے تو پھر خاتم النّبیین کے بعد ایک نبی کا آنا ثابت ہوا جو بظاہر ختم نبوت کے منافی معلوم ہوتا ہے۔

جواب: خاتم النّبیین کے معنی یہ ہیں کہ آپ کے بعد کسی کو جدید نبوت عطا نہیں کی جائے گی۔ لہٰذا انبیاء سابقین میں کسی نبی کا کہ جس کو نبوت آپ سے پیشتر مل چکی ہے آپ کے بعد اس کا زندہ رہنا اور آسمان سے اس کا اترنا آپ کے خاتم النّبیین ہونے کے اصلاً منافی نہیں۔

حضرت عیسی علیہ السلام کو آپ کی ولادت سے صدہا سال قبل نبوت عطا کی جا چکی نزول من السماء کے بعد ان کو جدید نبوت عطا نہیں کی جائے گی تاکہ ختم نبوت کے منافی ہو بلکہ ان کا نزول رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نائب اور جلیل القدر اور عظیم الشان امتی ہونے کی حیثیت سے ہوگا۔ نبی اور رسول ہونے کی حیثیت سے نزول نہ ہوگا۔ یہی وجہ ہے کہ نزول کے بعد حضرت مسیح نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی شریعت کا اتباع کریں گے۔ اپنی شریعت کا اتباع نہ فرمائیں گے۔

آخری بیٹا وہی کہلاتا ہے کہ جو اخیر میں پیدا ہو۔ اگر آخری بیٹا وفات پا جائے اور اس سے پہلے جو بیٹا پیدا ہوا تھا وہ زندہ رہے اور طویل عمر پائے اور فرض کرو کہ یہ طویل العمر بھائی اپنے آخری بھائی کی پیدائش سے پہلے کہیں چلا جائے اور پھر اپنے آخری

بھائی کی وفات کے بعد ایک عرصہ بعد اپنے برادر زادوں کی خبر گیری اور ہمدردی کے لئے آجائے تو یہ آخری بیٹا یا آخری بھائی نہیں کہلا سکتا۔

اسی طرح حضرت مسیح علیہ السلام کو سمجھو کہ وہ انبیاء میں حضرت آدم علیہ السلام کے آخری بیٹے نہیں آخری بیٹے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ سب سے آخر میں آپ پیدا ہوئے اور سب سے آخر میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو نبوت ملی۔ اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے پیدا ہوئے اور آپ سے پہلے نبوت ملی مگر آسمان پر اٹھا لئے گئے اور عمر طویل عطا کی گئی۔ قیامت کے قریب ان کا نزول ہوگا اور اس کے بعد وفات پائیں گے اور اپنے آخری بھائی کے پاس مدفون ہوں گے۔

عالم آخرت

اس عالم شہادت اور عالم دنیا کے علاوہ ایک اور جہاں ہے جس کو عالم آخرت کہتے ہیں۔ عالم آخرت کے دو طبقے ہیں ایک مرنے سے حشر تک جس کو اصطلاح شریعت میں عالم برزخ کہتے ہیں۔ دوسرا قیامت سے لے کر ابد الاباد تک۔ اس کو عالم حشر کہتے ہیں۔ اول ہم کچھ مختصراً عالم برزخ کا حال ذکر کرتے ہیں۔

عالم برزخ وقیامت صغری

قال تعالیٰ: ﴿وَمِنْ وَّرَآئِهِمْ بَرْزَخٌ اِلٰى يَوْمِ يُبْعَثُوْنَ ۝﴾ [1]

ترجمہ: "اور ان کے آگے ایک برزخ ہے جس میں قیامت تک رہیں گے۔"

"وقال النبی صلی اللہ علیہ وسلم من مات فقد قامت قیامته"

[1] القرآن: ۲۳/۱۰۰

ترجمہ: ''نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جو شخص مر گیا اس کی قیامت ہوگئی یہ قیامت صغریٰ ہے۔''

قبر حقیقت میں اسی عالم برزخ کا نام ہے اس گڑھے کا نام نہیں جس میں مردے کو دفن کیا جاتا ہے اسی عالم برزخ میں مردہ سے توحید و رسالت کے متعلق فرشتے آکر سوال کرتے ہیں جن کو منکر نکیر کہتے ہیں۔ پوری پوری جزاء تو قیامت اور حساب و کتاب کے بعد ملے گی مگر جزاء وسزا کا سلسلہ کچھ یہیں سے شروع ہو جاتا ہے۔

چونکہ یہ عالم، عالم دنیا اور عالم آخرت کے بین بین ہے اور اسی وجہ سے اس کو عالم برزخ کہتے ہیں اس لئے اس عالم کا عذاب من وجہ عذاب دنیوی سے مشابہت اور مناسبت رکھتا ہے کہ منقطع ہوسکتا ہے۔ اور من وجہ عالم اخروی سے تعلق رکھتا ہے اس لئے کہ یہ عذاب آخرت کا آغاز اور شروع ہے اور اسی طرح عالم برزخ کی راحت و آرام بھی من وجہ عالم دنیا کی راحت و آسائش سے اور من وجہ عالم آخرت کی راحت و آسائش سے مناسبت رکھتی ہے۔

دارالعمل یعنی دنیا سے ابھی پوری طرح تعلق منقطع نہیں ہوا۔ اسی وجہ سے اقارب واحباب کے دعوات صالحات اور صدقات ومبرات مردہ کے حق میں تخفیف عذاب یا رفع درجات کا کام دیتے ہیں۔ اور اسی وجہ سے انبیاء مرسلین کو اور بعض عباد صالحین کو بطور تکلیف نہیں بلکہ بطور لذت وفرحت قبر (عالم برزخ) میں عبادات مثلاً نماز، حج اور تلاوت قرآن کی اجازت دی جاتی ہے، حدیث میں ہے کہ نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم فرماتے ہیں کہ میں نے قبر میں موسیٰ علیہ السلام کو نماز پڑھتے ہوئے دیکھا۔

قال عزوجل: ﴿اَلنَّارُ يُعْرَضُوْنَ عَلَيْهَا غُدُوًّا وَّعَشِيًّا ۚ وَيَوْمَ تَقُوْمُ السَّاعَةُ ۟ اَدْخِلُوْٓا اٰلَ فِرْعَوْنَ اَشَدَّ

[1] القرآن: ۴۰/۴۶

الْعَذَابِ ۝﴾ [1]

ترجمہ: ''وہ لوگ برزخ میں صبح و شام آگ پر پیش کیے جاتے ہیں اور جس روز قیامت ہوگی اس روز یہ حکم ہوگا کہ فرعون والوں کو مع فرعون کے نہایت سخت عذاب میں داخل کرو۔''

اس آیت سے صاف ظاہر ہے کہ قیامت سے پہلے بھی ایک عذاب ہے جو مرنے کے بعد سے شروع ہو جاتا ہے۔ جیسے دوسری آیت میں ہے ''اُغْرِقُوْا فَاُدْخِلُوْا نَارًا'' وہ لوگ غرق کیے گئے اور اس کے بعد ہی آگ میں داخل کیے گئے۔ کلام عرب میں ''فاتعقیب'' بلا مہلت کے لئے آتی ہے۔ اس عذاب سے بھی عالم برزخ کا عذاب مراد ہے۔

وقال تعالیٰ: ﴿وَلَوْ تَرٰٓى اِذِ الظّٰلِمُوْنَ فِيْ غَمَرٰتِ الْمَوْتِ وَالْمَلٰٓئِكَةُ بَاسِطُوْٓا اَيْدِيْهِمْ ۚ اَخْرِجُوْٓا اَنْفُسَكُمْ ۭ اَلْيَوْمَ تُجْزَوْنَ عَذَابَ الْهُوْنِ بِمَا كُنْتُمْ تَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ غَيْرَ الْحَقِّ وَكُنْتُمْ عَنْ اٰيٰتِهٖ تَسْتَكْبِرُوْنَ ۝﴾ [2]

ترجمہ: ''اگر آپ اس وقت کو دیکھیں جس وقت یہ ظالم موت کی سختیوں میں ہوں گے اور فرشتے ان کے مارنے کے لئے ہاتھ بڑھا رہے ہوں گے اور یہ کہتے ہوں گے کہ نکالو اپنی جان کو، آج تم کو ذلت اور رسوائی کا عذاب دیا جائے گا۔ اس لئے کہ تم اللہ پر جھوٹ بولتے تھے اور اس کی آیتوں سے تکبر کرتے تھے۔''

وقال تعالیٰ: ﴿فَذَرْهُمْ حَتّٰى يُلٰقُوْا يَوْمَهُمُ الَّذِيْ فِيْهِ يُصْعَقُوْنَ ۝ يَوْمَ لَا يُغْنِيْ عَنْهُمْ كَيْدُهُمْ شَيْـًٔا وَّلَا هُمْ يُنْصَرُوْنَ ۝ وَاِنَّ لِلَّذِيْنَ ظَلَمُوْا عَذَابًا دُوْنَ ذٰلِكَ وَلٰكِنَّ

[1] القرآن: ۶/۹۳ [2] القرآن: ۵۲/۴۵، ۴۶، ۴۷

اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴾ [1]

تَرْجَمَہ: ”ان کو چھوڑ دیجئے۔ یہاں تک کہ ان کو اس دن سے سابقہ پڑے جس میں ان کے ہوش اڑ جائیں گے جس دن ان کی کوئی تدبیر کام نہ آئے گی اور نہ کہیں سے ان کو مدد ملے گی اور بے شک ان ظالموں کو آخرت کے پہلے ایک اور عذاب ہونے والا ہے۔ یعنی عذاب قبر۔ لیکن اکثر لوگوں کو اس کا علم نہیں۔“

وقال تعالیٰ: ﴿فَلَوْلَآ اِذَا بَلَغَتِ الْحُلْقُوْمَ ۝ وَاَنْتُمْ حِيْنَئِذٍ تَنْظُرُوْنَ ۝ وَنَحْنُ اَقْرَبُ اِلَيْهِ مِنْكُمْ وَلٰكِنْ لَّا تُبْصِرُوْنَ ۝ فَلَوْلَآ اِنْ كُنْتُمْ غَيْرَ مَدِيْنِيْنَ ۝ تَرْجِعُوْنَهَآ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ۝ فَاَمَّآ اِنْ كَانَ مِنَ الْمُقَرَّبِيْنَ ۝ فَرَوْحٌ وَّرَيْحَانٌ وَّجَنَّتُ نَعِيْمٍ ۝ وَاَمَّآ اِنْ كَانَ مِنْ اَصْحٰبِ الْيَمِيْنِ ۝ فَسَلٰمٌ لَّكَ مِنْ اَصْحٰبِ الْيَمِيْنِ ۝ وَاَمَّآ اِنْ كَانَ مِنَ الْمُكَذِّبِيْنَ الضَّآلِّيْنَ ۝ فَنُزُلٌ مِّنْ حَمِيْمٍ ۝ وَّتَصْلِيَةُ جَحِيْمٍ ۝ اِنَّ هٰذَا لَهُوَ حَقُّ الْيَقِيْنِ ۝ فَسَبِّحْ بِاسْمِ رَبِّكَ الْعَظِيْمِ ۝﴾ [2]

تَرْجَمَہ: ”پس جس وقت روح حلق تک پہنچے اور تم اس وقت دیکھ رہے ہو اور ہم تم سے زیادہ اس مردہ سے قریب ہیں۔ پس اگر فی الواقع تمہارا کوئی حساب و کتاب ہونے والا نہیں تو پھر اس روح کو بدن کی طرف کیوں نہیں لوٹاتے اگر تم سچے ہو۔ پس اگر یہ مرنے والا اللہ کے مقرب بندوں میں سے ہے تو مرنے کے بعد اس کے لئے راحت اور آرام ہے۔ اور اگر اصحاب یمین میں سے ہے تو اس کے لئے سلامتی اور امن

---

[2] القرآن: ۵۶/۸۳ تا ۹۶

وامان ہے۔ اور اگر منکرین اور گمراہوں میں ہے تو کھولتے ہوئے پانی سے اس کی مہمانی ہے اور جہنم میں داخل ہونا ہے جو کچھ کہا گیا تحقیقی اور یقینی بات ہے۔ پس اپنے عظیم الشان پروردگار کی پاکی بیان کیجئے۔‘‘

وقال تعالیٰ: ﴿وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ قُتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتًا ؕ بَلْ اَحْيَآءٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ يُرْزَقُوْنَ ۝ فَرِحِيْنَ بِمَآ اٰتٰهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ وَيَسْتَبْشِرُوْنَ بِالَّذِيْنَ لَمْ يَلْحَقُوْا بِهِمْ مِّنْ خَلْفِهِمْ ۙ اَلَّا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ۝﴾[1]

ترجمہ: ’’جو لوگ خدا کی راہ میں مارے گئے ان کو مردہ مت خیال رکھو بلکہ وہ لوگ زندہ ہیں خدا کے مقرب ہیں۔ ان کو رزق بھی ملتا ہے وہ خوش ہیں ان چیزوں پر جو اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل سے ان کو دی ہیں اور جو لوگ ان کے پاس نہیں پہنچے ان کی بابت بھی ان کو یہ مسرت اور خوشی ہے کہ ہماری طرح ان پر بھی کسی طرح کا خوف اور غم نہ ہوگا۔‘‘

وقال تعالیٰ: ﴿قِيْلَ ادْخُلِ الْجَنَّةَ ؕ قَالَ يٰلَيْتَ قَوْمِيْ يَعْلَمُوْنَ ۝ بِمَا غَفَرَ لِيْ رَبِّيْ وَجَعَلَنِيْ مِنَ الْمُكْرَمِيْنَ ۝﴾[2]

ترجمہ: ’’شہید ہونے کے بعد اس شخص کو کہا گیا کہ جنت میں داخل ہو کہنے لگا کہ کاش میری قوم کو معلوم ہوتا کہ کس وجہ سے اللہ تعالیٰ نے میری مغفرت فرمائی اور عزت واکرام والوں میں مجھ کو شامل کیا۔‘‘

ان آیات سے مؤمن اور کافر کے لئے قبر کا ثواب اور عذاب بخوبی ثابت ہو گیا اور اسی پر تمام اہل اسلام کا اتفاق ہے۔

[1] القرآن:۳/۱۶۹،۱۷۰ [2] القرآن:۳۶/۲۶،۲۷

انجیل لوقا کے سولھویں باب کی انیسویں آیت میں عنوان ذیل کے تحت میں حضرت مسیح علیہ السلام کا قول نقل کیا ہے۔

ایک دولت مند اور ایک غریب کی تمثیل

ایک دولت مند تھا جو نہایت عیش و آرام میں تھا اور ایک غریب تھا۔ دونوں کا انتقال ہوگیا ۲۲ آیت میں ہے کہ جب وہ غریب مر گیا تو فرشتوں نے اسے لے جا کر حضرت ابراہیم علیہ السلام کی گود میں رکھ دیا، اور دولت مند کو عالم ارواح کے درمیان عذاب میں رکھ دیا۔ جب اس نے آنکھ اٹھائی تو اس غریب کو حضرت ابراہیم علیہ السلام کی گود میں دیکھا تو پکار کر یہ کہا! اے باپ ابراہیم رحم کر اور اس (غریب) کو میرے پاس بھیج تاکہ اپنی انگلی کے پانی سے مجھ کو تر کرے۔ کیونکہ میں آگ میں تڑپتا ہوں۔ بعد ازاں اس دولت مند نے حضرت ابراہیم علیہ السلام سے یہ درخواست کی کہ اس کو میرے باپ کے گھر بھیج دیجئے کیونکہ میرے پانچ بھائی ہیں تاکہ ان کے سامنے جا کر گواہی دے ایسا نہ ہو کہ وہ بھی اس عذاب کی جگہ میں آئیں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کہا کہ ان کے پاس حضرت موسیٰ علیہ السلام اور دوسرے نبی ہیں۔ اس نے کہا شاید مردوں میں اگر کوئی ان کے پاس جائے تو وہ توبہ کر لیں حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جواب دیا جب وہ موسیٰ علیہ السلام اور نبیوں ہی کی نہیں سنتے تو اگر مردوں میں سے کوئی جی اٹھے تو اس کی بھی نہ مانیں گے۔ انتہی۔

اس قول سے صاف ظاہر ہے کہ مرنے کے بعد قیامت سے پہلے عالم برزخ میں ہر شخص پر عذاب یا ثواب ضرور ہوتا ہے۔ اسی کو شریعت اسلامیہ میں عذاب قبر اور ثواب قبر کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ نیز اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ مرنے کے بعد روح جسم عنصری میں جزاء اور سزا بھگتنے کے لئے دنیا میں نہیں آتی جس کو تناسخ اور ہندی میں آواگون کہتے ہیں۔ الا یہ کہ کسی مردہ کو کسی نبی کا معجزہ ظاہر کرنے کے لئے

زندہ فرمادیا جائے تو وہ تناسخ نہیں۔ تناسخ وہ ہے کہ روح دوبارہ دنیا میں کسی قالب میں جزاء اور سزا پانے کے لئے آئے۔ نیز اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ مرنے کے بعد خویش واقارب سے روح کا تعلق باقی رہتا ہے۔

سوال نکیرین

صحیحین (بخاری و مسلم) میں حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ: جب مردے کو قبر میں رکھ کر اس کے ساتھی واپس ہوتے ہیں تو وہ ان کے جوتوں کی آواز سنتا ہے اس کے بعد اس کے پاس دو فرشتے آتے ہیں اور اس کو بٹھلا کر یہ سوال کرتے ہیں کہ تو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں کیا کہتا تھا۔ مؤمن یہ کہتا ہے میں گواہی دیتا ہوں وہ اللہ کے بندے اور اس کے رسول تھے۔ اس وقت مؤمن کو کہا جاتا ہے کہ تم اپنا دوزخ کا ٹھکانہ دیکھ لو۔ یعنی اگر ایمان نہ لاتے تو یہ تمہارا ٹھکانہ تھا۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے تم کو ایمان کی بدولت اس کے بدلہ جنت کا ٹھکانہ عطا فرمایا اور جب فرشتے کافر سے سوال کرتے ہیں کہ تو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں کیا کہتا تھا تو یہ جواب دیتا ہے کہ مجھ کو معلوم نہیں۔ اس وقت فرشتے اس کو لوہے کے گرز مارتے ہیں۔ جس سے وہ چیختا چلاتا ہے۔ جس کو سوائے جن اور انس کے تمام حیوانات اور جمادات سنتے ہیں۔

اور بعض حدیثوں میں ہے کہ مردہ سے یہ سوال کرتے ہیں کہ تیرا رب کون ہے اور تیرا دین کیا ہے اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بارہ میں کیا اعتقاد رکھتا ہے۔ مؤمن جواب میں یہ کہتا ہے کہ میرا رب اللہ ہے اور دین میرا اسلام ہے اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ کے بندے اور اس کے رسول ہیں۔ اس وقت ایک منادی آسمان سے ندا دیتا ہے کہ اس بندہ نے سچ کہا۔ اس کے لئے جنت کا فرش بچھا دو اور اس کو جنت کا لباس پہناؤ۔ اور اس کے لئے جنت کا دروازہ کھول دو۔ تا کہ وہاں کی ہوائیں اور خوشبوئیں

آتی رہیں اور جہاں تک نگاہ پہنچتی ہے وہاں تک اس کی قبر کو وسیع کر دیا جائے۔

اور کافر جواب میں یہ کہتا ہے کہ ہاہ ہاہ مجھے کچھ معلوم نہیں۔ ایک منادی آسمان سے ندا دیتا ہے کہ جھوٹ بکتا ہے (یعنی اس کو خوب معلوم تھا دیدہ دانستہ انکار کیا) اور حکم ہوتا ہے کہ اس کے لئے جہنم کا فرش بچھا دو اور جہنم کا لباس اس کو پہنا دو اور جہنم کی جانب اس کے لئے کھول دو تا کہ وہاں کی گرم ہوائیں اور لپٹیں آتی رہیں۔

اور ایک اور حدیث میں ہے کہ اس پر ننانوے اژدھے مسلط کئے جاتے ہیں جو قیامت تک اس کو کاٹتے اور ڈستے اور نوچتے رہیں گے۔

ایک شبہ اور اس کا جواب

شبہ ہے کہ ہم بسا اوقات قبر کو کھول کر دیکھتے ہیں نہ وہاں کوئی سانپ اور بچھو نظر آتے ہیں نہ کوئی لباس اور فرش دکھائی دیتا ہے۔

جواب

یہ ہے کہ عالم غیب اور عالم برزخ کی چیزوں کا مشاہدہ اور معائنہ کے لئے عالم شہادت اور عالم دنیا کی آنکھیں کافی نہیں۔

مرتے وقت فرشتے آسمان سے اترتے ہیں فقط مرنے والا ان کو اپنی آنکھوں سے دیکھتا ہے۔ بعض مرتبہ فرشتوں کے سلام کا جواب بھی دیتا ہے اور روح کے لپیٹنے کے لئے فرشتے جو کفن لے کر آتے ہیں ان کو بھی دیکھتا ہے۔

چونکہ یہ شخص عالم دنیا سے عالم آخرت کی طرف جا رہا ہے اس لئے فقط یہ شخص عالم آخرت کی چیزوں کا مشاہدہ کرتا ہے۔ باقی حاضرین میں سے کوئی نہیں دیکھتا۔

اسی طرح قبر کے لباس اور فرش وغیرہ کو سمجھو کہ وہ عالم غیب اور عالم برزخ کا فرش اور لباس ہے۔ عالم غیب کی چیزیں ہیں۔ جہاں عقل کی رسائی نہیں جن کو حق جل وعلا نے ملکوت السموات والارض کا مشاہدہ کرا دیا ہے۔ سوائے ان کے اتباع کے کوئی

چارہ کار نہیں عالم غیب کی کوئی شئے حاشا وکلاذرہ برابر خلاف عقل نہیں۔خلاف عقل ہونا جب متصور ہوسکتا ہے کہ جب وہاں عقل کی رسائی ممکن ہولیکن جس جگہ عقل کی رسائی بھی ممکن نہ ہووہاں یہ حکم لگا دینا کہ یہ شئے خلاف عقل ہے کیسے صحیح ہوسکتا ہے۔ خلاف عقل ہونا اور شئے ہے اور عقل کا نہ پہنچنا اور شئے ہے۔

ہاں محض عقل کی نارسائی کی وجہ سے کسی شئے کا انکار کر دینا سراسر خلاف عقل ہے ؎

چوں آں کرمے کہ درسنگے نہاں است
زمین و آسمان او ہماں است

خلاصہ کلام

یہ کہ عذاب قبر اور نعیم قبر ہے۔ کتاب اللہ اور سنت رسول اور اجماع امت محمدیہ سے ثابت ہے۔اس پر ایمان لانا فرض ہے۔ باقی اصل حقیقت اور کیفیت اللہ تعالیٰ کو معلوم ہے۔

فائدہ جلیلہ

ظاہر احادیث سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ منکر اور نکیر صرف دوفرشتے ہیں جو سوال کے لئے مقرر کئے گئے ہیں اور بعض علماء ادھر گئے کہ کراماً کاتبین کی طرح ایک جماعت کثیرہ ہے جس طرح ہر شخص کے کراماً کاتبین علیحدہ علیحدہ ہیں اسی طرح ہر مردہ کے منکر اور نکیر بھی علیحدہ علیحدہ ہیں لیکن یہ قول شاذ ہے۔مگر اس قول پر کوئی عقلی اشکال وارد نہیں ہوتا۔ البتہ جمہور کے قول پر اشکال وارد ہوتا ہے کہ دوفرشتے وقت واحد میں تمام مردوں سے مختلف مقامات میں کیسے سوال کر سکتے ہیں۔ جواب یہ ہے کہ ممکن ہے کہ دو ہی فرشتے ایک ہی وقت میں مختلف مقامات میں متمثل ہوکر سوال کریں اور یہ بھی ممکن ہے کہ ایک ہی وقت میں ایک جہت کے مردوں سے سوال کریں اور ہر مردہ

اپنے کو مخاطب سمجھ کر جواب دے اور یہ دو فرشتے خداداد قوت تمیزیہ سے ہر ایک مردہ کا جواب علیحدہ علیحدہ معلوم کر لیں اور مختلف جوابوں میں کوئی التباس اور اشتباہ نہ ہو۔ حق تعالیٰ شانہ تمام عالم کی آوازیں بیک وقت سنتے ہیں اور ایک آواز دوسری آواز کے مزاحم نہیں ہوتی۔ عجب نہیں کہ حق جل مجدہ نے اس کا کوئی پرتو منکر نکیر پر ڈال دیا ہو۔ جس سے منکر ونکیر کو مردوں کے مختلف جواب میں اشتباہ نہ ہوتا ہو جیسے حق تعالیٰ نے اپنی صفت قدرت کا پرتو فرشتوں پر ڈالا کہ ایک فرشتہ لاکھوں کی بستی اور آبادی کو اپنے پر پر اوپر اٹھا کر لے جائے اور لے جا کر الٹ دے۔ جیسے قوم لوط کی بستیوں کے الٹے جانے کا قصہ قرآن کریم میں مذکور ہے۔

دار آخرت

عالم حشر واثبات قیامت کبریٰ

ایک عادل ومنصف، رحیم وکریم بادشاہ کی شان حکومت اور شان عدل کا یہ اقتضا ہے کہ اول اپنی رعایا کے لئے ایک قانون مرتب کرے تاکہ لوگ اس کی پابندی کریں کوئی کسی کی حق تلفی اور ایک دوسرے پر ظلم وتعدی نہ کر سکے۔ پھر عدالتیں قائم کرے تاکہ وہاں ظالم ومظلوم کا فیصلہ ہو سکے مدعی اور مدعی علیہ کے مقدمہ کی سماعت کے لئے کوئی پیشی کا وقت مقرر ہونا چاہئے تاکہ اس تاریخ میں مع گواہوں کے مدعی اور مدعی علیہ کا بیان سن کر کوئی صحیح اور قطعی فیصلہ علی روس الاشہاد سنا دیا جائے۔ فیصلہ سنانے کے بعد مجرم کو پولیس کی حراست اور نگرانی میں دیا جائے تاکہ وہ اس مجرم کو کشاں کشاں اور پابجولاں لے جا کر جیل خانہ میں بند کر دے۔

اسی طرح ملیک مقتدر اور احکم الحاکمین نے اپنے بندوں کے لئے انبیاء مرسلین کی وساطت سے مختلف کتابیں ومختلف صحیفے وقتاً فوقتاً نازل فرمائے اور سب سے اخیر

میں خاتم الانبیاء والمرسلین سیّد الاولین والاخرین محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک نہایت کامل و مکمل شریعت اور آفتاب سے زائد روشن اور واضح ملت اور ایک آخری پیام دے کر بھیجا۔ تاکہ لوگ حق اور باطل، رشد اور ضلالت، ہدایت اور گمراہی میں فرق قائم کر سکیں۔ حق جلا وعلا کے اوامر وارشادات کی جان ودل سے تعمیل کریں اور مناہی اور اس کی ناپسندیدہ چیزوں سے بالکلیہ اجتناب اور پرہیز کریں۔ نہ حقوق اللہ میں کوئی خیانت کریں اور نہ حقوق العباد میں۔ اللہ کا حق بھی ادا کریں اور بندوں کے حق سے بھی غافل نہ رہیں۔

اور بارگاہ خداوندی کے وزراء اور حکام یعنی انبیاء ومرسلین نے تمام دنیا کے جن اور انس کو قوانین خداوندی سے خوب آگاہ کر دیا۔ جرائم اور ان کی دفعات سے نہایت تفصیل کے ساتھ سب کو خبردار بنا دیا اور ببانگ دہل بار بار یہ اعلان کر دیا کہ اس احکم الحاکمین نے ظالم اور مظلوم، نیک اور بد، مطیع اور نافرمان، مؤمن اور فاسق کے فیصلہ اور ان کی جزاء اور سزا کے لئے ایک خاص دن مقرر فرمایا۔

كما قال تعالىٰ: ﴿هٰذَا يَوْمُ الْفَصْلِ جَمَعْنٰكُمْ وَالْاَوَّلِيْنَ ۝﴾ [1]

ترجمہ: ”یہ فیصلہ کا دن ہے اس لئے تم کو اور تمام اولین کو جمع کیا ہے۔“

وقال تعالىٰ: ﴿قُلْ اِنَّ الْاَوَّلِيْنَ وَالْاٰخِرِيْنَ ۝ لَمَجْمُوْعُوْنَ اِلٰى مِيْقَاتِ يَوْمٍ مَّعْلُوْمٍ ۝﴾ [2]

ترجمہ: ”تحقیق سب اگلے اور پچھلے ایک معین تاریخ پر جمع کئے جائیں گے۔“

وقال تعالىٰ: ﴿اِلَيْهِ مَرْجِعُكُمْ جَمِيْعًا ۭ وَعْدَ اللّٰهِ حَقًّا ۭ﴾ [3]

ترجمہ: ”تم سب کو اللہ کی طرف جانا ہے اللہ نے سچا وعدہ کیا ہے۔“

---

[1] القرآن: ۷۷/۳۸ [2] القرآن: ۵۶/۴۹، ۵۰ [3] القرآن: ۱۰/۴

وقال تعالیٰ: ﴿إِنَّهُ يَبْدَؤُا الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيدُهُ لِيَجْزِيَ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ بِالْقِسْطِ ۚ وَالَّذِينَ كَفَرُوا لَهُمْ شَرَابٌ مِّنْ حَمِيمٍ وَّعَذَابٌ أَلِيمٌ بِمَا كَانُوا يَكْفُرُونَ﴾[۱]

ترجمہ: ''وہی پہلی بار پیدا کرتا ہے اور وہی دوبارہ پیدا کرے گا۔ تاکہ ایمان والوں اور نیک عمل والوں کو انصاف کے ساتھ جزاء دے اور جن لوگوں نے کفر کیا ان کو کھولتا ہوا پانی پلایا جائے گا اور کفر کی وجہ سے ان کو دردناک عذاب ہوگا۔''

اس آیت سے صاف ظاہر ہے کہ قیامت قائم کرنے سے حق جلا وعلا کا مقصد یہ ہے کہ اپنی شان عدل اور انصاف کو ظاہر فرمائے نیکوں کو جزاء اور بدکاروں کو سزا دے۔

دنیا میں بہت سے بدکار ہیں کہ ہر طرح راحت اور آرام سے ہیں اور بہت سے نیکوکار صالح اور پرہیزگار ہیں کہ ظالموں کے شکار بنے ہوئے ہیں۔

اس لئے ضروری ہے کہ اس عالم کے سوا کوئی اور عالم ہو کہ جس میں صالح اور طالح، شقی اور سعید، ظالم اور مظلوم کا فرق ظاہر ہو اور اس کی شان عدل اور شان انصاف ظہور میں آئے۔ اور جب قیامت کے دن یہ تمام مقدمات پیش ہوں گے اس وقت عمر بھر کے تمام اقوال وافعال حرکات سکنات جو خدائی خفیہ پولیس یعنی کراماً کاتبین نے قلم بند کئے تھے وہ سب سامنے رکھ دیئے جائیں گے۔

کما قال تعالیٰ: ﴿وَنُخْرِجُ لَهُ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ كِتٰبًا يَّلْقٰهُ مَنْشُورًا ۝ اِقْرَاْ كِتٰبَكَ ۚ كَفٰى بِنَفْسِكَ الْيَوْمَ عَلَيْكَ حَسِيْبًا ۝﴾[۲]

ترجمہ: ''اور قیامت کے دن اس کا نامہ اعمال اس کے سامنے کردیں

---

۱ القرآن: ۱۰/۴   ۲ القرآن: ۱۷/۱۳، ۱۴

گے جس کو وہ کھلا ہوا پائے گا اور اس سے کہیں گے کہ تو خود اپنا نامۂ اعمال پڑھ لے آج تو خود ہی اپنا کافی محاسب ہے۔"

شیخ عبدالوہاب شعرانی قدس اللہ سرہ فرماتے ہیں کہ کراما کاتبین کی کتاب عجیب قسم کی کتاب ہے اہل دنیا کی کتاب کے مشابہ نہیں۔

یہ شخص جب اپنے نامۂ اعمال کو پڑھے گا تو علی حسب الاعمال اپنے نامۂ اعمال کے حروف کو روشن اور سفید پائے گا اور صاحب سیئات اپنی کتاب کے نقوش اور حروف کو تاریک اور سیاہ پائے گا۔

"کذا فی الیواقیت والجواہر" [۱]

کما قال تعالیٰ: ﴿یَوْمَ تَجِدُ كُلُّ نَفْسٍ مَّا عَمِلَتْ مِنْ خَيْرٍ مُّحْضَرًا ۚ وَمَا عَمِلَتْ مِنْ سُوْٓءٍ ۚ﴾ [۲]

ترجمہ: "قیامت کے دن ہر نفس اپنے اچھے اور برے عمل کو حاضر پائے گا۔"

کما قال تعالیٰ: ﴿وَوَجَدُوْا مَا عَمِلُوْا حَاضِرًا ۗ وَلَا يَظْلِمُ رَبُّكَ اَحَدًا ۝﴾ [۳]

ترجمہ: "جو کچھ بھی انہوں نے عمل کیا ہے قیامت کے دن اس عمل کو بعینہٖ حاضر پائیں گے اور تیرا پروردگار کسی پر ظلم نہیں کرتا۔"

علماء ربانیین اور راسخین فی العلم کے نزدیک یہ آیت اپنی حقیقت پر ہے کسی تاویل اور مجاز کی محتاج نہیں یعنی ہر شخص کا ہر عمل قیامت کے دن حاضر کیا جائے گا۔ مؤذن اگر اذان دیتے ہوئے اور حاجی تلبیہ اور لبیک کہتے ہوئے قیامت کے دن حاضر کیا جائے گا تو زانی اور سارق نے جس طرح اس نے دنیا میں زنا اور سرقہ کیا تھا اسی طرح میدان حشر میں زنا اور سرقہ کرتے ہوئے حاضر کیا جائے گا۔

---

۱ جلد۲ صفحہ۱۶۸ ۲ القرآن: ۳/۳۰ ۳ القرآن: ۱۸/۴۹

قیامت کے دن حشر فقط اجساد اور اجسام کا نہ ہوگا بلکہ اجسام کے ساتھ تمام حرکات وسکنات اور تمام اقوال وافعال اور تمام اعمال حسنہ اور اعمال سیئہ کے ساتھ تمام اولین وآخرین ایک میدان میں جمع ہوں گے۔

کما قال تعالیٰ: ﴿وَيَوْمَ نُسَيِّرُ الْجِبَالَ وَتَرَى الْأَرْضَ بَارِزَةً وَحَشَرْنَاهُمْ فَلَمْ نُغَادِرْ مِنْهُمْ أَحَدًا ۝ وَعُرِضُوا عَلَىٰ رَبِّكَ صَفًّا لَّقَدْ جِئْتُمُونَا كَمَا خَلَقْنَاكُمْ أَوَّلَ مَرَّةٍ ۚ بَلْ زَعَمْتُمْ أَلَّن نَّجْعَلَ لَكُم مَّوْعِدًا ۝ وَوُضِعَ الْكِتَابُ فَتَرَى الْمُجْرِمِينَ مُشْفِقِينَ مِمَّا فِيهِ وَيَقُولُونَ يَا وَيْلَتَنَا مَالِ هَٰذَا الْكِتَابِ لَا يُغَادِرُ صَغِيرَةً وَلَا كَبِيرَةً إِلَّا أَحْصَاهَا ۚ وَوَجَدُوا مَا عَمِلُوا حَاضِرًا ۗ وَلَا يَظْلِمُ رَبُّكَ أَحَدًا ۝﴾[1]

ترجمہ: ''اور جس دن ہم پہاڑوں کو ہٹا دیں گے اور اے مخاطب تو زمین کو کھلا میدان دیکھے گا اور ہم سب کو جمع کریں گے اور ہم کسی کو نہیں چھوڑیں گے اور سب خدا کے سامنے صف بستہ پیش کیے جائیں گے اور یہ کہا جائے گا کہ آج تم ہمارے سامنے اسی طرح آئے ہو جس طرح ہم نے تم کو پہلی بار پیدا کیا تھا تمہارا گمان یہ تھا کہ ہم قیامت کا وعدہ پورا نہ کریں گے اور اس کے بعد نامۂ اعمال سامنے رکھ دیا جائے گا اس وقت تو مجرموں کو دیکھے گا کہ لرزاں اور ترساں ہوں گے اور یہ کہیں گے کہ ہائے ہائے کمبختی یہ کیسی کتاب ہے یہ کتاب الاعمال تو عجیب ہی کتاب ہے کہ جس نے بغیر قلم بند کیے نہ کوئی چھوٹا گناہ چھوڑا اور نہ کوئی بڑا گناہ چھوڑا اور جو عمل کیا تھا وہ سب سامنے موجود اور حاضر پائیں گے اور تیرا پروردگار کسی پر ظلم نہیں کرتا۔''

---

[1] القرآن: ۱۸/ ۴۷ تا ۴۹

تمام اولین و آخرین میدان حشر میں حیران و پریشان کھڑے ہوئے ہوں گے کہ یکایک رب العلمین اور احکم الحاکمین نہایت عظمت وجلال کے ساتھ بندوں کے فیصلہ کے لئے نزول اجلال فرمائیں گے۔ ہر طرف فرشتوں کا پہرہ ہوگا۔

کما قال تعالٰی: ﴿وَّجَآءَ رَبُّكَ وَالْمَلَكُ صَفًّا صَفًّا﴾[1]

تَرْجَمَۃ: ''اور تیرا پروردگار فیصلہ کے لئے آئے گا اور فرشتے بھی جوق درجوق آئیں گے۔''

جبرئیل امین اور تمام ملائکہ سموات وارضین دست بستہ اور صفہ بستہ کھڑے ہوں گے مگر اس ذوالجلال والاکرام کے سامنے کسی کو مجال دم زدنی نہ ہوگی۔[2]

انبیاء اور مرسلین، شہداء اور صدیقین بھی اس دن کی ہیبت اور جلال سے حیران اور پریشان، خوف زدہ سر برگریبان ہوں گے اول انبیاء ومرسلین سے سوال شروع ہوگا۔

کما قال تعالٰی: ﴿يَوْمَ يَجْمَعُ اللّٰهُ الرُّسُلَ فَيَقُوْلُ مَاذَآ اُجِبْتُمْ ؕ قَالُوْا لَا عِلْمَ لَنَاؕ اِنَّكَ اَنْتَ عَلَّامُ الْغُيُوْبِ ﴿۱۰۹﴾﴾[3]

تَرْجَمَۃ: ''قیامت کے دن اللہ تعالٰی پیغمبروں کو امتوں کے ساتھ جمع کرے گا اور پھر رسولوں سے یہ فرمائے گا کہ تم کو امتوں کی طرف سے کیا جواب ملا تھا عرض کریں گے کہ ظاہری جواب معلوم ہے مگر حقیقت کا علم نہیں، پوشیدہ باتوں کے جاننے والے تو آپ ہی ہیں۔''

اس کے بعد عامۃ الناس سے سوال شروع ہوگا اور ملائکہ ہر شخص کو فلاں بن فلاں

---

[1] القرآن: ۲۲/۸۹

[2] اشارۃ الی قولہ تعالٰی: يَوْمَ يَقُوْمُ الرُّوْحُ وَالْمَلٰٓئِكَةُ صَفًّا ۖ لَّا يَتَكَلَّمُوْنَ اِلَّا مَنْ اَذِنَ لَهُ الرَّحْمٰنُ القرآن: ۳۸/۷۸

[3] القرآن: ۱۰۹/۵

[4] اشارۃ الی: ما اخرجہ مسلم عن انس مرفوعاً وفیہ یقول کفی بنفسک الیوم علیک شہیدا و بالکرام الکاتبین شہودا (الحدیث، مشکوۃ: صفحہ ۲۸۵)

کہہ کر آواز دیں گے اور نامۂ اعمال ان کے سامنے ڈال دیئے جائیں گے۔ اور کراماً کاتبین کی شہادت صادقہ پر (جس میں کذب کا امکان بھی نہیں) کفار جرح کریں گے اور یہ کہیں گے کہ یہ ہمارے دشمن ہیں۔ دشمنی سے ہم پر جھوٹ لکھ دیا ہے۔
اس وقت اتمام حجت کے لئے ان کے اعضاء و جوارح سے شہادت دلائی جائے گی۔

کما قال تعالیٰ: ﴿يَوْمَ تَشْهَدُ عَلَيْهِمْ اَلْسِنَتُهُمْ وَاَيْدِيْهِمْ وَاَرْجُلُهُمْ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۝﴾[1]
ترجمہ: ''اس روز ان کے خلاف ان کی زبانیں اور ان کے ہاتھ اور ان کے پیران کاموں کی گواہی دیں گے جو وہ کیا کرتے تھے۔''

وقال تعالیٰ: ﴿حَتّٰى اِذَا مَا جَآءُوْهَا شَهِدَ عَلَيْهِمْ سَمْعُهُمْ وَاَبْصَارُهُمْ وَجُلُوْدُهُمْ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۝ وَقَالُوْا لِجُلُوْدِهِمْ لِمَ شَهِدْتُّمْ عَلَيْنَا قَالُوْٓا اَنْطَقَنَا اللّٰهُ الَّذِيْٓ اَنْطَقَ كُلَّ شَيْءٍ وَّهُوَ خَلَقَكُمْ اَوَّلَ مَرَّةٍ وَّاِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ۝﴾[2]
ترجمہ: ''جب وہ حاضر ہوں گے تو ان کے کان اور آنکھ ان کی کھالیں سب کے سب ان کے خلاف شہادت دیں گے یہ لوگ اس وقت تعجب اور حیرت سے اپنے اعضاء اور جوارح سے یہ کہیں گے کہ تم نے ہمارے خلاف کیوں شہادت دی۔ وہ اعضاء جواب میں کہیں گے کہ اس اللہ نے ہم کو گویائی دی جس نے ہر چیز کو گویائی دی اور اسی نے تم کو پہلی بار پیدا کیا تھا۔ اور پھر تم اسی کی طرف لائے گئے ہو۔''
یعنی جس قادر مطلق نے سب چیزوں کو گویائی عطا فرمائی اسی نے ہم کو بھی گویائی

---
[1] القرآن: ۲۴/۲۴ [2] القرآن: ۴۱/۲۰، ۲۱

عطا فرمائی۔ چنانچہ تم کو خود معلوم ہے کہ اس قادر مطلق نے تم کو ایک ناپاک پانی سے پیدا کیا پھر تم کو سمیع وبصیر سننے والا اور دیکھنے والا انسان بنایا۔ پھر سمع اور بصر کے علاوہ فہم وفراست تکلم اور بیان اور اظہار ما فی الضمیر کی قوت عطا فرمائی۔ پس اگر ایسا علیم وقدیر اعضاء وجوارح میں بھی حیات وادراک، نطق اور تکلم پیدا فرمادے کہ جس سے اعضاء اور جوارح انسانوں کی طرح بولنے لگیں اور حالات وواقعات کی شہادت دینے لگیں تو کیا تعجب ہے ہر چیز کا تسبیح وتحمید پڑھنا قرآن سے ثابت ہے۔ شجر وحجر کا نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے سلام وکلام کرنا اور ذراع مسموم کا نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کو زہر کی آمیزش کی خبر دینا احادیث صحیحہ سے ثابت ہے پس اعضاء اور جوارح کا تکلم اور ان کی شہادت کوئی مستبعد امر نہیں ہے خصوصاً اس دور میں جب کہ ایسے آلات موجود ہیں کہ جو اصوات اور حروف اور لب ولہجہ اور طرز ادا کی پوری پوری حفاظت کرتے ہیں (یعنی فونوگراف) جب چاہتے ہیں اس میں کسی آواز کو بند کر لیتے ہیں۔ پھر ایک مدت کے بعد اسی آواز کو سن لیتے ہیں۔ اگر مخبر صادق یعنی خدا کا نبی یہ خبر دیتا ہے کہ تمہارے اعضاء اور جوارح تمہارے اقوال وافعال اخلاق واعمال کے محافظ ہیں اور قیامت کے دن باذن الٰہی تمہارے تمام اقوال وافعال کو اسی حالت اور اسی لب ولہجہ کے ساتھ فونوگراف سے کہیں بہتر ادا کریں گے تو کیوں تعجب کرتے ہو۔

میزان اعمال

اس کے بعد اعمال کے وزن کرنے کے لئے ایک ترازو قائم کی جائے گی جس میں بندوں کے اقوال وافعال اخلاق واعمال سب کا وزن ہوگا۔ تا کہ اس کی شان عدل اور انصاف ظاہر ہو۔

قال اللّٰہ تعالٰی: ﴿وَالْوَزْنُ يَوْمَئِذٍ الْحَقُّ ۚ﴾ [1]

[1] القرآن: ۷/۸

ترجمہ: ''اور قیامت کے دن اعمال کا وزن حق ہے۔''

﴿وَنَضَعُ الْمَوَازِيْنَ الْقِسْطَ لِيَوْمِ الْقِيٰمَةِ فَلَا تُظْلَمُ نَفْسٌ شَيْئًا ۖ وَاِنْ كَانَ مِثْقَالَ حَبَّةٍ مِّنْ خَرْدَلٍ اَتَيْنَا بِهَا ۖ وَكَفٰى بِنَا حٰسِبِيْنَ ۝﴾ [1]

ترجمہ: ''اور ہم قیامت کے دن میزان عدل قائم کریں گے کسی نفس پر ذرہ برابر ظلم نہ ہوگا اور اگر اس کا عمل رائی کے دانہ برابر ہوگا تو ہم اس کو بھی حاضر کریں گے اور ہم حساب لینے کے لئے کافی ہیں۔''

شیخ ابوطاہر قزوینی قدس اللہ سرہ سراج القول میں فرماتے ہیں کہ دنیا دار عمل ہے اور آخرت دار جزاء اور حق جل شانہ ملک عادل ہے جو ذرہ برابر کسی پر ظلم نہیں فرماتا اور کسی نیکوکار کے اجر کو ضائع نہیں کرتا۔ ہر شخص کو اس کے عمل کے مطابق جزا دیتا ہے اس لئے وہ شہنشاہ عادل عدل اور انصاف کے ظاہر کرنے کے لئے قیامت کے دن ایک میزان قائم فرمائے گا جس میں بندوں کی حسنات اور سیئات کو تولا جائے گا۔ ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے مروی ہے کہ میزان اعمال کے دو پلے ہوں گے ایک پلہ نور کا ہوگا۔ جس میں حسنات اور اعمال صالحہ رکھے جائیں گے اور دوسرا پلہ ظلمت کا ہوگا۔ جس میں سیئات اور اعمال بد کو رکھا جائے گا۔ حذیفۃ بن الیمان فرماتے ہیں کہ قیامت کے دن صاحب میزان یعنی وزن اعمال کے منتظم اور نگران جبرئیل امین ہوں گے مؤمن کا عمل نہایت بہتر صورت میں اور کافر کا عمل نہایت قبیح صورت میں لایا جائے گا۔

اور اگر کسی کو یہ اشکال ہے کہ اعمال تو کھلی اور وزنی شئے نہیں بلکہ معانی اور اعراض ہیں کہ جو صدور وظہور کے بعد فنا ہو جاتے ہیں ان کا وزن کیسے ممکن ہے؟ سو جواب یہ ہے کہ دنیا میں ہی دیکھ لیا جائے کہ ہر چیز کا وزن اور مقدار معلوم کرنے کے

---

[1] القرآن: ۲۱/۴۷

لئے جدا جدا آلات موجود ہیں۔ جس طرح غلہ تولنے کے لئے کانٹا ہے۔ اسی طرح شمس وقمر اور کواکب سیارہ کی حرکات کی مقدار معلوم کرنے کے لئے مقیاس الحرارت موجود ہے۔ بعض مرتبہ مختلف اشخاص سے ایک پتھر اٹھوایا جاتا ہے تاکہ ان لوگوں کی قوتوں کا اندازہ ہو سکے۔ حقیقت میں وہ پتھر ان قوتوں کے تولنے کی ایک میزان ہے۔ جس سے ان کے قویٰ کا وزن معلوم ہوتا ہے۔ پس خدا کی قدرت سے کیا بعید ہے کہ وہ علیم وقدیر قیامت کے دن ایک ایسی میزان قائم فرمائے کہ جس سے حسنات اور سیئات کا صحیح صحیح اور ٹھیک ٹھیک وزن معلوم ہو سکے۔

ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے منقول ہے کہ قیامت کے دن بندوں کے اعمال اجسام بنا دیئے جائیں گے۔ لہٰذا وزن اعمال میں اب کوئی شک ہی نہیں رہا۔[1]

سلمان فارسی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے منقول ہے کہ میزان اعمال اس قدر وسیع ہوگی کہ اگر زمین و آسمان بھی اس میں رکھ دیئے جائیں تو سب کو سما جائے۔ ایک حدیث میں ہے کہ جنت کو عرش کے بائیں جانب لاکر رکھا جائے گا اور حق جل وعلا کے سامنے میزان قائم کی جائے گی۔ حسنات کا پلہ عرش کے دائیں جانب جنت کے مقابلے میں ہوگا۔

فائدہ: اس میں اختلاف ہے کہ میزان اعمال ایک ہوگی یا ایک سے زیادہ۔ مشہور قول یہ ہے کہ تمام اقوال وافعال اور تمام امتوں کے لئے ایک ہی ترازو ہوگی۔ حسن بصری رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ہر شخص کی ترازو علیحدہ ہوگی۔ اس لئے کہ حق تعالیٰ نے ونضع الموازین اور فمن ثقلت موازینہ میں صیغہ جمع کا استعمال فرمایا ہے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ترازوئیں متعدد ہوں گی۔ لیکن ممکن ہے کہ ترازو کی عظمت اور کثرت اجزاء کی وجہ سے صیغہ جمع لایا گیا ہو۔ "کذا فی شرح العقیدۃ السفارنیہ"۔[2]

---

[1] فتح الباری جلد ۳، راجع رسالہ ارضی الاقوال فی عرض الاعمال من بوادر النوادر صفحہ ۲۵ [2] جلد ۲ صفحہ ۱۷۹

وزن اعمال سے کون لوگ مستثنیٰ ہوں گے

حضرات انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام اور نابالغ بچے اور وہ ستر ہزار کہ جو بلا حساب وکتاب جنت میں داخل ہوں گے اور وہ کہ جو ان کے ساتھ ملحق ہوں گے وہ وزن اعمال سے مستثنیٰ ہوں گے۔ ان کے اعمال کا وزن نہ ہوگا۔[1]

ایک حدیث میں ہے کہ جتنی دیر میں ایک بکری کا دودھ دوہا جاتا ہے۔ اتنی دیر میں تمام اولین و آخرین کا حساب کر دیا جائے گا۔

حجۃ الاسلام امام غزالی قدس سرہ اپنے رسالہ ("المضنون به علٰى غير اهله" صفحہ ۲۵) میں فرماتے ہیں:

"وسئل امير المؤمنين على بن ابى طالب كرم اللّٰه وجهه كيف يحاسب اللّٰه الخلق فى لحظة من غير تشويش ولا غلط فقال رضى اللّٰه عنه كما يرزقهم مع سائر الحيوانات بلا تشويش ولا غلط."

ترجمہ: "حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے سوال کیا گیا کہ اللہ تعالیٰ بغیر کسی تشویش اور غلطی کے ساری مخلوق کا ایک لحظہ میں کس طرح حساب کرے گا؟ جواب میں فرمایا جس طرح وہ تمام مخلوق کو بغیر کسی تشویش اور غلطی کے رزق دیتا ہے۔"

صراط جہنم، یعنی پل صراط

جہنم پر ایک پل بنایا جائے گا جو بال سے زائد باریک اور تلوار کی دھار سے زائد تیز ہوگا۔ تمام عالم کو اس پر سے گزرنے کا حکم ہوگا۔ اول انبیاء و مرسلین اور انبیاء و

[1] کذا فی الاتحاف شرح الاحیاء: جلد۲ صفحہ ۲۸، شرح العقیدۃ السفارنیہ: جلد۲ صفحہ ۱۶۸

مرسلین میں سب سے پہلے نبی اکرم محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم اس پر سے گزریں گے۔ مؤمنین میں علی اختلاف المدارج کوئی بجلی کی مانند اور کوئی اونٹ کے مانند اس پر سے گزرے گا۔ اور جہنمی کٹ کر جہنم میں گر جائیں گے۔

پل صراط پر اندھیرا ہوگا۔ سوائے ایمان کے اور کوئی روشنی نہ ہوگی۔ اہل ایمان ایمان کی روشنی میں پل صراط پر سے گزریں گے۔

کما قال تعالیٰ: ﴿يَوْمَ لَا يُخْزِي اللّٰهُ النَّبِيَّ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ ۚ نُوْرُهُمْ يَسْعٰى بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَبِاَيْمَانِهِمْ﴾[1]

ترجمہ: ”جس دن اللہ تعالیٰ اپنے نبی کو اور اس پر ایمان لانے والوں کو رسوا نہ کرے گا۔ ان کا نور ان کے سامنے اور ان کے دائیں ان کی راہنمائی کے لئے چلتا ہوگا۔“

ایمان حقیقت میں ایک نور ہے اور کفر ظلمت اور تاریکی ہے۔ جس کا انکشاف قیامت کے دن ہوگا۔ اور حق جل شانہ نے اپنے فضل سے جب اپنے کسی خاص بندہ پر ایمان کی حقیقت منکشف فرمائی تو وہ نور کی شکل میں ظاہر فرمائی۔

حجۃ الاسلام امام غزالی قدس اللہ سرہ المضنون الکبیر میں فرماتے ہیں۔ جس پر دنیا میں چلنے کا حکم دیا گیا تھا اور سورۂ فاتحہ میں جس کا روزانہ سوال کیا جاتا تھا یعنی ﴿اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ﴾[2] ترجمہ: ”بتلا ہم کو راہ سیدھی۔“ یہ صراط مستقیم حقیقت میں بال سے زیادہ باریک اور تلوار کی دھار سے زائد تیز ہے۔ صراط مستقیم اس راستہ کو کہتے ہیں جو افراط اور تفریط کے ٹھیک وسط میں واقع ہو۔ مثلاً سخاوت اس خلق کو کہتے ہیں کہ جو اسراف اور بخل کے ٹھیک وسط میں واقع ہو اور شجاعت اس خلق کو کہتے ہیں کہ جو جبن اور تہور کے درمیان میں ہو اور تواضع اس خلق کو کہتے ہیں کہ جو تکبر اور دناءۃ کے بین بین واقع ہو اور دیگر اخلاق کو اسی طرح سمجھیں۔ حق جل شانہ نے اس امت

[1] القرآن: ۸/۶۶ [2] القرآن ۱/۵

متوسط کے لئے یہ متوسط راستہ جو اخلاق متضادہ کے ٹھیک وسط میں واقع ہے تجویز فرمایا اور یہی راستہ سب سے بہتر ہے۔ "کما قال النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم: خیر الامور اوسطھا" نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم فرماتے ہیں کہ: سب سے بہتر وہ شئے ہے کہ جو متوسط ہے۔ اسی طریق متوسط کا نام شریعت میں صراط مستقیم ہے جو حقیقت میں بال سے زائد باریک اور تلوار کی دھار سے زائد تیز ہے۔ یہی صراط مستقیم قیامت کے دن پل صراط کی صورت میں ظاہر ہوگا جو شخص دنیا میں صراط مستقیم پر قائم رہا وہ آخرت میں بھی پل صراط پر قائم رہے گا۔ اور جس شخص کے قدم دنیا ہی میں صراط مستقیم پر قائم نہ رہے بلکہ ڈگمگا گئے اور پھسل گئے اسی قدر آخرت میں اس کے قدم پل صراط سے ڈگمگا جائیں گے۔

﴿رَبَّنَآ اَفۡرِغۡ عَلَيۡنَا صَبۡرًا وَّثَبِّتۡ اَقۡدَامَنَا، (آمین یا ارحم الراحمین)﴾[1]

تَرجَمَہ: "اے اللہ! صبر کو پانی کی طرح ہم پر بہا دے کہ ہم اس میں نہا جائیں اور ہم کو ثابت قدم رکھ۔ آمین۔"

اور پل صراط کا بال سے زیادہ باریک اور تلوار سے زیادہ تیز ہونا احادیث صحیحہ سے ثابت ہے۔ تفصیل کے لئے اتحاف شرح احیاء العلوم جلد۲ صفحہ ۲۳۰ اور شرح عقیدہ سفارنیہ، جلد۲ صفحہ ۱۸۳ کی مراجعت کی جائے۔

حوض کوثر

کوثر اصل میں جنت میں ایک نہر ہے جو حق تعالیٰ شانہ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو عطا فرمائی۔ اس کی ایک شاخ میدان حشر میں بھی ہوگی جس میں اس نہر کا پانی لاکر جمع کیا جائے گا۔ اس حوض کو بھی کوثر کہتے ہیں قرآن کریم میں اس حوض کا ذکر ہے۔

---

[1] القرآن ۲/۲۵۰

﴿اِنَّاۤ اَعۡطَیۡنٰکَ الۡکَوۡثَرَ﴾[1]

ترجمہ: "بے شک ہم نے دی تجھ کو کوثر۔"

اور احادیث میں اس کے عجیب وغریب اوصاف مذکور ہیں۔ حدیث میں ہے کہ اس کی مسافت ایک مہینہ کے برابر ہوگی۔ اس کا پانی دودھ سے زیادہ سفید اور مشک سے زیادہ خوشبودار اور شہد سے زیادہ شیریں اور برف سے زیادہ ٹھنڈا ہوگا اور اس پر جو کوزے اور آبخورے رکھے ہوں گے وہ آسمان کے ستاروں سے زیادہ چمکدار ہوں گے۔ جو شخص ایک مرتبہ اس حوض کا پانی پی لے گا۔ پھر کبھی اس کو پیاس نہ لگے گی۔ لوگ قبروں سے پیاسے اٹھیں گے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنی امت کے پیاسوں کو پانی پلائیں گے۔ اسی وجہ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ساقی کوثر کہتے ہیں اور یہ حوض شریعت کی صورت مثالیہ ہے۔ شریعت بھی اصل میں پانی کے حوض کو کہتے ہیں۔ جس نے دنیا میں شریعت کی حوض سے پانی پیا وہ آخرت میں بھی حوض کوثر سے پانی پیئے گا اور جو یہاں محروم رہا وہاں بھی محروم رہے گا۔

شیخ جلال الدین سیوطی رحمہ اللہ تعالیٰ "بدور سافرہ" میں فرماتے ہیں کہ حوض کوثر کے بارے میں پچاس صحابہ کرام سے بھی زیادہ روایت آئی ہے۔ منجملہ ان کے خلفاء راشدین بھی ہیں اور اس کے بعد ایک ایک حدیث کو علیحدہ علیحدہ ذکر کیا۔ حضرات اہل علم شرح عقیدہ سفارنیہ جلد۲ صفحہ ۱۸۷ تا جلد۲ صفحہ ۱۹۶ اور شرح عقیدہ طحاویہ صفحہ ۱۶۱ اور تفسیر ابن کثیر کی مراجعت فرمائیں۔

جنت وجہنم

اس کے بعد اہل ایمان کو جنت میں جانے کا اور اہل کفر کو جہنم میں جانے کا حکم ہوگا۔ جنت اور جہنم فی الحال موجود ہیں جیسا کہ قرآن اور حدیث کی بے شمار نصوص اس

---

[1] القرآن ۱۰۸/۱

پر دلالت کرتی ہیں۔ قرآن اور حدیث میں جس طرح اور جس صفت کے ساتھ ان کا بیان کیا گیا ہے۔ اسی طرح ان کو حق سمجھنا اور اس پر ایمان رکھنا لازم اور ضروری ہے اور تاویل کے پردہ میں ان کا انکار الحاد اور زندقہ ہے۔

عالم[1] جسمانی کی حقیقت اور اس کی حیات وممات

عالم جسمانی بھی انسان کی طرح مختلف اجزاء سے مرکب ہے اور جس طرح انسان کی ہیئت ترکیبی اس پر دلالت کرتی ہے کہ یہ انسان کی حیات مستعار محض چند روزہ ہے اور پھر موت ہے۔ اسی طرح اس عالم پر بھی ایک وقت موت کا آنے والا ہے اور جس طرح انسان پر مختلف دور گزرتے ہیں۔ طفولیت، شباب، پیری اور موت، اسی طرح اس عالم کے لئے بھی طفولیت، شباب اور پیری کا زمانہ ہے اور اس کے بعد اس کو فنا ہے اور وہ وقت قیام قیامت کا ہے اس وقت مجموعہ عالم کا قبض روح ہوگا اور اس کی حیات ختم ہو جائے گی۔ آسمان اور زمین پھٹ جائیں گے اور اس عالم کا شیرازہ منتشر ہو جائے گا۔ تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ جیسے انسان ایسے متضاد اجزاء یعنی عناصر اربعہ آب وخاک، ہوا و آتش سے مرکب ہے کہ باہم ایک دوسرے کے دشمن ہیں۔ ہر ایک کا مزاج دوسرے کے مخالف ہے۔ ایسے ہی یہ سارا عالم بھی اشیاء مختلف المزاج اور مختلف التاثیر سے مرکب ہوا۔ انسان کے اجزاء اس قدر مختلف المزاج اور مختلف التاثیر نہیں جتنا کہ عالم کے اجزاء مختلف المزاج اور مختلف التاثیر ہیں اور جب ہر چیز کا مزاج اور اس کی تاثیر علیحدہ ہے تو لامحالہ ہر ایک دوسرے کا دشمن ذاتی اور مخالف اصلی ہوگا اور جب کبھی کسی جزء کا غلبہ ہوگا تو مزاج عالم میں فساد ضرور آئے گا۔ مزاج کا وہ اعتدال جو اس جز کے غلبہ سے پہلے تھا وہ غلبہ کے بعد باقی نہ رہے گا۔ اور یہ حالت

---

[1] اصل مضمون حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمہ اللہ تعالیٰ کی تقریر دلپذیر سے لیا گیا ہے اور دلائل اور شواہد مولف کی طرف سے ہیں۔

عالم کے لئے بمنزلہ مرض کے ہوگی۔ جیسے انسان میں جب کوئی مرض آتا ہے تو وہ کسی خاص جز کے غلبہ ہی کی وجہ سے آتا ہے۔ مثلاً جب آگ کا غلبہ ہوتا ہے تو بخار آتا ہے اور جب پانی کا غلبہ ہوتا ہے تو زکام اور فالج اور وجع مفاصل یہ امراض ظاہر ہوتے ہیں اور جب خاک کا غلبہ ہوتا ہے یبوست کی وجہ سے خارش پیدا ہوتی ہے اور ہوا کی زیادتی سے ورم اور ریاحی درد پیدا ہوتے ہیں۔

آدمی کا بدن فقط چار چیزوں سے مرکب ہے۔ جب ان چار ہی کے غالب اور مغلوب ہونے سے ہزاروں امراض پیدا ہوتے ہیں تو عالم جو کہ بے شمار اجزاء سے مرکب ہے ان کے آپس میں غلبہ اور مغلوب ہونے سے تو لاکھوں امراض پیدا ہونے چاہئیں۔

آسمان اس عالم کا سر ہے اور آگ سینہ ہے اور ہوا پیٹ ہے اور زمین اس کے پاؤں ہیں اور پانی بمنزلہ ہاتھ کے ہے اور شمس وقمر عالم کے لئے بمنزلہ آنکھ کے ہیں اور پہاڑ ہڈیوں کے اور اشجار بمنزلہ بالوں کے اور نباتات بمنزلہ رؤں کے ہیں۔

جس طرح انسان میں کسی جزء کے غلبہ سے فساد اور خرابی آتی ہے۔ اسی طرح اجزاء عالم میں سے جب کسی جزء کا غلبہ ہوتا ہے تو عالم میں فساد اور خرابی آتی ہے۔ حضرت ہود علیہ السلام کے زمانہ میں ہوا کے غلبہ سے حضرت ہود علیہ السلام کے مکذبین اور منکرین کو ہلاک کیا گیا۔

زمین کے مزاج میں جب کوئی خرابی آتی ہے تو اس کی وجہ سے زمین پر زلزلے آتے ہیں۔ جس سے زمین شق ہو جاتی ہے۔ بہت سے لوگ اس میں قارون کی طرح دھنسا دیئے جاتے ہیں اور بہت سی بستیاں اس میں بیٹھ جاتی ہیں یہ زلزلہ زمین کے حق میں بمنزلہ تپ اور لرزہ کے معلوم ہوتا ہے۔ ایک ہی زمین ہوتی ہے کہ اس میں عرصہ تک خوب پیداوار ہوتی ہے مگر چند سال کے لئے پیداوار رک جاتی ہے کسی حال میں درخت ثمر دار خوب بار آور ہوتا ہے اور کسی سال ایسا نہیں ہوتا۔ یہ تمام صورتیں زمین

کے مزاج میں فساد آنے کے باعث پیدا ہوتی ہیں۔ برسات کا کثرت سے ہونا، اولے پڑنا پانی کے مزاج کی خرابی پر دلالت کرتے ہیں اور بجلی کا گرنا اور دمدار ستاروں کا نظر آنا کرہ ناریعنی طبقہ آگ کی خرابی پر دلالت کرتا ہے۔

اور چاند سورج کا گہن یہ عالم کے لئے بمنزلہ آشوب چشم کے ہے اور جس طرح انسان ظاہری امراض کے علاوہ باطنی امراض میں مبتلا ہوتا ہے۔ اسی طرح یہ عالم بھی ان ظاہری امراض کے علاوہ جن کا اوپر ذکر ہوا، باطنی امراض میں مبتلا ہوتا ہے بلکہ باطنی امراض، ظاہری امراض سے کہیں زائد ہیں۔ اکثر بنی آدم کا بداخلاق ہونا اور ان سے افعال ناپسندیدہ کا سرزد ہونا یہ عالم کے حق میں باطنی امراض ہیں۔ دنیا میں زنا اور سرقہ کی اتنی کثرت نہیں جتنا کہ حب جاہ اور حب مال، اعجاب اور استکبار، تحاسد اور تباغض، تفاخر اور تنافر وغیرہ کی کثرت ہے۔ دنیا میں اگر کوئی مرض بھی نہ ہو تو حق جل شانہ سے غفلت بھی ایک ایسا مرض ہے کہ ہلاک کرنے کے لئے کافی ہے۔ الغرض عالم کے لئے امراض ضرور ہیں لیکن ہم کو سب کی تفصیل معلوم نہیں ہوسکتی مرض کی خبر مریض ہی کو ہوسکتی ہے۔ خاص کر مرض پنہانی کی اور وہ بھی ایسا ہو کہ کسی اور کو بھی نہ ہوا ہو۔ سو امراض کی خبر پوری عالم کی روح کو ہوگی۔ اس لئے کہ جس طرح انسان اور حیوان میں روح ہے۔ اسی طرح عالم میں بھی ایک روح ضرور ہے بلکہ عالم کا کوئی ذرہ ایسا نہیں جو روح سے خالی ہو۔ اگر عالم اور اس کے اجزاء میں روح نہ ہو تو وہ اپنے خالق اور رب کا کیسے ادراک کرسکیں گے یہ ناممکن ہے کہ مخلوق کو اپنے خالق کا اور مربوب کو اپنے رب کا علم اور ادراک نہ ہو۔ ورنہ یہ مسلم ہے کہ عالم کی کوئی شے اس علیم وقدیر کے اختیار اور قدرت ارادہ اور مشیت سے باہر نہیں جو حرکت اور سکون ہے وہ اسی کے حکم اور فرمان کے تابع ہے پس اگر عالم اور اجزاء عالم میں حیات اور شعور ہی نہیں تو پھر وہ احکام الٰہی کی کیسے تعمیل کرتے ہیں۔ خلاصہ یہ کہ اگر عالم میں روح اور حیات ادراک اور شعور نہ ہو تو عالم کا رب العالمین سے بے تعلق ہونا لازم آتا ہے۔ عارف

رومی فرماتے ہیں ؎

بے تعلق نیست مخلوقے ازو
آں تعلق ہست بے چوں اے عمو

یعنی کوئی مخلوق خدا سے بے تعلق نہیں مگر وہ تعلق بے چون و چگون ہے۔

تمام کتب الٰہیہ اور صحف سماویہ اور کل انبیاء و مرسلین صلوات اللہ وسلامہ علیہم اجمعین کے بے شمار نصوص اس پر شاہد عدل ہیں کہ عقلاء اور حیوانات کے علاوہ اشجار و احجار اور تمام جمادات میں حق جل وعلانے روح اور علم اور ادراک کو ودیعت فرمایا۔ شجر اور حجر بھی بزبان قال حقیقتاً حق سبحانہ وتعالیٰ کی تسبیح اور تقدیس، حمد اور ثنا کرتے ہیں:

کما قال تعالیٰ:

﴿تُسَبِّحُ لَهُ السَّمٰوٰتُ السَّبْعُ وَالْاَرْضُ وَمَنْ فِيْهِنَّ وَاِنْ مِّنْ شَيْءٍ اِلَّا يُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ وَلٰكِنْ لَّا تَفْقَهُوْنَ تَسْبِيْحَهُمْ ؕ﴾ [۱]

ترجمہ: ”ساتوں آسمان اور زمین اور ان کے اندر کی چیزیں اللہ کی پاکی بیان کرتی ہیں بلکہ کوئی شے ایسی نہیں جو اللہ کی تسبیح اور تحمید نہ کرتی ہو۔“

﴿كُلٌّ قَدْ عَلِمَ صَلَاتَهٗ وَتَسْبِيْحَهٗ ؕ﴾ [۲]

ترجمہ: ”ہر ایک شے کو اپنی نماز اور تسبیح معلوم ہے۔“

اشجار اور نباتات اس رب العالمین کو سجدہ بھی کرتے ہیں۔

کما قال تعالیٰ:

﴿وَالنَّجْمُ وَالشَّجَرُ يَسْجُدٰنِ ۝﴾ [۳]

ترجمہ: ”تمام نباتات اور اشجار اللہ کو سجدہ کرتے ہیں۔“

﴿اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ يَسْجُدُ لَهٗ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِي

---

۱ القرآن: ۱۷/۴۴ ۲ القرآن: ۲۴/۴۱ ۳ القرآن: ۵۵/۶

الْاَرْضِ وَالشَّمْسُ وَالْقَمَرُ وَالنُّجُوْمُ وَالْجِبَالُ وَالشَّجَرُ وَالدَّوَآبُّ وَكَثِيْرٌ مِّنَ النَّاسِ ﴾ [1]

ترجمہ: ''کیا تو نے دیکھا نہیں کہ تمام آسمان اور زمین والے شمس اور قمر اور نجوم اور کواکب اور تمام پہاڑ اور تمام درخت اور تمام جانور اور بہت سے آدمی اللہ ہی کو سجدہ کرتے ہیں۔''

پہاڑ اور پتھر اس ذوالجلال والاکرام سے ڈرتے ہیں۔

کما قال تعالیٰ: ﴿وَاِنَّ مِنْهَا لَمَا يَهْبِطُ مِنْ خَشْيَةِ اللّٰهِ ﴾ [2]

ترجمہ: ''اور بعضے پتھر اللہ کے خوف سے اوپر سے نیچے گر جاتے ہیں۔''

کما قال تعالیٰ: ﴿لَوْ اَنْزَلْنَا هٰذَا الْقُرْاٰنَ عَلٰى جَبَلٍ لَّرَاَيْتَهٗ خَاشِعًا مُّتَصَدِّعًا مِّنْ خَشْيَةِ اللّٰهِ ﴾ [3]

ترجمہ: ''اگر اس قرآن کو کسی پہاڑ پر نازل کرتے تو اے مخاطب تو اس پہاڑ کو اللہ کے خوف سے ٹکڑے ٹکڑے ہو جانے والا دیکھتا۔''

کما قال تعالیٰ: ﴿يٰجِبَالُ اَوِّبِيْ مَعَهٗ وَالطَّيْرَ ﴾ [4]

ترجمہ: ''اے پہاڑو اور اے پرندو! تم داؤد علیہ السلام کے ساتھ بار بار تسبیح پڑھا کرو۔''

کما قال تعالیٰ: ﴿وَالصُّبْحِ اِذَا تَنَفَّسَ ﴾ [5]

ترجمہ: ''قسم ہے صبح کی جب وہ سانس لے۔''

ان آیات میں حق جل شانہ نے اشجار واحجار کی طرف تسبیح وتحمید، صلاۃ اور سجود خشیت خداوندی اور ارادہ کو منسوب فرمایا ہے اور ظاہر ہے کہ یہ افعال بغیر روح اور بغیر ادراک اور شعور کے صادر نہیں ہو سکتے۔

---

[1] القرآن: ۱۸/۲۲ [2] القرآن: ۷۴/۲ [3] القرآن: ۲۱/۵۹
[4] القرآن: ۱۰/۳۴ [5] القرآن: ۱۸/۸۱

صحیح بخاری میں ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جبل احد کو دیکھ کر یہ فرمایا: "ھذا جبل یحبنا ونحبه" (یہ پہاڑ ہم کو محبوب رکھتا ہے اور ہم اس کو محبوب رکھتے ہیں)۔

صحیح مسلم میں ہے:

"انی لا عرف حجرا بمکة کان یسلم علی قبل ان ابعث"

ترجمہ: "میں مکہ میں اس پتھر کو خوب پہچانتا ہوں کہ جو بعثت سے پہلے مجھ کو سلام کیا کرتا تھا"

حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے مروی ہے کہ ہم ایک مرتبہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مکہ سے باہر گئے۔ جس درخت اور جس پہاڑ پر گزرتے تھے اس میں سے یہ آواز آتی تھی۔ "السلام علیکم یا رسول اللّٰه"

ستون حنانہ کا جمعہ کے روز مجمع عام میں رونا تو احادیث متواترہ سے ثابت ہے عارف رومی رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں ؎

آنکہ اورانہ نبود از اسرار داد
کے کند تصدیق او نالہ جماد

یعنی جس کو اسرار خداوندی کے علم سے کوئی حصہ نہیں ملا وہ ایک جماد یعنی ستون کے رونے کی کب تصدیق کر سکتا ہے۔

بحر العلوم شرح مثنوی میں فرماتے ہیں کہ جمادات کا تکلم حق اور ثابت ہے اور نفس الامر میں محقق اور واقع ہے مگر ہر شخص کے لئے نہیں بلکہ خاص عباد مخلصین اور اہل اللہ اور عارفین کے لئے ہے۔ جمادات بزبان فصیح ان حضرات کے سامنے کلام کرتے ہیں اور یہ حضرات گوش ہوش سے ان کے کلام کو سنتے ہیں ؎

نطق آب و نطق خاک و نطق گل

ہست محسوس حواس اہل دل

پانی اور خاک اور گل کا نطق اور تکلم اہل دل کے بھی حواس سنتے ہیں ؎

فلسفی کہ منکر حنانہ است

از حواس اولیاء بیگانہ است

جو فلسفی کہ ستون حنانہ کے رونے کا منکر ہے وہ انبیاء اور اولیاء کے حواس سے بیگانہ ہے ؎

گر نبودے واقفان امر کن

در جہاں ردگشتہ بودے ایں سخن

اگر دنیا میں امر کن کے واقف یعنی عارفین اور اہل اللہ نہ ہوتے تو دنیا میں یہ بات یعنی جمادات و نباتات کے شعور اور تکلم کا مسئلہ بالکل رد ہو جاتا۔ یعنی حق جل شانہ جب کسی معدوم کو موجود فرمانا چاہتے ہیں تو کن کا خطاب فرماتے ہیں۔ وہ معدوم فوراً موجود ہو جاتا ہے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ معدومات بھی حق جل شانہ کے خطاب کو سنتے ہیں اور اس کے حکم کی تعمیل کرتے ہیں اور شیخ اکبر قدس اللہ سرہ ایک جگہ فتوحات میں فرماتے ہیں کہ حق جل شانہ کی رویت کے لئے مرئی (جس کو دیکھا جائے) کا موجود ہونا شرط نہیں وہ سمیع و بصیر حالت عدم میں بھی معدومات کو دیکھتا ہے۔ پس جب معدومات سے خطاب ہو سکتا ہے تو جمادات کے شعور اور تکلم میں کیا استبعاد باقی رہا ؎

باد و خاک و آب و آتش بندہ اند

بامن و تو مردہ وبحق زندہ اند

ہوا اور مٹی اور پانی اور آگ یہ سب خدا کے غلام ہیں۔ میرے اور تیرے نزدیک بے جان ہیں مگر حق تعالیٰ کے نزدیک زندہ ہیں ؎

گر نبودے واقف از حق جان باد

فرق کے کردے میان قوم عاد

اگر ہوا کی روح حق تعالیٰ شانہ سے واقف نہ ہوتی تو قوم عاد میں فرق کیسے کرتی کہ مؤمنوں کو بچاتی اور کافروں کو ہلاک کرتی ؎

موج دریا چوں بامر حق بتاخت
اہل موسیٰ راز قبطی واشناخت

دریائے قلزم کی موج جب اللہ کے حکم سے دوڑی تو موسیٰ علیہ السلام کے لوگوں قبطیوں اور فرعونیوں کو الگ الگ پہچانا۔ موسیٰ علیہ السلام کے متبعین کو راستہ دیا اور متبعین فرعون کو غرق کیا ؎

خاک قارون راچو فرماں در رسید
بازر و تختش بقعر خود کشید

خاکِ قارون کو جب فرمان الٰہی پہنچا تو قارون کو مع سیم وزر اور مع تخت کے اپنی گہرائی میں کھینچ لیا۔

خلاصہ یہ کہ ہر شے میں روح ہے اور عالم بھی چونکہ سب کا سب ایک شے ہے۔ اس لئے اس میں بھی ایک جدا روح ضرور ہوگی کہ اس پر عالم کی حیات اور ممات کا مدار ہوگا۔ وہ روح جب تک عالم کے جسم میں جاری وساری ہے اس وقت تک عالم زندہ ہے اور جب وہ روح عالم کے جسم سے نکل جائے گی تو وہ وقت عالم کی موت اور وفات کا ہوگا۔

اور ذکر الٰہی کو اُس عالم کے حق میں غذائے روح سمجھو۔ جب تک عالم کو ذکر الٰہی کی غذا ملتی رہے گی اس وقت تک اس کی حیات ہے۔ ورنہ اس کے بعد اس کی زندگی ختم ہے۔ چنانچہ حدیث میں ہے کہ جب تک زمین پر کوئی اللہ اللہ کرنے والا باقی رہے گا اس وقت تک قیامت قائم نہ ہوگی۔

زمانہ کا شباب اور اس کی پیری اور اس کی وفات

اخبار صحیحہ متواترہ سے یوں معلوم ہوتا ہے کہ یہ امراض پہلے زمانہ میں بہت کم پیش آتے تھے۔ خاص کر امراض باطنی کہ وہ اب بہت شدت پر ہیں اور بایں ہمہ نہ امراض کے علاج کی کسی کو فکر ہے اور نہ یہ ممکن ہے کہ ان اعضا اور جوارح ہی کو کاٹ ڈالیں کہ جن میں یہ امراض پلوں دوڑے ہوئے ہیں۔ غرض یہ کہ ان امراض سے عافیت پا جانے کی کوئی صورت نظر نہیں آتی۔ ان امور کا لحاظ کرتے ہوئے یہ سمجھ میں آتا ہے کہ یہ زمانہ عالم کے حق میں ایسا ہے جیسے ہمارے تمہارے حق میں بڑھاپے کا زمانہ جس میں قوت تو ہر طرح کم ہو جاتی ہے اور امراض ہر طرف سے گھیر لیتے ہیں۔ اس لئے یہ خیال آتا ہے کہ یہ امراض ایک نہ ایک دن اپنا کام کر گزریں گے اور عالم کی روح پرواز کر جائے گی اور اس کا زمانہ حیات ختم ہو جائے گا۔

جس طرح روح نکلنے کے بعد انسان کا بدن پھول کر پھٹ جاتا ہے اسی طرح اس عالم کا جسم بھی روح نکلنے کے بعد خراب ہو کر پھول کر پھٹ جائے گا۔

ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے باسناد صحیح منقول ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام سے حضرت نوح علیہ السلام تک دس قرن گزرے سب اسلام پر تھے۔ دس قرن کے بعد اختلاف شروع ہوا اور کفر اور شرک کا سلسلہ جاری ہوا۔[1]

حضرت آدم سے حضرت نوح علیہما السلام تک کا زمانہ عالم کے حق میں طفولیت اور لڑکپن کا زمانہ معلوم ہوتا ہے اور حضرت نوح علیہ السلام سے لے کر حضرت موسیٰ علیہ السلام تک جو زمانہ گزرا وہ عالم کے حق میں شباب اور جوانی کا زمانہ معلوم ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر حضرت نوح علیہ السلام تک جو دس قرن گزرے اس میں صرف ایک ہابیل و قابیل کا واقعہ پیش آیا جس کو لڑکپن کی

---

[1] درمنثور: جلد ا

ایک شرارت کہا جاسکتا ہے اور حضرت نوح علیہ السلام کے بعد سے انبیاء اللہ کا مقابلہ شروع ہوا۔ بڑوں کا مقابلہ جوانوں کا کام ہے بچوں کا کام نہیں۔ جوں جوں جوانی بڑھتی رہی انبیاء اللہ کا مقابلہ بڑھتا رہا۔ خدا کی تائید انبیاء ومرسلین کے ساتھ رہی۔ جس نے نبی کا مقابلہ کیا عذاب الٰہی سے ہلاک ہوا اور ہمیشہ کے لئے ذلت ومسکنت کی مہر اس پر لگادی گئی۔

نمرود مردود نے برگزیدہ رسول کا مقابلہ کیا کہ جس کی توحید وتفرید نے سیّد الملائکۃ المقربین یعنی جبرئیل امین کی اعانت اور تائید سے بھی اس کو مستغنی اور بے نیاز کر دیا تھا۔ یعنی حضرت ابراہیم علیہ افضل الصلوٰۃ والتسلیم، مگر اس کا نتیجہ کیا ہوا کہ اللہ جل شانہ نے اپنے خلیل کے لئے آگ کو برد اور سلام بنایا۔ اور ان کے مقابل کو ذلیل وخسیس ترین حیوان یعنی مچھر سے ہلاک کیا۔

لوط علیہ السلام جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بھتیجے ہیں۔ ان کی قوم کو جو لواطت کے مرض میں مبتلا تھی عجیب طرح سے ہلاک کیا۔ یعنی جہنم کے تپتے ہوئے پتھر ان پر برسائے گئے اور پتھر بھی ایسے کہ جن پر ہر شخص کا نام لکھا ہوا تھا۔ اور علی ہذا قوم عاد اور ثمود کو صیحہ اور ریح عقیم کے ذریعہ سے ہلاک کیا گیا۔

الحاصل حضرت نوح علیہ السلام کے زمانہ سے معاندین اور متکبرین برابر انبیاء اللہ کا مقابلہ کرتے رہے۔ مگر خدا کے فضل سے ہمیشہ انبیاء اللہ کی شان بڑھتی رہی اور اعداء اللہ کی ذلت ورسوائی میں برابر اضافہ ہوتا رہا۔ حتیٰ کہ قوم عاد اور قوم ثمود اور قوم لوط ذلت ورسوائی میں ضرب المثل ہو گئے۔

عالم کا زمانۂ شباب حضرت نوح علیہ السلام سے شروع ہوا اور حضرت موسیٰ علیہ السلام پر آکر ختم ہوا۔ اس کے بعد عالم کا زمانہ کہولت شروع ہوا۔ عالم کا زمانہ کہولت قریب الختم تھا کہ ایک نبی کہل اور اولو العزم مرسل حضرت مسیح بن مریم علیہ السلام کی بعثت ہوئی۔ حق تعالیٰ نے حضرت مسیح علیہ السلام کی ایک صفت یہ بھی ذکر فرمائی:

"وَکَھلًا وَّمِنَ الصّٰلِحِیْنَ"

یہ وقت عالم کے حق میں زمانہ کہولت تھا۔ اس لئے اس وقت ایک نبی کہل کی بعثت مناسب ہوئی۔

زمانہ کہولت میں بھی لوگ انبیاء کرام کا مقابلہ کرتے رہے۔ مگر اس مقابلہ میں اتنا زور نہ تھا کہ جو قوم عاد اور قوم ثمود وغیرہ کے مقابلہ میں تھا۔ یہ قومیں اپنی جوانی میں "مَنْ اَشَدُّ مِنَّا قُوَّةً" کہہ کر انبیاء کا مقابلہ کرتے تھے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بعد بھی لوگوں نے انبیاء کا مقابلہ کیا مگر "مَنْ اَشَدُّ مِنَّا قُوَّةً"[1] کسی کی زبان پر نہ آیا اور کہاں سے آتا کفر کا زور تو حضرت موسیٰ علیہ السلام توڑ چکے تھے۔ زمانہ کہولت کا تھا، قویٰ مضمحل ہو گئے تھے اس لئے مقابلہ تو کیا مگر اس میں ایسا زور نہ تھا جیسا کہ قوم عاد اور قوم ثمود کے مقابلہ میں تھا اور نبی اکرم محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے اس عالم کا زمانہ پیری شروع ہوتا ہے چنانچہ حدیث میں ہے۔

"بعثت انا والساعة كهاتين"

تَرجَمَہ: "میں اور قیامت ساتھ ساتھ بھیجے گئے ہیں۔"

اور سبابہ اور وسطیٰ کی طرف اشارہ فرمایا، یعنی مجھ میں اور قیامت کے آنے میں اتنا فصل اور وقفہ ہے جتنا کہ ان دو انگلیوں میں ہے۔

اور اب تو زمانہ ارذل العمر کو پہنچ گیا ہے۔ امراض ہر طرف سے گھیرے ہوئے ہیں۔ ظاہری اور باطنی امراض نے اس وقت مریض خستہ جاں بلکہ نیم جاں بنا دیا ہے چند روز کا مہمان ہے، روح نکلنے کی دیر ہے، روح نکلتے ہی پھول پھٹ کر تمام عالم برابر ہو جائے گا۔

مع ہذا ہم دیکھتے ہیں کہ جو شئے اجزاء مختلفہ سے مرکب ہوتی ہے اور وہ اجزاء سب کے سب ایک جدا غرض کے لئے اور علیحدہ کام کے لئے ہوں۔ ایک جزء اپنے کارآمد

---

[1] تَرجَمَہ: "ہم سے زائد کون قوت اور زور والا ہے۔"

ہونے میں دوسرے جزء کا محتاج نہ ہو بلکہ اس کا مزاحم ہو تو وہ شئے جب اپنے کمال کو پہنچ جائے تو اس کو توڑ پھوڑ کر ہر جزء کو علیحدہ کر دیا کرتے ہیں تاکہ ہر جزء سے اس کا کام نکلے اور جس غرض اور جس مقصد کے لئے وہ جزء ہے وہ غرض اور مقصد اس سے پورا ہو ورنہ اس شئے کے مالک کو اہل عقل دائرہ عقل سے خارج کہیں گے۔ مثلاً کھیتی ایسے دو مختلف جزؤں سے مرکب ہے کہ ہر جز ایک جدا غرض کے لئے ہے۔ بھس جانوروں کے کھانے کے لئے ہے اور اناج آدمیوں کے کھانے لئے۔ اور پھر ہر چیز اپنی کارگزاری میں دوسرے کا محتاج نہیں۔ بلکہ فی الجملہ ایک دوسرے سے کام لینے میں حارج ہے۔ اب دیکھئے کہ کسان اس کو کاٹ چھانٹ توڑ پھوڑ کر کس کس طرح اور کس کس محنت ومشقت سے اناج اور بھس کو جدا جدا کرتے ہیں۔ اگر نہ کریں تو آپ ہی فرمایئے کہ لوگ انہیں کیا کہیں۔ پھر اناج کو دیکھئے کس محنت سے بھوسی اور آٹے کو الگ الگ کرتے ہیں۔ پھر جدا جدا کرنے والے کو کوئی بے وقوف نہیں کہتا۔ بلکہ اس کام کو عین مقتضائے عقل سمجھتے ہیں اور علی ہذا میوہ جات کے پوست اور مغز کو اور تخم کو علیحدہ علیحدہ کرنا، روئی کا بنولوں سے جدا کرنا سراسر ہوشیاری اور دانائی ہے۔

پس جس طرح کھیتی کو کاٹ کر گیہوں اور بھس کو جدا کرتے ہیں اور پھر ہر ایک کو علیحدہ جگہ میں رکھتے ہیں، اسی طرح اس عالم کو کہ جو خیر اور شر، نیک اور بد سے مرکب ہے اس کو بھی ایک روز ضرور توڑ پھوڑ کر نیک اور بد کو جدا کیا جائے اور پھر ہر ایک کو اپنے موقع اور محل پر پہنچایا جائے طیبین کو دار الطیبین میں خبیثین کو دار الخبیثین، میں ابرار و اخیار کو دار النعیم میں اور اشرار و فجار کو جحیم میں بھیجا جائے، نیکوں کو اسی جگہ پہنچایا جائے کہ جہاں برائی کا نام نہ ہو اور رنج وغم کا کوئی نشان نہ ہو۔ ایسی جگہ کا نام جنت اور بہشت ہے جیسا کہ مشہور ہے ؎

بہشت آنجا کہ آزارے نباشد
کسے را با کسے کارے نباشد

اور علیٰ ہذا القیاس بروں کو ایسی بری جگہ پہنچایا جائے کہ جہاں بھلائی اور راحت و آرام کا نام و نشان نہ ہو۔ اسی کو جہنم اور دوزخ کہتے ہیں۔

اثبات جنت و جہنم

دنیا کی کوئی تکلیف راحت سے اور کوئی راحت تکلیف سے خالی نظر نہیں آتی۔ منافع مضرتوں سے اور مضرتیں منافع سے خالی نہیں غذا کیسی ہی لطیف اور عمدہ کیوں نہ ہو مگر پیشاب اور پاخانہ کی تکلیف سے خالی نہیں اور دوا کیسی ہی تلخ اور بدمزہ کیوں نہ ہو وہ منافع سے خالی نہیں۔ بہر حال اس عالم میں تکلیف اور آرام نفع اور ضرر، خوشی اور غم سب مخلوط اور ملے جلے ہیں ع

الخیر والشر مقرونان فی قرن

یعنی یہاں خیر اور شر دونوں ایک ہی رسی میں بندھے ہوئے ہیں۔

جس طرح انسان کا مزاج عناصر اربعہ سے مرکب ہے۔ اسی طرح اس عالم کا مزاج تکلیف اور آرام اور نفع اور ضرر خیر اور شر دونوں سے مرکب واقع ہوا ہے۔

اور جو چیز مختلف اجزاء سے مرکب ہوتی ہے تو اس کے اجزاء کے لئے کوئی معدن اور منبع ضرور ہوتا ہے کہ ابتداء ترکیب میں ان اجزاء کو وہاں سے لیا گیا ہو اور وہ اجزاء مجتمعہ اگر منفصل ہو جائیں تو انفصال کے بعد اپنے اپنے معدن اور منبع میں پہنچ جائیں اور اپنی اپنی اصل میں جا ملیں۔

انسان میں حرارت اور برودت رطوبت اور یبوست کے آثار ظاہر ہونے سے یہ پتہ چلتا ہے کہ جسم مختلف التاثیر اور مختلف المزاج اجزاء سے مرکب ہوا ہے ورنہ ایک شے سے دو مختلف اور متضاد کیفیتوں کا پیدا ہونا محال ہے۔ پس ضروری ہے کہ ہر ایک کے لئے جدا جدا مخزن اور علیحدہ علیحدہ معدن ہو۔ اس لئے حکماء نے غور و خوض کے بعد اس کا سراغ لگایا کہ حرارت کا مخزن کرہ نار ہے۔ اور رطوبت کا معدن کرہ آب ہے

اور یبوست اور برودت کا منبع کرہ زمین اور طبقۂ ہوا ہے۔

اور جب جسم انسانی کی ترکیب کا شیرازہ بکھر جاتا ہے تو پھر تحلیل کے بعد تمام اجزاء اپنی اپنی اصل میں جا ملتے ہیں۔ اس لئے کہ تجزیہ سے یہ معلوم ہوا کہ اگر کسی جزء خاکی کو سطح زمین سے کتنا ہی بلند کیوں نہ لے جائیں جب اس کو چھوڑیں گے زمین ہی کی طرف دوڑے گا اور اگر کسی جز ہوائی کو کتنا ہی زیر آب لے جائیں جب چھوڑیں گے تو اوپر ہی جائے گا۔ آگ کا یہ حال ہے کہ اوپر کو دوڑتی ہے۔ مشعل کا سر کتنا ہی نیچے جھکایئے مگر شعلہ اوپر ہی کی طرف جائے گا۔

اسی طرح اس عالم کو کہ جس کا مزاج کلفت اور راحت، خوشی اور غم سے مرکب ہے۔ حرارت اور برودت وغیرہ کی طرح کلفت اور راحت کا جدا جدا معدن اور خوشی کا علیحدہ علیحدہ مخزن ہونا چاہئے۔ ایک معدن راحت و آرام ہو کہ جہاں تکلیف اور رنج کا نام ونشان نہ ہو۔ اسی کو اہل اسلام جنت اور بہشت کہتے ہیں اور ایک معدن کلفت اور منبع مصائب و آلام ہو کہ جہاں راحت و آرام کا نام ونشان نہ ہو۔ اسی کو اہل اسلام جہنم اور دوزخ کہتے ہیں۔ اور جب اس عالم کا شیرازہ بکھر جائے تو دونوں قسم کے اجزاء اپنے اپنے ٹھکانے پر پہنچ جائیں اور اپنی اپنی اصل سے جا ملیں۔ اخیار و ابرار یعنی نیک اپنے ٹھکانہ پر پہنچ جائیں اور اشرار و فجار یعنی بد اپنے ٹھکانے پر پہنچ جائیں۔ خلاصہ یہ کہ جس طرح حرارت و برودت یبوست اور رطوبت ان کیفیات جسمانیہ کے لئے جدا جدا طبقہ ماننا لازم ہے، اسی طرح تکلیف اور آرام کے لئے بھی علیحدہ علیحدہ طبقہ ماننا لازم اور ضروری ہے۔

اور جس طرح معدن حرارت یعنی کرہ نار کے لئے یہ ضروری ہے کہ اس میں برودت کا نام ونشان نہ ہو اور معدن برودت یعنی ہوا کے لئے یہ ضروری ہے کہ اس میں حرارت کا نام ونشان نہ ہو۔ اسی طرح معدن راحت و آرام یعنی بہشت کے لئے ضروری ہے کہ اس میں تکلیف رنج وغم کا نام ونشان نہ ہو اور معدن مصائب و آلام یعنی

دوزخ کے لئے یہ ضروری ہے کہ اس میں راحت وآرام کا نام ونشان نہ ہو۔

ایک ضروری تنبیہ

جاننا چاہئے کہ قرآن اور حدیث میں جو جنت اور جہنم کی نعمتوں اور مصیبتوں کی تفصیل آتی ہے۔ ان میں کوئی امر بھی محال اور خلاف عقل نہیں، خصوصاً جب کہ ان کا نمونہ دنیا میں بھی دکھلا دیا گیا تو پھر کوئی وجہ انکار کی نہیں۔

جو لوگ جنت اور جہنم کا مذاق اڑاتے ہیں وہ درحقیقت اپنی عقل کا مذاق اڑاتے ہیں کہ بے سوچے سمجھے ایک ممکن شئے کو محال سمجھ کر ٹھٹا کر رہے ہیں۔

﴿اَللّٰهُ یَسْتَهْزِئُ بِهِمْ وَیَمُدُّهُمْ فِیْ طُغْیَانِهِمْ یَعْمَهُوْنَ﴾[1]

ترجمہ: "اللہ ہنسی کرتے ہیں ان سے اور ترقی دیتا ہے ان کو ان کی سرکشی میں اور حالت یہ ہے کہ وہ عقل کے اندھے ہیں۔"

ملائکہ اور شیاطین کی حقیقت

امرت اور اکسیر کا ایجاد کرنا جیسا ڈاکٹر کا کمال ہے اسی طرح کسی زہر اور سم قاتل کا ایجاد کرنا بھی ڈاکٹر کا کمال ہے۔ زہر گو قاتل ومہلک ہے، مگر ڈاکٹر اس ایجاد کی وجہ سے قابل تحسین ہے۔ پس ٹھیک اسی طرح ملائکہ اور شیاطین کے ایجاد کو بھی سمجھئے۔ ملائکہ کا پیدا کرنا کمال ہے تو شیاطین اور جنات کا پیدا کرنا بھی یقیناً کمال ہے۔

ممکن ہے کہ آپ کو یہ خیال دامن گیر ہو کہ ملائکہ اور شیاطین کا وجود محض فرضی اور اختراعی ہے کہ جس کو حقیقت اور واقعیت سے کوئی علاقہ نہیں۔ اس لئے اگر ان لفظوں کی کسی قدر تشریح کر دی جائے تو غالباً نامناسب نہ ہوگا۔

انسان میں حرارت و برودت رطوبت و یبوست کے آثار ظاہر ہونے سے پتہ چلتا ہے کہ جسم انسانی مختلف اور متضاد عناصر سے مرکب ہے ورنہ ایک شئے سے دو

[1] القرآن ۱۵/۲

مختلف کیفیتوں کا پیدا ہونا محال ہے۔ پس ضروری ہے کہ ہر ایک کے لئے جدا جدا مخزن اور علیحدہ علیحدہ معدن ہو۔ اس لئے حکماء نے غور کرنے کے بعد اس کا سراغ لگایا کہ حرارت کا مخزن کرہ نار ہے اور رطوبت کا معدن کرہ آب اور یبوست و برودت کا منبع کرہ زمین اور طبقہ ہوا ہے۔ اسی طرح انسان کا کبھی طاعت اور کبھی معصیت کی طرف مائل ہونا اس کی خبر دیتا ہے کہ روح انسانی کی ترکیب ایسی دو چیزوں سے ہے کہ جو باہم مختلف اور متضاد ہیں۔ ورنہ ایک شئے سے طاعت اور معصیت کا پیدا ہونا ایسا محال ہے جیسا کہ ایک عنصر سے حرارت اور برودت کا صدور ہو، اہل اسلام منبع معصیت اور منبع کفر کو شیاطین کہتے ہیں اور مخزن طاعت اور ایمان کو ملائکہ کہتے ہیں۔ ملائکہ کا اقتضاء طبعی طاعت الٰہی ہے۔

کما قال تعالٰی شانہ: ﴿لَا يَعْصُونَ اللّٰهَ مَآ أَمَرَهُمْ وَيَفْعَلُوْنَ مَايُؤْمَرُوْنَ﴾ [1]

تَرجَمَہ: ''(فرشتے) نافرمانی نہیں کرتے اللہ کی جو بات فرمائے ان کو وہی کام کرتے ہیں جو ان کو حکم ہو۔''

اور شیاطین کا طبعی اقتضاء کفر اور معصیت۔

کما قال تعالٰی: ﴿وَكَانَ الشَّيْطٰنُ لِرَبِّهٖ كَفُوْرًا.﴾ [2]

تَرجَمَہ: ''اور شیطان ہے اپنے رب کا ناشکر۔''

اور یہ مخلوق اپنی شدید لطافت کی وجہ سے ہماری نگاہوں سے مستور ہے اور حق تعالٰی نے ہر قسم کے تشکل کی ان کو قوت عطا فرمائی ہے۔ نیز اس پر بھی قدرت عطا فرمائی ہے کہ وہ بہت ہی قلیل مدت میں زمین و آسمان کے مسافت طے کر لیتے ہیں فرق اتنا ہے کہ ملائکہ نوری ہیں اور جن اور شیاطین ناری ہیں۔ اس قسم کی مخلوق سے اگر فقط غیر مبصر ہونے کی وجہ سے انکار کر دینا جائز ہے تو خدا اور روح اور مادۂ اثیریہ جس کو ایتھر

---

[1] القرآن ۶۶/۶ [2] القرآن ۱۷/۲۷

کہتے ان سب سے غیر مبصر ہونے کی وجہ سے انکار کر دینا جائز ہونا چاہئے اور جس طرح مادۂ اثیریہ (ایتھر) مختلف شکلوں اور صورتوں کے ساتھ متشکل ہوسکتا ہے۔ اسی طرح ملائکہ اور جنات بھی مختلف شکلوں اور قالبوں میں ظاہر ہو سکتے ہیں۔ خصوصاً جب کہ اللہ تعالیٰ نے ایک عاجز اور ناتواں انسان کو کیمیاوی عمل سے لطیف کو کثیف اور کثیف کو لطیف بنانے پر قدرت عطا فرمائی ہے تو وہ قادر مطلق اگر اپنی کسی اور مخلوق یعنی ملائکہ اور جنات کو مختلف شکلوں میں ظاہر ہونے کی قدرت عطا فرمائے تو کیا تعجب ہے اور علی ہذا ملائکہ اور جنات سے ایسے افعال کا صادر ہونا جن سے انسانی قویٰ عاجز ہوں کوئی مستبعد نہیں۔ ہوا ہی کو دیکھ لیجئے کہ ایک منٹ میں بڑی بڑی عمارتوں اور بڑے بڑے درختوں کو جڑ سے اکھاڑ پھینک دیتی ہے۔ برقی قوت کے کرشموں کا مشاہدہ دنیا کر رہی ہے بڑے بڑے جہاز جن کو ہزاروں انسان مل کر بھی اپنی جگہ سے نہ ہلاسکیں۔ وہ اسی برقی اور کہربائی تار سے بسہولت اوپر اٹھالئے جاتے ہیں یہ تو بندے کی قدرت کا نمونہ ہے خدائے قادر و برتر کی قدرت کی تو کوئی حد اور نہایت ہی نہیں ہے۔ رہا یہ امر کہ وہ ایک قلیل مدت میں ایک بعید مسافت کو کس طرح طے کر لیتے ہیں تو یہ کوئی خلاف عقل نہیں۔ ہوا کی سرعت اور اس کی تیزی ایسی بدیہی ہے کہ جس کے لئے تنبیہ کی بھی حاجت نہیں۔

حکماء جدید کی تحقیق ہے کہ بجلی ایک منٹ میں پانچ سو مرتبہ زمین کے گرد گھوم سکتی ہے اور بعض ستارے ایک ساعت میں آٹھ لاکھ اسی ہزار میل حرکت کر لیتے ہیں نیز جس وقت انسان نظر اٹھا کر دیکھتا ہے تو حرکت نظر اس قدر سریع ہوتی ہے کہ ایک ہی آن میں آسمان تک پہنچ جاتی ہے اور اگر یہ آسمان حائل نہ ہوتا تو اور دور تک وصول ممکن تھا ملائکہ اور جن کا وجود اور ان کا قلیل مدت میں بعید مسافت کو طے کر لینا تمام ادیان سماوی میں مسلم رہا ہے۔ اس تقریر سے یہ فائدہ بھی نکل آیا کہ آصف بن برخیا کا ایک لمحہ میں اقصائے یمن سے اقصی شام میں بلقیس کا تخت لے آنا اور حضرت عیسی

علیہ السلام کا اس جسم عنصری کے ساتھ آسمان پر اٹھ جانا اور نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کے لئے سبع سماوات تک عروج ہو جانا کوئی خلاف عقل نہیں البتہ خارق عادت ہیں۔ اس لئے معجزہ ہیں۔

دار آخرت

جنت اور جہنم کا بقا اور دوام

حساب و کتاب کے بعد ایک گروہ کو بہشت میں اور ایک گروہ کو دوزخ میں بھیجا جائے گا۔ اور جنت اور جہنم ہمیشہ باقی رہیں گی کبھی فنا نہ ہوں گی۔ اور وہاں کا ثواب اور عذاب ابدی ہوگا، کبھی ختم نہ ہوگا۔ مؤمن اور کافر ابد تک زندہ رہیں گے۔ کسی کو موت نہیں آئے گی۔ موت کو مینڈھے کی شکل میں لایا جائے گا اور لوگوں سے کہا جائے گا کہ کیا تم اس کو پہچانتے ہو سب کہیں گے کہ ہاں جانتے ہیں۔ وہ کون ہے کہ جس نے موت کا پیالہ نہ پیا ہو اور موت کو نہ جانتا ہو۔ اس کے بعد اس کو ذبح کیا جائے گا۔ کہا جاتا ہے کہ حضرت یحییٰ علیہ السلام اس موت کے مینڈھے کو ذبح کریں گے کیونکہ حضرت یحییٰ علیہ السلام حیات سے مشتق ہے اور حیات موت کی ضد ہے۔ پھر ایک منادی آواز دے گا کہ اے اہل جنت ہمیشہ کے لئے خوش رہو کہ اب موت نہیں۔ خلود اور بقاء دائمی ہے اور اے اہل دوزخ ہمیشہ کے لئے عذاب میں رہو کہ موت نہیں۔ اہل جنت اس ندا کو سن کر اتنا خوش ہوں گے کہ جس کی کوئی حد نہیں۔ اس لئے کہ اگر موت ہوتی تو یہ شادی مرگ ہو جاتی اور اہل دوزخ اس قدر مغموم اور رنجیدہ ہوں گے کہ جس کی کوئی حد نہیں اس لئے کہ موت ہی نہ رہی کہ مر ہی جائیں اور اس مصیبت سے چھوٹ جائیں۔ اور یہ مضمون بخاری اور مسلم اور صحاح ستہ کی متعدد احادیث میں آیا ہے اور اس بارہ میں قرآن کریم کی آیتیں اور احادیث صحیحہ بکثرت موجود ہیں۔

قال تعالٰی: ﴿اِنَّ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا وَظَلَمُوْا لَمْ یَکُنِ اللّٰہُ لِیَغْفِرَ لَہُمْ وَلَا لِیَہْدِیَہُمْ طَرِیْقًا ۝ اِلَّا طَرِیْقَ جَہَنَّمَ خٰلِدِیْنَ فِیْہَآ اَبَدًا ؕ﴾ [1]

تَرجَمۂ: ''جن لوگوں نے کفر کیا یا شرک کیا ان کے لئے اللہ کی مغفرت کا حاصل ہونا ناممکن ہے اور نہ ان کو کوئی راستہ سوائے جہنم کے راستہ کے دکھلائیں گے اسی طرح وہ دوزخ میں ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے۔''

قال تعالٰی: ﴿اِنَّ اللّٰہَ لَعَنَ الْکٰفِرِیْنَ وَاَعَدَّ لَہُمْ سَعِیْرًا ۝ خٰلِدِیْنَ فِیْہَآ اَبَدًا ۚ﴾ [2]

تَرجَمۂ: ''تحقیق اللہ تعالٰی نے کافروں کو اپنی رحمت سے دور فرمایا اور ان کے لئے ایک دہکتی ہوئی آگ تیار کی ہے جس میں وہ ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے۔''

قال تعالٰی: ﴿وَمَنْ یَّعْصِ اللّٰہَ وَرَسُوْلَہٗ فَاِنَّ لَہٗ نَارَ جَہَنَّمَ خٰلِدِیْنَ فِیْہَآ اَبَدًا ۝﴾ [3]

تَرجَمۂ: ''جو شخص اللہ اور اس کے رسول کو نہ مانے تو اس کے لئے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے نار جہنم ہے۔''

قال تعالٰی: ﴿اِنَّ اللّٰہَ لَا یَغْفِرُ اَنْ یُّشْرَکَ بِہٖ وَیَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِکَ لِمَنْ یَّشَآءُ ۚ وَمَنْ یُّشْرِکْ بِاللّٰہِ فَقَدِ افْتَرٰٓی اِثْمًا عَظِیْمًا ۝﴾ [4]

تَرجَمۂ: ''اللہ تعالٰی کفر اور شرک کے جرم کو کبھی نہیں بخشیں گے اور اس سے کم درجہ کے گناہ کو جس کے لئے چاہیں گے بخش دیں گے۔ کیونکہ

---

[1] القرآن: ۴/ ۱۶۸، ۱۶۹ [2] القرآن: ۳۳/ ۶۴، ۶۵

[3] القرآن: ۷۲/ ۲۳ [4] القرآن: ۴/ ۴۸

جس شخص نے اللہ کے ساتھ شریک گردانا اس نے بڑے ہی جرم کا ارتکاب کیا جو نا قابل عفو ہے۔''

الغرض قرآن کریم کی بے شمار نصوص اور بے شمار احادیث سے ثابت ہے کہ کفار ہمیشہ جہنم میں رہیں گے اور کبھی ان کی نجات نہ ہوگی اور اسی پر تمام کا اجماع اور اتفاق ہے۔ جیسا کہ شرح مواقف اور شرح مقاصد اور کتب کلامیہ میں اس کی تصریح ہے کہ اسی پر تمام امت کا اجماع ہے اور عقل سلیم بھی اسی کو تسلیم کرتی ہیں کہ کفر اور شرک سے بڑھ کر کوئی جرم نہیں۔ احکم الحاکمین اور اس کے وزراء یعنی انبیاء اور مرسلین سے کھلی ہوئی بغاوت ہے اس کی سزا دائمی عذاب ہی ہونی چاہئے۔ جیسے ایمان کی جزاء دائمی ثواب ہے۔ نیز اگر کافر کی مغفرت ممکن ہو تو پھر انبیاء کرام کی بعثت سے کیا فائدہ ہوا اور صحیفے کس لئے نازل ہوئے اور امتوں پر عذاب کیوں آیا۔ مقصود ان سب سے کفر کا دروازہ بند کرنا ہے۔ لہٰذا اگر کافر کی مغفرت ممکن ہو تو پھر کفر کا دروازہ بند نہ ہوگا۔

علاوہ ازیں کافر کا ارادہ اور اس کی نیت یہ تھی کہ اگر عمر دائمی میسر آتی تو ہمیشہ اسی کفر پر قائم اور دائم رہتا اس کے ارادہ اور اس کی نیت کے اعتبار سے دائمی عذاب اس کے لئے تجویز ہوا۔

معاد جسمانی

تمام اہل اسلام کا عقیدہ ہے کہ معاد جسمانی حق ہے۔ کتاب اور سنت کی نا قابل تاویل نصوص سے یہ امر ثابت ہے کہ یہی بدن دوبارہ زندہ ہوں گے اور ان ہی میں روح ڈالی جائے گی۔ معاد عود بمعنی رجوع سے مشتق ہے۔ معاد دوبارہ زندہ کرنے کو اس وجہ سے کہتے ہیں کہ اجزاء بدن عدم کے بعد وجود کی طرف لوٹتے ہیں اور تفرق کے بعد اجتماع کی طرف رجوع کرتے ہیں اور روح طویل مفارقت کے بعد پھر دوبارہ بدن کی طرف واپس آتی ہے اور جسم پھر موت سے حیات کی طرف رجوع کرتا ہے

جس خداوند قدیر نے اس عالم جسمانی کو اول بار پردۂ عدم سے نکال کر وجود کا خلعت پہنایا اور نابود محض سے بود کیا۔ وہ خدا دوبارہ اسی طرح زندہ کرنے اور وجود میں لانے پر قادر نہیں؟

کما قال تعالیٰ: ﴿اَللّٰهُ يَبْدَؤُا الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيْدُهٗ﴾ [1]

ترجمہ: ''اللہ تعالیٰ ہی پہلی بار پیدا کرتا ہے اور پھر وہی دوبارہ پیدا کرے گا۔''

کما قال تعالیٰ: ﴿كَمَا بَدَاْنَآ اَوَّلَ خَلْقٍ نُّعِيْدُهٗ ۭ وَعْدًا عَلَيْنَا ۭ اِنَّا كُنَّا فٰعِلِيْنَ﴾ [2]

ترجمہ: ''جس طرح پہلی بار پیدا کیا اسی طرح دوسری بار پیدا کریں گے یہ ہمارے ذمہ وعدہ ہے ہم ضرور اس کو پورا کریں گے۔''

کفار اور اس عالم کے فنا ہونے اور پھر دوبارہ پیدا ہونے کو محال اور خلاف عقل سمجھتے تھے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اکثر بحث اسی مسئلہ پر رہتی تھی۔ اس بارہ میں جس قدر آیتیں نازل ہوئیں وہ شمار سے باہر ہیں اور اس قدر صاف اور صریح ہیں کہ کہیں تاویل کی گنجائش نہیں۔ فلاسفہ بھی معاد جسمانی کے منکر ہیں۔ وہ آسمانوں اور زمینوں کے نیست اور نابود ہونے کے قائل نہیں وہ ان کو ازلی اور ابدی سمجھتے ہیں یہ عقیدہ صریح کفر ہے۔ اس لئے کہ یہ عقیدہ رکھنا نصوص قطعیہ اور کل انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام کے اجماع کا انکار ہے۔ کما قال تعالیٰ:

﴿اِذَا السَّمَآءُ انْشَقَّتْ﴾ [3]

ترجمہ: ''جب آسمان پھٹ جائے۔''

﴿اِذَا السَّمَآءُ انْفَطَرَتْ﴾ [4]

ترجمہ: ''جب آسمان پھٹ (چر) جائے۔''

---

[1] القرآن: ۱۱/۳۰ [2] القرآن: ۱۰۴/۲۱ [3] القرآن: ۱/۸۴ [4] القرآن: ۱/۸۲

﴿وَاِذَا النُّجُوْمُ انْكَدَرَتْ ﴾ [1]

ترجمہ: ”اور جب تارے میلے ہوجائیں۔“

ان آیات میں صراحۃً آسمانوں کا پھٹنا مذکور ہے۔ اور اس قسم کی آیتیں قرآن کریم میں بکثرت موجود ہیں۔ یہ مسئلہ ضروریات دین اور قطعیات اسلام میں سے ہے۔ جو شخص اس کا انکار کرے وہ بلاشبہ کافر و مرتد ہے محض کلمۂ شہادت کا اقرار اسلام کے لئے کافی نہیں۔ جب تک دین کی تمام باتوں کو نہ مانے۔

كما قال تعالىٰ: ﴿اَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْكِتٰبِ وَتَكْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ ﴾ [2]

ترجمہ: ”کیا کتاب الٰہی کے بعض احکام کو مانتے ہو اور بعض احکام کا انکار کر کے کافر ہوتے ہو۔“

الحاصل فلاسفہ معاد جسمانی کے منکر ہیں۔ معاد روحانی کے قائل ہیں۔ تفصیل کے لئے امام رازی قدس اللہ سرہ کی کتاب الاربعین کی مراجعت کریں۔

معاد جسمانی پر بعض شکوک اور شبہات

اور ان کے جوابات

معاد جسمانی کے منکرین نے جو اعتراضات کئے ہیں ان میں سب سے زیادہ قوی اور مشہور اعتراض یہ ہے کہ جب ایک انسان دوسرے کو کھا جائے اور وہ اس کا جزو بدن بن جائے اور دونوں مل کر ایک ہو جائیں تو اگر بعثت کے وقت دونوں کو متحد الاجزاء ہو جانے کی وجہ سے ایک جسم کے ساتھ زندہ کیا جائے تو دو روحوں کا ایک انسان کے متعلق ہونا لازم آتا ہے اور اگر آکل (کھانے والے) اور ماکول (جس کو

[1] القرآن: ۸۱/۲ [2] القرآن: ۲/۸۵

کھایا گیا) کو علیحدہ علیحدہ زندہ کیا جائے اور حشر کے وقت آکل سے ماکول کے اجزاء علیحدہ کر لئے جائیں تو آکل کا بعینہٖ اور بجمیع اجزائہ حشر نہ ہوا۔ حالانکہ فرض یہ کیا گیا تھا کہ حشر بعینہٖ اور بجمیع اجزائہ ہے اور ایک اعتراض یہ ہے کہ پرانے مردوں کی لاشوں کے اجزاء اکثر زمین میں مل جاتے ہیں اور پھر اس زمین پر کاشت کرتے ہیں اور جو غلہ ان اجزاء سے مل کر اس زمین میں پیدا ہوتا ہے وہ دوسروں کی غذا بنتا ہے۔ غرض اس طرح سے بہت لوگوں کے اجزاء متحد ہو گئے۔ لہٰذا ہر شخص کا اگر علیحدہ علیحدہ اعادہ کیا جائے تو چونکہ سب کی اصل اور مادہ ایک ہے تو شئے واحد کا مختلف اشکال اور مختلف صورتوں کے ساتھ متصور اور متشکل ہونا لازم آتا ہے اور ایک اعتراض یہ ہے کہ انسان نام صورت کا ہے مادہ کا نہیں۔ کیونکہ اگر انسانی صورت باطل ہو جائے تو مادہ تو عناصر اربعہ کی طرف لوٹ جاتا ہے اور مادہ محل ثواب اور عقاب نہیں اور نہ مکلّف ہے پس جب انسان کی وہ صورت ہی باقی نہ رہی تو اس انسان کو ثواب اور عقاب نہ ہوا تو دوسرے انسان کو ثواب اور عقاب دینا لازم آتا ہے۔

جواب

جواب یہ ہے کہ بدن انسانی میں دو قسم کے اجزاء ہیں ایک اجزاء اصلیہ کہ جو اوّل سے آخر تک باقی رہتے ہیں اور دوسرے اجزاء زائدہ اور عارضہ کہ جن میں تغیر اور تبدل کمی اور زیادتی ہوتی رہتی ہے۔ جیسا انسان بچہ اور جوان اور بوڑھا ہوتا ہے اول عمر سے اخیر عمر تک زید ہی کہلاتا ہے۔ حالانکہ اس مدت میں اس کے جسم میں ہزاروں تغیر اور تبدل پیش آئے اور وقتاً فوقتاً جسم گھٹتا اور بڑھتا رہا۔ معلوم ہوا کہ زید کے اجزاء اصلیہ میں کوئی تغیر نہیں ہوا۔ صرف اجزاء زائدہ میں تغیر و تبدل ہوتا رہا پس حشر کے وقت ہر انسان کے اجزاء اصلیہ علیحدہ علیحدہ کر دیئے جاویں گے اور ہر شخص اپنے اجزاء اصلیہ کے ساتھ اٹھایا جائے گا۔ اور انسان ماکول یعنی کھایا ہوا انسان، آکل یعنی کھانے

والے کے اجزاء اصلیہ میں داخل نہیں آکل کے اجزاء اصلیہ وہ ہیں کہ جو اس انسان کے کھانے سے قبل اس میں موجود تھے۔ لہٰذا ہر شخص کا حشر اپنے اپنے اجزاء اصلیہ کے ساتھ ہوگا۔ الحمد للہ اب کوئی اعتراض وارد نہ ہوگا۔

تفصیل[۱]

تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ انسان اور بدن میں فرق ہے۔ کیونکہ بدن میں فربہی اور لاغری کی وجہ سے کمی اور زیادتی ہوتی رہتی ہے مگر انسانیت میں کوئی کمی اور زیادتی نہیں ہوتی۔ قرآن کریم میں شہداء کو زندہ کہا گیا ہے حالانکہ بدن ان کا مردہ ہے۔ نیز نصوص شرعیہ سے جن لوگوں کا مسخ ثابت ہے ان کی نسبت یہ سوال کیا جا سکتا ہے کہ وہ حالت مسخ میں انسان رہے یا نہیں۔ اگر یہ کہا جائے کہ بحالت مسخ وہ انسان باقی نہیں رہا تو یہ کہنا پڑے گا کہ وہ انسان جس کو مسخ کیا گیا وہ تو بالکل معدوم اور فنا ہو گیا اور یہ بندر اور سور جس کی صورت پر مسخ ہوا یہ حیوان از سر نو پردہ عدم سے وجود میں لایا گیا اور یہ ظاہر البطلان ہے اور اگر یہ کہا جائے کہ مسخ ہونے کے بعد انسان تو وہی ہے جو پہلے تھا مگر ہیئت وصورت بدل گئی۔ اصل حقیقت وہی ہے جو پہلے تھی تو پھر ہمارا مدعا ثابت ہے کہ انسان اس بدن اور اس ہیئت مخصوصہ کا نام نہیں۔ نیز انسان کے لئے ضروری ہے کہ وہ صاحب عقل اور صاحب ادراک ہو اور ظاہر ہے کہ بدن میں ادراک عقلی مفقود ہے۔ اس سے بھی یہ ثابت ہوا کہ انسان بدن کے مغائر ہے۔ اصل اور بالذات مدرک روح ہے۔ لیکن انسان فقط روح کا نام نہیں بلکہ انسان روح اور جسم کے مجموعہ کو کہتے ہیں اور جسم میں دو قسم کے اجزاء ہیں۔ ایک اجزاء اصلیہ کہ جو اول عمر

---

[۱] یہ تفصیل الیواقت والجواہر اور رسالہ حمیدیہ سے لی گئی ہے۔ حضرات اہل علم اگر حقائق اور معارف کے یواقیت اور جواہر چاہتے ہیں تو اصل کی طرف مراجعت کریں۔ سب کے سامنے ہی رکھے ہوئے ملیں گے کوئی مشقت نہ ہوگی الا یہ کہ دیکھنے میں مشقت محسوس کریں۔ منہ عفا اللہ عنہ۔

سے اخیر عمر تک باقی رہتے ہیں اور ان میں کوئی تغیر اور تبدل نہیں ہوتا اور دوسرے اجزاء زائدہ۔ اور انسان کے اجزاء اصلیہ وہی ذرات ہیں کہ جو حضرت آدم علیہ السلام کے پشت سے عہد لینے کے لئے نکالے گئے تھے۔

كما قال تعالىٰ: ﴿وَاِذْ اَخَذَ رَبُّكَ مِنْۢ بَنِيْٓ اٰدَمَ مِنْ ظُهُوْرِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ وَاَشْهَدَهُمْ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ ۚ اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ ۭ قَالُوْا بَلٰى ۚ﴾ [۱]

ترجمہ: ''اور جب نکالا تیرے رب نے بنی آدم کے پیٹھوں سے ان کی اولاد اور اقرار کرایا ان سے ان کی جانوں پر کیا میں نہیں ہوں تمہارا رب بولے ہاں ہم اقرار کرتے ہیں۔''

اور حدیث میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کی اولاد کو ان کی پشت سے ذرات کی ہیئت اور شکل پر نکالا۔ اور عجب نہیں کہ یہ ذرات چھوٹے ہونے کے اعتبار سے اجزاء لاتجزیٰ ہوں اور صورت اور ہیئت کے اعتبار سے انسان ہوں۔ اسی لئے اللہ تعالیٰ نے ان پر ذریت کا اطلاق فرمایا۔ ذرات کا لفظ نہیں فرمایا۔ اس لئے کہ ذریت کا اطلاق جب ہی آتا ہے کہ صورت بن چکی ہو۔

پس روح کا اصل تعلق انہیں اجزاء اصلیہ اور ذرات کے ساتھ ہے۔ انہیں سے عہد الست لیا گیا اور پیدائش کے وقت بھی روح کا اصل تعلق ان اجزاء اصلیہ کے ساتھ ہوتا ہے اور اجزاء زائدہ ملا کر جسم کو مکمل کر دیا جاتا ہے۔ اور اسی طرح نفخ صور کے بعد روح کا تعلق انہی اجزاء کے ساتھ ہوگا اور اجزاء زائدہ ملا کر شخص تام یعنی مکمل اور پورا انسان بنا دیا جائے گا اور اسی طرح سے انسان کا دوبارہ زندہ کرنا بعینہٖ اعادہ سمجھا جائے گا۔ مرنے کے بعد انسان کے اجزاء کتنے ہی متفرق اور منتشر ہو جائیں مگر اللہ کے علم ازلی اور قدیم میں اجزاء اصلیہ اور اجزاء زائدہ سب علیحدہ علیحدہ محفوظ

---

[۱] القرآن: ۷/۱۷۲

اور ممتاز ہیں۔ وہاں ذرہ برابر کوئی اختلاط اور انتشار نہیں ؎

ذرہ کو در ہوا شد یا کہ ریخت
از خزینۂ قدرت تو کے گریخت

لہٰذا ممکن ہے کہ انسان کے مرنے کے بعد اجزاء اصلیہ بمشیت ایزدی محفوظ رہیں اور جس وقت ایک حیوان دوسرے حیوان کو کھا جائے تو اجزاء اصلیہ اس کا جزء بننے سے محفوظ رہیں اور پہلے حیوان کے صرف اجزاء زائدہ دوسرے حیوان کا جزء بن جائیں اور دراصل اعتبار اجزاء اصلیہ ہی کا ہے۔ اجزاء زائدہ کا اعتبار نہیں۔ جس طرح گھاس اور درختوں کے بیج کے اجزاء ریت میں ملے رہتے ہیں اور جب بارش ہوتی ہے تو مختلف قسم کی گھاس اور مختلف قسم کے درخت اس سے اگ جاتے ہیں۔ پس حقیقی انسان جو احکام شرعیہ کا مخاطب اور مکلّف ہے وہ روح اور ان اجزاء اصلیہ کے مجموعہ کا نام ہے۔

اسی انسان سے قبر میں سوال ہوتا ہے اور یہی انسان بعینہٖ دوبارہ زندہ کیا جائے گا اور اسی کو ثواب اور عقاب ہوگا۔ اس تقریر سے بحمد اللہ تعالیٰ تمام اشکال دور ہو گئے۔ نہ دوسرے شخص کا ثواب اور عقاب لازم آیا اور نہ جسم واحد کے ساتھ دو روحوں کا متعلق ہونا لازم آیا پس اصل انسان روح اور ان ذرات کے مجموعہ کا نام ہے اور یہ ذرات اس قدر لطیف اور باریک ہیں کہ لطافت کی وجہ سے ان کا مشاہدہ بھی نہیں ہوسکتا۔ الا یہ کہ جس کو اللہ تعالیٰ دوربین نگاہ عطا فرمادیں اس کے لئے مشاہدہ ممکن ہے اور کائنات میں ہزاروں ایسی چیزیں ہیں جو اپنی لطافت کی وجہ سے حواس سے پوشیدہ ہیں۔ جیسے گیس اور ایتھر وغیرہ اور عجب نہیں کہ یہ اجزاء اصلیہ عجب الذنب میں پوشیدہ اور مخفی ہوں اور یہ اجزاء اصلیہ ساری عمر باقی رہتے ہیں اور اجزاء زائدہ کم وبیش ہوتے رہتے ہیں اور ان ہی اجزاء اصلیہ کے ساتھ جب روح کا تعلق ہوتا ہے تو حیات آتی ہے اور جب تعلق منقطع ہوتا ہے تو موت آتی ہے۔ اس تقریر سے منکرین کا ایک شبہ یہ رفع ہوگیا

کہ جس کا کان اور ناک کٹ گئی ہو وہ شخص دوبارہ کس طرح زندہ کیا جائے گا اگر اس کو ناک اور کان کے ساتھ دوبارہ زندہ کیا جائے تو بعینہٖ حشر نہ ہوا۔ اور اگر بغیر کان اور ناک کے اٹھایا جائے تو نصوص شرعیہ کے خلاف ہے۔ کیونکہ نصوص سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ زندہ ہونے والوں کے ناک اور کان سب سالم ہوں گے۔ وجہ الاندفاع ظاہر ہے اور اس قسم کے شبہات اور ان کے جوابات الیواقیت والجواہر میں بالتفصیل مذکور ہیں۔ حضرات اہل علم اصل کی طرف مراجعت فرماویں۔

فلاسفہ معاد جسمانی کے انکار پر یہ دلیل پیش کرتے ہیں کہ معاد جسمانی میں اعادہ معدوم کا لازم آتا ہے اور اعادہ معدوم کا بعینہٖ محال ہے۔

جواب: یہ کہنا کہ اعادہ معدوم محال ہے۔ محض ایک دعوی ہے جس پر کوئی دلیل نہیں۔ جس طرح ایجاد معدوم کی ممکن بلکہ واقع ہے۔ اسی طرح معدوم کی ایجاد ثانی یعنی اعادہ بھی ممکن ہوگا۔ وجود اور عدم، موت اور حیات نفس ماہیت کے عوارض میں سے ہیں نہ عین ماہیت ہیں نہ لازم ماہیت، جس طرح نوم اور یقظہ اور حرارت اور برودت کا ماہیت واحدہ پر توارد اور تعاقب جائز ہے اسی طرح وجود اور عدم کا توارد بھی ماہیت واحدہ پر جائز ہے ایجاد اور اعدام، احیاء اور اماتت کا امکان کسی خاص زمانہ پر موقوف نہیں۔ لہٰذا یہ کہنا کہ احیاء اول زمانہ سابق میں ہونے کی وجہ سے ممکن ہے اور احیاء ثانی زمانہ لاحق میں ہونے کی وجہ سے ممتنع ہے، غیر معقول ہے۔ اس لئے کہ زمانہ احیاء اور اماتت کے لئے ظرف ہے شرط نہیں۔ ہاں اگر اعادہ بشرط الزمان الاول مذہب ہوتا۔ تب بے شک استحالہ لازم آتا۔ پس جس طرح معدوم کی ایجاد زمانہ اول میں ممکن تھی۔ بعینہٖ اسی طرح دوسرے زمانہ میں اس معدوم کی ایجاد ثانی بھی ممکن ہوگی۔ زمانہ کے بدلنے سے جو ایجاد ممکن تھی وہ محال نہ بن جائے گی۔ تفصیل کے لئے شرح مواقف اور شرح مقاصد اور اتحاف شرح احیاء العلوم کی مراجعت کی جائے۔

ابطال تناسخ

ہندوؤں کے نزدیک عموماً جزا اور سزا کا طریقہ یہی ہے کہ روح بار بار اسی عالم حسی میں جون اور جنم بدلتی رہے۔ اثبات قیامت کے بعد ضرورت نہ تھی کہ تناسخ کا ابطال کیا جائے۔ لیکن طالبان حق کی تشفی اور اطمینان کے لئے کچھ دلائل مرقوم ہیں۔

دلیل اول: جب یہ ثابت ہو چکا ہے کہ تمام عالم حادث ہیں، مادہ ہو یا روح ہو۔ صفت قدم اور وجوب میں کوئی خدا کا شریک نہیں تو اب ہم یہ دریافت کرتے ہیں کہ جب پہلی مرتبہ روح کا جسم سے تعلق قائم ہوا اور مثلاً اس کو دولت یا ثروت ملی تو یہ کس عمل کا ثمرہ اور پھل ہے۔ کیونکہ جسم کے ساتھ روح کا یہ پہلا تعلق ہے، جسم نے اس سے پہلے کوئی عمل ہی نہیں کیا۔ اگر تھوڑی دیر کے لئے یہ تسلیم بھی کر لیا جائے کہ ارواح قدیمہ ہیں تو مرکبات بلا کلام سب کے نزدیک حادث ہیں۔ اور حادث کے لئے ابتدا کا ہونا ضروری ہے۔ لہٰذا سوال یہ ہے کہ روح کا جب اس پیکر جسمانی کے ساتھ پہلی مرتبہ تعلق قائم ہوا اور اس کو جو کچھ رنج وغم اور راحت و آرام پیش کیا وہ کس عمل کا ثمرہ تھا۔

دوسری دلیل: عقل کا مقتضا یہ ہے کہ دار عمل اور دار جزاء الگ الگ ہونے چاہئیں پس اگر مرنے کے بعد جزاء وسزا پانے کے لئے روح پھر اسی دنیا میں واپس آتی ہے جو کہ دارالعمل ہے، تو دارالعمل کا دارالجزاء ہونا لازم آئے گا۔ اور دنیا عمل کا مقام نہ رہے گی بلکہ جزاء وسزا کا مقام ہو جائے گا۔

تیسری دلیل: ایک روح کا غیر متناہی جون طے کرنے کے بعد اس کو یہ بھی یاد نہ رہنا کہ میں فلاں فلاں جون میں رہی ہوں سراسر محال ہے۔

کوئی شخص کتنا ہی ضعیف الحافظہ کیوں نہ ہو، لیکن اس حالت کو کہ جو اس پر سالہا سال طاری رہی ہو کبھی نہیں بھول سکتا۔

لازم تو یہ تھا کہ روح کو اپنے گزشتہ افعال بالتفصیل یاد ہوتے۔ لیکن خیر اگر بالتفصیل یاد نہ ہوں تو کم از کم بالا جمال تو یاد ہوتے۔ خصوصاً جب کہ روح واجب بالذات اور غیر فانی ہے تو اس کا علم اور دیگر صفات ضرور غیر فانی ہونے چاہئیں۔ اس لئے کہ غیر فانی کے صفات بھی غیر فانی ہوتے ہیں۔ جیسا کہ ستیارتھ پرکاش کے صفحہ۲۱۳، باب ۷ بجواب سوال ۷۹ مصرح ہے۔

ہاں جو واقعہ ایک لحہ یا دولحہ کے لئے پیش آیا ہو وہ اگر امتداد زمانہ کے باعث یاد نہ رہے جیسا کہ عہد الست تو کوئی مستبعد نہیں۔

بخلاف اس واقعہ کے کہ جو ہزار ہا مرتبہ پیش آیا، اس کا یاد نہ رہنا سراسر خلاف عقل ہے۔ بلکہ اگر کسی گزشتہ واقعہ سے ذہول بھی ہو جاتا ہے تو جب کبھی اس قسم کا واقعہ پیش آتا ہے تو فوراً یاد آجاتا ہے۔

علاوہ ازیں عہد الست قبیل تعلیم سے ہے اور تعلیم سے علم مقصود ہوتا ہے کیفیات تعلیم اور اس کے زمان و مکان کا استحضار ضروری نہیں۔ لڑکپن کے زمانہ میں جو علم حاصل کیا جاتا ہے وہ اخیر عمر تک باقی رہتا ہے۔ لیکن اس کی کیفیات یاد نہیں رہتی۔ اسی طرح عہد الست سے مقصود علم ربوبیت تھا سو وہ حاصل ہے۔ ہر شخص کی طبیعت میں علم طبعی طور پر مرموز ہے کہ خدا ہمارا رب اور مالک اور خالق ہے بخلاف جزاء وسزا کے کہ وہاں ان افعال کا یاد رہنا ضروری ہے کہ جن کہ یہ سزا ہے۔

چوتھی دلیل: جزاء وسزا سے دو مقصد ہوتے ہیں (۱) مجرم کو تنبیہ ہو جائے (۲) دوسروں کو عبرت ہو، تا کہ وہ اس قسم کے جرم کا ارتکاب نہ کریں۔

تناسخ کی صورت میں دونوں مقصد فوت ہیں۔ مجرم کو تنبیہ تو اس لئے حاصل نہیں کہ جب یہی معلوم نہیں کہ یہ کس جرم کی پاداش ہے تو پھر تنبیہ کس طرح حاصل ہو۔ جرم کا علم تو درکنار اس کو تو سابق جنم کے وجود کا تصور بھی نہیں۔

اور علی ہذا دوسری غرض بھی مفقود ہے، جب خود اسی کو اپنے عمل کا علم نہیں کہ جس

کی یہ سزا ہے تو دوسروں کو کہاں سے علم ہو کہ جس سے عبرت حاصل کریں۔

انسان جو کہ اشرف المخلوقات ہے، صاحب فہم وفراست ہے، جب اسی کے حق میں سزا و جزا کی دونوں غرضیں یعنی تنبیہ مجرم اور عبرت غیر، مفقود ہے تو حیوانات کا ذکر ہی کیا۔ جن میں نہ عقل ہے اور نہ گویائی، نہ قوت ادراکیہ ہے اور نہ قوت ممیّزہ۔

بفرض محال اگر انسان کو کسی درجہ میں تنبیہ یا عبرت حاصل ہو بھی جائے تو حیوانات میں جزاء وسزا کا کوئی مقصد کسی طرح متصور نہیں ہوسکتا۔

جب انسان ہی کو یہ علم نہ حاصل ہوسکا کہ میں کس عمل کی وجہ سے اس جون میں ہوں تو ایک حمار یا کلب کو کیسے علم ہوسکتا ہے کہ میں فلاں عمل بد کی وجہ سے اس قالب حیوانی میں آیا ہوں۔

پانچویں دلیل: اگر دوسرا جنم گزشتہ جنم کے اعمال کے جزاء وسزا کے لئے ہے تو پھر اس جنم میں اس کے کسی عمل پر کوئی اعتراض نہ ہونا چاہئے۔ اور نہ اس کی کسی بدکاری اور شہوت رانی بلکہ برے سے برے عمل پر بھی کوئی گرفت نہ ہونی چاہئے۔ اس لئے کہ اس کی یہی بہشت اور جنت ہے۔

چھٹی دلیل: بعض امراض اور تکالیف ایسی پیش آتی ہیں کہ جن کا سبب ہم کو معلوم ہو جاتا ہے مثلاً غذا کے ثقیل اور ناملائم ہونے سے بدہضمی ہو جانا، یا آب و ہوا کے غلیظ ہونے سے مزاج کا متغیر ہو جانا، مچھلی اور دودھ کے ساتھ ساتھ استعمال سے برص کا ہو جانا، شیرینی کے زیادہ استعمال سے صفراء کا پیدا ہونا۔ وغیرہ وغیرہ۔

اور جن امراض کا سبب نہیں معلوم ہوتا تو ان کے اسباب معلوم کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ جب اسباب کا علم ہو جاتا ہے تو اس کے ازالہ اور انسداد کی تدبیریں کرتے ہیں۔ یہ کوئی نہیں سمجھتا کہ یہ مرض سابق جنم کے گناہوں کا نتیجہ ہے۔

بلکہ یہ کہتے ہیں کہ مثلاً فلاں مکان کی آب و ہوا کے خراب ہونے کی وجہ سے یہ مرض پیش آیا۔ اور جب اس مکان کو بدل دیا جاتا ہے اور کسی ایسے مقام کو اختیار کرلیا

جاتا ہے کہ جہاں کی آب وہوا صاف وشفاف ہوتی ہے تو وہ مرض جاتا رہتا ہے۔

عقیدہ تناسخ کی بنا پر تو کبھی اس مرض کا علاج نہ کرنا چاہئے۔ اس لئے کہ یہ مرض جب کسی عمل سابق کی سزا ہے تو جب تک سزا پوری نہ ہو جائے گی اس وقت تک علاج بالکل عبث اور بے سود ہے۔ اس سے علم طب کا یکلخت بے کار ہونا لازم آتا ہے۔ نہ معلوم پھر وید کیوں علاج کی ترغیب دیتا ہے۔

ساتویں دلیل: والدین کا اپنی اولاد کو مارنا یا اساتذہ کا اپنے شاگردوں کو زدوکوب کرنا ساری دنیا کے نزدیک داخل تربیت وتعلیم سمجھا جاتا ہے۔ کسی عمل سابق کی جزا و سزا نہیں سمجھی جاتی۔

اسی طرح حق تعالیٰ شانہ کی طرف سے جو امراض اور تکالیف پیش آتی ہیں، اگر وہ بھی کسی تربیت اور اصلاح کے لئے ہوں تو کیا مستبعد ہے۔

آٹھویں دلیل: اس عالم کی ہر تکلیف اور آرام کو گزشتہ اعمال کی سزا و جزا قرار دینا خلاف بداہت اور مشاہدہ ہے۔ سنکھیا کھا کر مر جانا، اور تریاق کے استعمال سے اچھا ہو جانا، کسی بادشاہ اور امیر کی خدمت کر کے انعام پانا سب جانتے ہیں کہ یہ سب موجودہ عمل کی جزاء ہے۔ کسی پہلے جون کے عمل کی جزاء نہیں۔ لہٰذا ممکن ہے کہ اس دنیا میں جو کچھ راحت و آرام یا تکلیف و مصیبت پیش آتی ہے وہ اسی دنیا کے کسی عمل کی جزاء ہو۔ غایت مافی الباب ہم یہ نہ بتلا سکیں کہ یہ کون سے عمل کی جزاء ہے تو قائلین تناسخ کے نزدیک اس میں کوئی حرج نہیں۔ ان کے نزدیک ان افعال کا یاد رہنا ضروری نہیں کہ جن پر جزا و سزا مرتب ہو۔ کسی شخص کے دنبل نکلتا ہے تو یہی کہا جاتا ہے کہ گزشتہ غذاؤں کا نتیجہ ہے۔ اگرچہ بالتفصیل یہ نہ معلوم ہو سکے کہ کس وقت کی غذا کا ثمرہ ہے۔ بہر حال ہے اس دنیا کے عمل کا ثمرہ اور نتیجہ، گزشتہ جون میں کھانے کی وجہ سے دنبل نہیں نکلا۔

نویں دلیل: تناسخ کے صحیح ماننے سے حق تعالیٰ شانہ کی قدرت و مشیت اور ارادہ

ازلیہ کی تعطیل لازم آتی ہے۔ اس لئے کہ حیوانات کا اختلاف ایک مؤمن کے نزدیک حق تعالیٰ شانہ کی قدرت کے کرشمے ہیں۔ اور سب اس کے ارادہ ازلیہ کے تابع ہے۔

مگر ایک سماجی کے نزدیک یہ تمام تر اختلاف جرائم و معاصی کی وجہ سے ہے نہ اس میں خدا کی قدرت و مشیت کو دخل ہے اور نہ اس کے ارادہ اور علم و حکمت کو۔

ایک ذی ہوش اور صاحب فہم و فراست کی نظر میں عالم کا ہر ہر ذرہ اس کی قدرت کاملہ اور حکمت بالغہ کا ایک نیا کرشمہ ہے۔

مگر دیانند کی نظر میں یہ سب کچھ چوری اور زنا اور طرح طرح کے فسق و فجور کے نتائج و ثمرات ہیں۔ "سبحانہ و تعالیٰ عما یصفون"

دسویں دلیل: درحقیقت حق تعالیٰ شانہ کے منعم و محسن ہونے کا انکار ہے۔ اس لئے کہ عقیدۂ تناسخ کی بنا پر دنیا کی کوئی نعمت بھی حق تعالیٰ کا انعام و احسان نہیں بلکہ جرائم و معاصی کا احسان ہے۔

اگر جرائم و معاصی ظہور میں نہ آتیں تو گھی اور دودھ کی نعمتیں کہاں سے میسر آتیں اور سواری اور بار برداری کے لئے یہ جانور کہاں سے آتے۔

وقال تعالیٰ: ﴿هُوَ الَّذِىْ خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِى الْاَرْضِ جَمِيْعًا﴾ [۱]

ترجمہ: "اسی ذات پاک نے تمام زمین کی چیزیں تمہارے نفع کے لئے پیدا کیں۔"

وقال تعالیٰ: ﴿وَالْاَنْعَامَ خَلَقَهَا لَكُمْ فِيْهَا دِفْءٌ وَّمَنَافِعُ وَمِنْهَا تَاْكُلُوْنَ ۝ وَلَكُمْ فِيْهَا جَمَالٌ حِيْنَ تُرِيْحُوْنَ وَحِيْنَ تَسْرَحُوْنَ ۝ وَتَحْمِلُ اَثْقَالَكُمْ اِلٰى بَلَدٍ لَّمْ تَكُوْنُوْا بٰلِغِيْهِ اِلَّا بِشِقِّ الْاَنْفُسِ ۭ اِنَّ رَبَّكُمْ لَرَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ۝

[۱] القرآن: ۲/۲۹

وَالْخَيْلَ وَالْبِغَالَ وَالْحَمِيرَ لِتَرْكَبُوهَا وَزِينَةً ۚ وَيَخْلُقُ مَا لَا
تَعْلَمُونَ ۝ وَعَلَى اللّٰهِ قَصْدُ السَّبِيلِ وَمِنْهَا جَائِرٌ ۚ وَلَوْ
شَاءَ لَهَدٰكُمْ أَجْمَعِينَ ۝ هُوَ الَّذِي أَنْزَلَ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً
لَّكُمْ مِّنْهُ شَرَابٌ وَّمِنْهُ شَجَرٌ فِيهِ تُسِيمُونَ ۝ يُنْبِتُ لَكُمْ
بِهِ الزَّرْعَ وَالزَّيْتُونَ وَالنَّخِيلَ وَالْأَعْنَابَ وَمِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ
ۚ إِنَّ فِي ذٰلِكَ لَآيَةً لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُونَ ۝ وَسَخَّرَ لَكُمُ الَّيْلَ
وَالنَّهَارَ وَالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ ۚ وَالنُّجُومُ مُسَخَّرٰتٌ بِأَمْرِهٖ ۚ
إِنَّ فِي ذٰلِكَ لَآيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُونَ ۝ وَمَا ذَرَأَ لَكُمْ فِي
الْأَرْضِ مُخْتَلِفًا أَلْوَانُهٗ ۚ إِنَّ فِي ذٰلِكَ لَآيَةً لِّقَوْمٍ
يَّذَّكَّرُونَ ۝ وَهُوَ الَّذِي سَخَّرَ الْبَحْرَ لِتَأْكُلُوا مِنْهُ لَحْمًا طَرِيًّا
وَّتَسْتَخْرِجُوا مِنْهُ حِلْيَةً تَلْبَسُونَهَا وَتَرَى الْفُلْكَ مَوَاخِرَ فِيهِ
وَلِتَبْتَغُوا مِنْ فَضْلِهٖ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ ۝ وَأَلْقٰى فِي
الْأَرْضِ رَوَاسِيَ أَنْ تَمِيدَ بِكُمْ وَأَنْهٰرًا وَّسُبُلًا لَّعَلَّكُمْ
تَهْتَدُونَ ۝ وَعَلٰمٰتٍ ۚ وَبِالنَّجْمِ هُمْ يَهْتَدُونَ ۝ أَفَمَنْ
يَّخْلُقُ كَمَنْ لَّا يَخْلُقُ ۚ أَفَلَا تَذَكَّرُونَ ۝ وَإِنْ تَعُدُّوا نِعْمَةَ
اللّٰهِ لَا تُحْصُوهَا ۚ إِنَّ اللّٰهَ لَغَفُورٌ رَّحِيمٌ ۝ [1]

ترجمہ: ''اور چوپایوں کو پیدا کیا جس میں تمہارے لئے جاڑوں کا سامان ہے اور اس کے علاوہ اور بھی قسم قسم کے فوائد اور منافع ہیں اور ان میں سے تم کھاتے بھی ہو اور اس میں تمہارے لئے رونق بھی ہے۔ جب کہ شام کو ان چراگاہ سے واپس لاتے ہو اور صبح کو ان کو چراگاہ کی طرف بھیجتے ہو اور یہ جانور تمہارے بوجھ لاد کر ایسے شہر کو

[1] القرآن: ۱۶/۵ تا ۱۸

لے جاتے ہیں جہاں بدون مشقت بلا سامان کے تم خود بھی نہیں پہنچ سکتے۔ بے شک تمہارا رب بڑی شفقت اور رحمت والا ہے۔ اور تمہارے لئے گھوڑے اور خچر اور گدھے پیدا کئے تا کہ تم ان پر سوار ہو اور ان سے زینت حاصل کرو اور اللہ تعالیٰ ایسی چیزیں پیدا کرتا ہے کہ جن کی تم کو خبر بھی نہیں، اور اللہ تک پہنچاتا ہے سیدھے راستہ پر چلنا اور بعضے راستے ٹیڑھے بھی ہیں اور اگر خدا تعالیٰ چاہتا تو سب کو منزل مقصود تک پہنچا دیتا، اور اللہ ہی نے آسمان سے پانی اتارا جس سے تم پیتے ہو اور اسی سے درخت پیدا ہوتے ہیں جس میں تم جانور چراتے ہو اور اس پانی سے تمہارے لئے کھیتی اور زیتون اور کھجور اور انگور اور ہر قسم کے پھل اگاتا ہے ان میں تفکر کرنے والوں کے لئے توحید کے دلائل موجود ہیں اور زمین سے مختلف رنگتوں کی چیزیں تمہارے لئے پیدا کیں۔ اس میں نصیحت حاصل کرنے والوں کے لئے دلائل موجود ہیں اور اسی نے تمہارے لئے دریا کو مسخر کیا تا کہ تم اس میں سے گوشت کھاؤ اور اس سے موتیوں کو نکالو کہ ان کا زیور بنا کر پہنو اور تو کشتیوں کو دیکھتا ہے کہ دریا کا پانی چیرتی ہوئی چلتی ہیں اور تا کہ تم سمندر میں سفر کر کے خدا کا فضل اور اس کی روزی تلاش کرو اور اس کا شکر کرو اور اسی نے اپنی قدرت سے زمین میں مضبوط پہاڑ قائم کئے تا کہ زمین تم کو لے کر ہلائے نہیں اور تمہارے لئے نہریں اور راستے بنائے تا کہ منزل مقصود پر پہنچ سکو اور بہت سی نشانیاں بنائیں اور ستاروں سے بھی لوگ راستہ معلوم کرتے ہیں۔ پس کیا خالق اس کے برابر ہو سکتا ہے کہ جو پیدا کرنے پر قدرت ہی نہ رکھتا ہو۔ کیا پس تم اتنا بھی نہیں سمجھتے ہو اور اگر تم اللہ کی نعمتوں کو شمار کرتے

تو اس کی انواع اور اقسام کو بھی شمار نہیں کر سکتے (افراد تو در کنار) اور اللہ تعالیٰ بڑی مغفرت والے اور بڑی رحمت والے ہیں۔"

وقال تعالٰی: ﴿وَاللّٰهُ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَحْيَا بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّقَوْمٍ يَّسْمَعُوْنَ ۝ وَاِنَّ لَكُمْ فِي الْاَنْعَامِ لَعِبْرَةً ؕ نُسْقِيْكُمْ مِّمَّا فِيْ بُطُوْنِهٖ مِنْۢ بَيْنِ فَرْثٍ وَّدَمٍ لَّبَنًا خَالِصًا سَآئِغًا لِّلشّٰرِبِيْنَ ۝﴾[1]

ترجمہ: "اور اللہ ہی نے آسمان سے پانی نازل کیا پھر اس پانی سے زمین کو مردہ ہونے کے بعد زندہ کیا سننے والوں کے لئے اس میں بڑی دلیل ہے اور تحقیق جانوروں میں بھی تمہارے لئے بڑی عبرت ہے دیکھو کہ ان کے پیٹ میں جو گوبر اور خون کا مادہ ہے اس کے درمیان میں نہایت صاف اور لذیذ دودھ تم کو پینے کے لئے دیتے ہیں۔"

ستیارتھ پرکاش کے نویں باب صفحہ ۳۶۹، ۳۵ویں سوال کے جواب میں ہے۔

اس کی تجویز جیون کے کرموں کے مطابق ہوتی ہے نہ کہ کسی اور طرح اور اگر کسی اور طرح ہو تو وہ خطاوار بے انصاف ہو جائے۔

ساری دنیا کے عاقلوں کے نزدیک بلا استحقاق اور بلا کسی عمل کے کسی کے ساتھ سلوک اور احسان کرنا اعلیٰ درجہ کا جود کرم ہے مگر سوامی دیانند کے نزدیک یہ خطا اور بے انصافی ہے۔

گیارہویں دلیل: اور جب خدا منعم اور محسن ہی نہ رہا تو اس کا شکر بھی سماج کے نزدیک واجب نہ ہوگا بلکہ بجائے خدائے کریم کے معاذ اللہ ان معاصی اور جرائم کا شکر واجب ہوگا جن کی بدولت یہ طرح طرح کی نعمتیں مل رہی ہیں۔

[1] القرآن: ۱۶/۶۵، ۶۶

بارہویں دلیل: بلکہ اس عقیدہ کی بنا پر کسی منعم اور محسن کا بھی شکر واجب نہیں رہتا۔ اس لئے ممکن ہے کہ محسن کا اس جنم میں یہ احسان دوسرے شخص کے سابق جنم کے کسی احسان کی مکافات ہو۔

تیرہویں دلیل: نیز عقیدۂ تناسخ کی بناء پر صبر اور قناعت کا جو کہ اخلاق فاضلہ کی جڑ ہیں، محض لا حاصل اور لا طائل ہونا لازم آتا ہے۔

اس لئے کہ جب یہ یقین کر لیا گیا کہ یہ مصیبت اور یہ امراض اعمال سابق کی سزا ہے۔ حق تعالیٰ شانہ کے ارادہ اور مشیت سے نہیں اور نہ اس مصیبت اور مرض میں کوئی اجر ہے تو پھر صبر کرنا اور نہ کرنا سب برابر ہے۔

﴿سَوَآءٌ عَلَيۡنَآ اَجَزِعۡنَآ اَمۡ صَبَرۡنَا مَا لَنَا مِنۡ مَّحِيۡصٍ﴾[1]

ترجمہ: ”ہمارا گھبرانا اور صبر کرنا سب برابر ہے ہمارے لئے کبھی کوئی خلاصی نہیں۔“

اور علیٰ ہذا توکل و قناعت اور رضا و تسلیم یہ سب صفات فاضلہ جب ہی حاصل ہو سکتی ہیں کہ جب تمام مصائب و آلام کو اسی کی مشیت سے سمجھا جائے۔

چودہویں دلیل: نیز اس عقیدہ فاسدہ کے بنا پر خدا کی رافت و رحمت اور اس کے فضل و کرم کا انکار لازم آتا ہے اس لئے کہ معاذ اللہ جب خدا کسی کو بلا استحقاق کوئی نعمت نہیں دے سکتا اور نہ بدون جزاء اعمال سابقہ ان کے ساتھ کسی قسم کی کوئی رعایت کر سکتا ہے تو پھر بندوں پر اس کا رحم و کرم ہی کیا ہوا۔

حیرت ہے کہ ایک انسان ناتواں تو بلا کسی استحقاق کے کسی کو جو چاہے عطا کر سکے اور جس قدر چاہے رعایت کر سکے مگر خدائے رحمٰن و رحیم ایک ذرہ برابر کوئی رعایت نہ کر سکے۔

ایک مخلوق تو عمل کی مقرر جزاء سے زائد انعام دے سکے مگر خدائے کریم سوائے

---

[1] القرآن: ۲۱/۱۴

جزاء اعمال کے ذرہ برابر بھی انعام نہیں کرسکتا۔

پندرہویں دلیل: پھر جب کہ خدا سوائے جزائے اعمال کے کچھ نہیں دے سکتا تو بندوں کے دلوں میں خدا کی محبت اور اس کا عشق کیسے پیدا ہوسکتا ہے۔

جس حاکم کے متعلق یہ خیال ہو جائے کہ اس کے سامنے گو لاکھ منت و معذرت کریں مگر یہ نہ معاف کرے گا اور نہ کسی قسم کی مہربانی کرے گا تو اس سے محبت نہیں ہو سکتی۔

پس جس مسلک سے خدا کی محبت کا انقطاع ہوتا ہو اس سے زائد بے معنی اور باطل کوئی مسلک نہیں۔

جس تفصیل اور بسط وشرح سے اسلام نے اس کو واضح کیا ہے کہ محبت کا حقیقی استحقاق صرف حق تعالیٰ شانہ کو ہے کوئی مذہب اس کی نظیر نہیں پیش کرسکتا۔

اور یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم نے ذکر الٰہی کی جابجا تاکید فرمائی تاکہ حق تعالیٰ شانہ کے ساتھ علاقہ عشق ومحبت مستحکم رہے۔ **"من احب شیئا اکثر ذکرہ"** ؎

یک لحظہ زکوئے یار دوری
در مذہب عاشقاں حرام است

سولہویں دلیل: نیز جب قائلین تناسخ کے نزدیک خدا، نہ فضل وکرم کرسکتا ہے نہ اپنی رافت ورحمت سے کسی کو کچھ عطا فرما سکتا ہے اور نہ وہ عفو کریم کسی کی کوئی تقصیر معاف کرسکتا ہے تو پھر اس سے حاجات کا مانگنا اور دعائیں کرنا اور اس کے سامنے گڑگڑانا اور عفو تقصیرات کی درخواست کرنا سب لغو اور عبث ہے۔

یہ سب باتیں جب ہی صحیح ہوسکتی ہیں کہ جب اہل اسلام کی طرح خدا کو ملیک مقتدر، عفو کریم اور غفور رحیم مانا جائے ؎

اللّٰہ یغضب ان ترکت سؤالہ
وبنی آدم حین یسأل یغضب

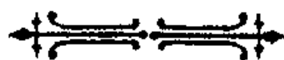
ستیارتھ پرکاش کے صفحہ ۲۹۳، باب ہفتم بجواب سوال ۴۷ سوامی دیانند کہتے ہیں کہ خدا گناہ اور پاپ معاف نہیں کرتا اگر ایسا کرے تو اس کا انصاف جاتا رہے۔ انتہی!
ایک عاجز اور ناتواں انسان اگر اپنے مجرم کا قصور معاف کر دے تو کسی عاقل کے نزدیک وہ ظالم اور غیر منصف نہیں کہلاتا مگر سوامی جی کے نزدیک معاذ اللہ خدا اگر بندہ کے گناہ معاف فرمادے تو اس کا انصاف جاتا رہے۔

مگر نامعلوم سوامی جی ایسی حالت میں علم اور پاکیزگی اور سلامتی وغیرہ کے لئے دعا کرنے کا طریق کیوں بتلاتے ہیں اس لئے کہ جب وہ نہ کچھ دے سکتا ہے اور نہ کوئی جرم معاف کر سکتا ہے تو پھر اس سے دعا مانگنا فضول ہے۔ مسئلہ دعا ستیارتھ پرکاش باب ہفتم کے صفحہ ۲۸۲، سے صفحہ ۲۸۴ تک مذکور ہے۔

سترہویں دلیل: خدا ترس لوگوں کا رنج و محن میں اور بدکار اور شریر النفس لوگوں کا راحت و آرام میں رہنا تناسخ کے بطلان کی صریح دلیل ہے۔ اس لئے کہ وہ راحت و آرام جو غفلت عن اللہ اور فسق و فجور کے ساتھ مقرون ہے وہ سابق اعمال صالحہ کی کس طرح جزاء ہوسکتی ہے، طاعت کی جزاء معصیت ہونا سراسر خلاف عقل ہے۔

رنج و غم کو آریہ سابق جنم کے اعمال سیئہ کی جزاء سمجھتے ہیں۔ مگر خدا کے عاشقین مخلصین اس کو من جانب اللہ اپنے عشق و محبت کا امتحان سمجھتے ہیں ؏

کشتگان خنجر تسلیم را
ہر زمان از غیب جانے دیگرست



خوشا وقت شوریدگان غمش
اگر ریش بینند گر مرہمش
گدایانے از بادشاہی نفور
فقیرانے اندر گدائی صبور

ہر مصیبت اور ہر رنج وغم جب کہ گزشتہ جنم کے اعمال کی سزا ہے تو آپ کے نزدیک ہر مہاتما رشی کا پاپی ہونا لازم ہوتا ہے اس لئے کہ اس دنیا میں خواہ امیر ہو یا فقیر، نیک ہو یا بد اس کی مصائب وتکالیف اس کی راحت وآرام سے بدرجہا زائد رہتی ہیں ؎

جگ میں کوئی نہ ٹک ہنسا ہوگا
کہ ہنستے ہی رو دیا ہوگا
دل زمانہ کے ہاتھ سے سالم
کوئی ہوگا جو بچ رہا ہوگا

مسئلہ نجات

عرف میں کسی مصیبت سے رستگار ہو جانے کا نام نجات ہے مگر اصطلاح شریعت میں غضب الٰہی اور قہر خداوندی سے بچ جانے کو نجات کہتے ہیں۔ یا بعنوان دیگر: آخرت کی مصائب سے بچ جانے کا نام نجات ہے۔ گفتگو اب طریق نجات میں ہے یعنی قہر خداوندی اور عذاب الٰہی سے بچنے کا کیا طریق ہے۔ نصاریٰ نے کفارہ کو طریقۂ نجات ٹھہرایا۔ اور آریوں نے آواگوان اور تناسخ کو طریقہ نجات سمجھا۔ مگر اسلام نے نجات کا ایک ایسا سہل اور عجیب وغریب طریقہ بتایا کہ جو عین فطرت اللہ کے مطابق اور عقل سلیم اور فہم مستقیم کے موافق ہے وہ یہ کہ:

اول انسان حق جل جلالہ پر ایمان لائے یعنی اس کو خدائے برحق مانے اور جن جن چیزوں کے ماننے کا اس نے حکم دیا ہے خلوص دل اور صدق زبان سے ان کی تصدیق کرے۔ دوم یہ کہ جن چیزوں کے کرنے کا اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے حکم دیا ہے ان کو بجا لائے اور جن چیزوں سے اس احکم الحاکمین نے منع فرمایا ہے اس سے پرہیز کرے اور ان کے ارتکاب کو حیات روحانی کے حق میں سم قاتل اور اپنے مولائے حقیقی

اور منعم اصلی کے درمیان میں حجاب اکبر سمجھے۔ پس جو شخص خدائے برحق پر ایمان لایا اور اس کے احکام کی اطاعت کی اور اس کی نافرمانیوں سے احتراز اور اجتناب کیا وہ اللہ کے فضل اور رحمت الٰہی سے غضب الٰہی اور عذاب خداوندی سے نجات پا گیا۔

کما قال تعالیٰ: ﴿وَوَقٰىهُمْ عَذَابَ الْجَحِيْمِ ۝ فَضْلًا مِّنْ رَّبِّكَ ؕ ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ۝﴾ [1]

ترجمہ: ”اور اللہ تعالیٰ نے ان کو عذاب دوزخ سے بچا لیا۔ محض اپنے فضل سے اور یہی سب سے بڑی کامیابی ہے۔“

باوجود ایمان اور عمل صالح کے عذاب جحیم سے نجات پانے کو خدا کے فضل کی طرف اس لئے منسوب فرمایا کہ وہ ارحم الراحمین اگر توفیق حسن نہ عطا فرماتا تو کہاں سے ایمان لاتے اور وہ اعضاء اور جوارح نہ عطا فرماتا تو کہاں سے اس کی عبادت اور بندگی کر سکتے۔

کما قال تعالیٰ: ﴿يَمُنُّوْنَ عَلَيْكَ اَنْ اَسْلَمُوْا ؕ قُلْ لَّا تَمُنُّوْا عَلَيَّ اِسْلَامَكُمْ ۚ بَلِ اللّٰهُ يَمُنُّ عَلَيْكُمْ اَنْ هَدٰىكُمْ لِلْاِيْمَانِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ۝﴾ [2]

ترجمہ: ”یہ لوگ اپنے اسلام لانے کا آپ پر احسان جتلاتے ہیں۔ آپ کہہ دیجئے کہ مجھ پر اپنے اسلام کا احسان نہ رکھو بلکہ اللہ تعالیٰ تم پر احسان جتلاتا ہے کہ اللہ ہی نے تم کو ایمان کی توفیق دی بشرطیکہ تم اس دعویٰ ایمان میں سچے ہو۔“

عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک روز میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت بابرکت میں حاضر تھا تو یہ ارشاد فرمایا کہ تجھ کو ”لا حول ولا قوة الا باللّٰه“ کی تفسیر بھی معلوم ہے؟ میں نے عرض کیا کہ اللہ اور اس کا رسول خوب

---

[1] القرآن: ۴۴/۵۶، ۵۷ [2] القرآن: ۴۹/۱۷

جاننے والے ہیں۔فرمایا کہ اس کی تفسیر یہ ہے۔

"لا حول عن معصیة اللّٰہ الا بعصمة اللّٰہ ولا قوة علی طاعة اللّٰہ الا بعون اللّٰہ" [1]

ترجمہ: "کوئی شخص اللہ کی معصیت سے بدون اللہ کی عصمت اور حفاظت کے نہیں بچ سکتا اور کوئی شخص بدون اللہ کی اعانت اور امداد کے اللہ کی طاعت نہیں کرسکتا۔"

جہاں آفرین گر نہ یاری کند
کجا بندہ پرہیز گاری کند

غزوۂ احزاب میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابۂ کرام کی زبانوں پر عبداللہ بن رواحہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے یہ کلمات جاری تھے۔

"اللھم لولا انت ما اھتدینا لا تصدقنا ولا صلینا فانزلن سکینة علینا"

ترجمہ: "اے اللہ اگر تیری توفیق نہ ہوتی تو ہم ہدایت نہ پاتے اور نہ کوئی صدقہ کر سکتے اور نہ کوئی نماز ادا کر سکتے اے اللہ تو ہم پر اپنی سکینت اور طمانینت نازل فرما۔"

شکر و احسان ترا چوں سر کنم
اندریں رہ گو قدم از سر کنم
جاں گوش و چشم ہوش و پاؤ دست
جملہ ازو ہائے احسانت پرست
ایں کہ شکر نعمت تو می کنم
این ہم از تو نعمتے شد مغتنم

---

[1] اخرجہ البزار

شکر این شکر از کجا آرم بجا
من کیم از تست توفیق اے خدا
دست و پا واین زبان ولفظ شکر
عاریت از تست بے از ہیچ نہ کر
طاعت و توفیق طاعت ہم ز تو
لطف تو برما نوشتہ صد نکو

پولوس کا خط جو افسیون کے نام ہے اس کے باب میں بالتفصیل اس کا ذکر ہے کہ ہم گمراہ تھے خدا نے اپنے فضل سے ایمان اور ہدایت ہم کو عطا کی اور اپنے فضل سے ہم کو نجات دی۔ چنانچہ باب مذکور کی آٹھویں آیت میں ہے۔

۸ تم کو ایمان کے وسیلے فضل ہی سے نجات ملی ہے اور یہ تمہاری طرف سے نہیں خدا کی بخشش ہے۔

۹ اور نہ اعمال کے سبب سے ہے تا کہ کوئی فخر نہ کرے۔

۱۰ کیونکہ ہم اسی کی کاری گری ہیں۔

توریت میں جا بجا ایمان اور عمل صالح کو مدار نجات ٹھہرایا ہے۔ چنانچہ توریت کتاب استثناء باب ۲۸ میں ہے۔

۱ اگر تو کوشش کر کے خدا کی آواز سنے تا کہ ان سب حکموں پر جو آج کے دن تجھ کو فرماتا ہوں دھیان رکھ کر عمل کرے تو تیرا خدا تجھ کو سرفراز کرے گا۔

۲ اور ساری برکتیں تجھ پر آویں گی اور تجھے پہنچیں گی۔

۳ سو تو شہر میں مبارک ہوگا اور کھیت میں بھی مبارک ہوگا الخ۔

باب مذکور کی چودہویں آیت تک خدا کے حکموں پر عمل کرنے والوں کے لئے دنیا اور آخرت کی کیا کیا برکتیں ملیں گی بالتفصیل ان کا تذکرہ ہے پھر پندرہویں آیت میں ہے۔

۱۵ کہ اگر تو اپنے خدا کی آواز کا شنوا نہ ہوگا تو ساری لعنتیں تجھ پر اتریں گی۔ اور پھر دور تک نافرمانوں کے لئے وعید اور تہدید کا سلسلہ چلا گیا۔ اور کتاب استثناء باب یازدہم آیت ۲۶ میں ہے۔

۲۶ دیکھو آج کے دن تمہارے آگے برکت اور لعنت رکھ دیتا ہوں۔ برکت جب کہ خدا کے حکموں کو مانو اور لعنت جب کہ خدا کی فرمانبرداری نہ کرو۔ الخ۔

اور کتاب استثناء کے باب چہارم اور پنجم اور ششم میں یہی مضمون بالتفصیل مذکور ہے جس کا دل چاہے دیکھ لے۔ اور انجیل متی کے باب ۱۹۔ آیت ۱۷ میں، اور انجیل مرقس کے باب ۱۰ (دہم)۔ آیت ۱۷ میں، انجیل لوقا کے باب ۱۸۔ آیت ۱۸ میں بالتفصیل مذکور ہے کہ انسان ہمیشہ کی زندگی یعنی نجات دائمی کا وارث جب ہوتا ہے کہ جب خدا کے حکموں پر عمل کرے اور انجیل متی کی باب ہفتم آیت ۲۲ میں ہے کہ آسمانی بادشاہت اس کو ملتی ہے جو خدا کی مرضی پر چلتا ہے۔ اور انجیل یوحنا باب سوم آیت ۱۶ میں ہے:

جو کوئی اس پر (حضرت مسیح علیہ السلام) ایمان لائے ہلاک نہ ہو (۱۷) بلکہ ہمیشہ کی زندگی پائے کیونکہ خدا نے بیٹے کو دنیا میں اس لئے نہیں بھیجا کہ دنیا پر سزا کا حکم کرے بلکہ اس لئے کہ دنیا کے وسیلے سے نجات پائے (۱۸) جو اس پر ایمان لاتا ہے اس پر سزا کا حکم نہیں ہوتا جو اس پر ایمان نہیں لاتا اس پر سزا کا حکم ہو چکا۔ اس لئے کہ وہ خدا کے اکلوتے بیٹے پر ایمان لایا۔ اور سزا کے حکم کا سبب یہ ہے کہ نور دنیا میں (۱۹)۔ آیا ہے اور آدمیوں نے تاریکی کو نور سے زیادہ پسند کیا اس لئے کہ ان کے نام برے تھے۔ (۲۰)۔ کیونکہ جو بدی کرتا ہے وہ نور سے دشمنی رکھتا ہے وہ نور کے پاس نہیں آتا۔ مگر جو سچائی پر عمل کرتا ہے وہ نور کے پاس آتا ہے۔

خلاصہ یہ کہ نجات کا مدار تین چیزوں پر ہے: اول ایمان، دوم اعمال صالحہ، سوم تقویٰ اور پرہیزگاری۔

قال اللّٰه عزوجل: ﴿فَاَمَّا مَنْ تَابَ وَاٰمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا فَعَسٰٓى اَنْ يَّكُوْنَ مِنَ الْمُفْلِحِيْنَ ۝﴾ [۱]

ترجمہ: ”پس جس نے کفر سے توبہ کی اور ایمان لایا اور اعمال صالحہ کیے۔ پس امید ہے کہ وہ کامیاب ہوگا۔“

﴿وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَيَخْشَ اللّٰهَ وَيَتَّقْهِ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفَآئِزُوْنَ ۝﴾ [۲]

ترجمہ: ”جو شخص اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرے اور اس کی معصیت سے بچے ایسے ہی لوگ کامیاب ہیں۔“

﴿اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ كَانَتْ لَهُمْ جَنّٰتُ الْفِرْدَوْسِ نُزُلًا ۝ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا﴾ [۳]

ترجمہ: ”تحقیق جو لوگ ایمان لائے اور عمل صالح کیے ان کے لئے جنت الفردوس ہے وہ اس میں ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے۔“

مگر جو شخص ایمان ہی نہ لائے اس کی نجات ناممکن ہے اس لئے کہ جس طرح حق جل شانہ پر ایمان لانا اور اس کو خدائے برحق ماننا اور اس کے احکام کو بے چون و چرا تسلیم کرنا نجات دائمی اور حیات جاودانی اور ہمیشہ کی زندگانی کا سبب ہے اسی طرح اسی حق جل وعلا پر ایمان نہ لانا اور اس کو جھٹلانا اور اس احکم الحاکمین کی اطاعت سے انکار کرنا اور اس کی بندگی اور فرمانبرداری کو اپنے لئے عار سمجھنا ہلاکت ابدی اور شقاوت سرمدی کا سبب ہے۔ ”اعاذنا اللّٰہ تعالٰی من ذلک“ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس سے محفوظ رکھے آمین۔

خدائے عزوجل پر ایمان لانے سے بڑھ کر کوئی نعمت اور کوئی عزت اور سر بلندی اور سرفرازی نہیں اور خدا کے ساتھ کفر کرنے سے بڑھ کر کوئی مصیبت اور کوئی ذلت و

---

[۱] القرآن: ۲۸/۶۷ [۲] القرآن: ۲۴/۵۲ [۳] القرآن: ۱۸/۱۰۷

نکبت، خواری اور رسوائی نہیں۔ شیطان لعین جو ساری دنیا کے نزدیک ملعون و مردود، رجیم و مطرود، ملوم و مدحور، مغضوب و مقہور ہے۔ وہ صرف اسی کفر اور انکار، اباء اور استکبار کی وجہ سے ہے۔

کما قال تعالیٰ: ﴿أَبَىٰ وَاسْتَكْبَرَ وَكَانَ مِنَ الْكَافِرِينَ﴾[1]

ترجمہ: ''اللہ کا حکم ماننے سے انکار کیا اور تکبر کیا اور علانیہ کافروں میں سے ہوگیا۔''

سلاطین عالم کے یہاں بھی خطا اور قصور تو معاف ہو جاتا ہے مگر بغاوت اور سرکشی اور حکومت سے مقابلہ کا جرم کبھی معاف نہیں ہوتا۔ باغیوں کی سزا سب کے نزدیک قتل یا حبس دوام ہے۔ اسی طرح جو لوگ اس احکم الحاکمین سے بغاوت کرتے ہیں اور اس کی خدائی اور فرمانروائی کو تسلیم نہیں کرتے اور نہایت بے حیائی اور ڈھٹائی کے ساتھ اس کے احکام اور وزراء یعنی انبیاء و مرسلین کا مقابلہ کرتے ہیں، ان کی سزا بھی حبس دوام کے سوا کچھ نہیں ایسے باغیوں اور سرکشوں کے لئے ایک دائمی جیل خانہ تیار کیا گیا ہے۔ اس جیل خانہ کا نام جہنم ہے۔

کما قال تعالیٰ: ﴿وَجَعَلْنَا جَهَنَّمَ لِلْكَافِرِينَ حَصِيرًا﴾[2]

ترجمہ: ''اور ہم نے کافروں کے لئے جہنم کو جیل خانہ بنایا ہے۔''

انجیل متی باب ۱۲، درس ۳۱ میں ہے کہ ہر گناہ اور کفر (یعنی کفر عملی) تو معاف کیا جائے گا۔ مگر جو کفر روح کے حق میں ہو وہ معاف نہ کیا جائے گا۔ ۱۲۔

ہاں جو شخص خدا اور اس کے رسولوں پر ایمان لایا اس کے احکام کو تسلیم کیا۔ مگر بمقتضائے بشریت اپنی جہالت اور نادانی سے کسی حکم کا خلاف کر گزرا اور کوئی گناہ اس سے سرزد ہوگیا تو اس رب کریم اور رؤف رحیم نے ہم کو یہ بشارت اور مژدہ جانفزا سنایا ہے کہ اے میرے گناہ گاروں اور خطا کار بندو! میری رافت و رحمت اور میرے عفو اور

---

[1] القرآن: ۲/۳۴ [2] القرآن: ۱۷/۸

مغفرت سے تم نا امید مت ہو میری رحمت کا دروازہ ہر وقت کھلا ہوا ہے۔ جس وقت چاہو معذرت کے لئے حاضر ہو اور عفو اور مغفرت کی استدعا اور درخواست میری بارگاہ میں پیش کرو میں ضرور تمہاری معذرت کو سنوں گا اور عفو اور مغفرت کی درخواست کو قبول کروں گا۔

كما قال تعالىٰ: ﴿وَاِنِّیْ لَغَفَّارٌ لِّمَنْ تَابَ وَاٰمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا ثُمَّ اهْتَدٰى ۝﴾ [1]

تَرجَمہ: ”اور میں بلاشبہ ہر اس شخص کو معاف کرنے والا ہوں جو توبہ کرے اور ایمان لائے اور عمل صالح کرے اور پھر ٹھیک سیدھے راستہ پر چلتا رہے۔“

كما قال تعالىٰ:

﴿كَتَبَ رَبُّكُمْ عَلٰى نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ اَنَّهٗ مَنْ عَمِلَ مِنْكُمْ سُوْٓءًا بِجَهَالَةٍ ثُمَّ تَابَ مِنْ بَعْدِهٖ وَاَصْلَحَ فَاَنَّهٗ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝﴾ [2]

تَرجَمہ: ”تمہارے پروردگار نے رحمت اور مہربانی کو اپنے اوپر لکھ لیا ہے کہ جو شخص نادانی سے برا عمل کر بیٹھے اور پھر اس کے بعد توبہ کر لے اور آئندہ اپنے اعمال کی اصلاح کر لے تو اللہ تعالیٰ کی شان یہ ہے کہ وہ بڑے ہی مغفرت فرمانے والے اور رحمت فرمانے والے ہیں۔“

كما قال تعالىٰ: ﴿وَهُوَ الَّذِیْ يَقْبَلُ التَّوْبَةَ عَنْ عِبَادِهٖ وَيَعْفُوْا عَنِ السَّيِّاٰتِ وَيَعْلَمُ مَا تَفْعَلُوْنَ ۝﴾ [3]

تَرجَمہ: ”اللہ ہی اپنے بندوں کی توبہ قبول کرتا ہے اور تمام گناہوں کو معاف کر دیتا ہے اور جو کچھ تم کرتے ہو اس کو خوب جانتا ہے۔“

---

[1] القرآن: ۸۲/۲۰ [2] القرآن: ۵۴/۶ [3] القرآن: ۲۵/۴۲

معاذ اللہ وہ غفور رحیم ایسا نہیں جیسا کہ نصاری کہتے ہیں کہ وہ خدائے قدوس جب تک گنہگاروں کی طرف سے کسی معصوم اور بے گناہ کو صلیب پر نہ چڑھا لے اس وقت تک نجات نہیں ہو سکتی۔ اور نہ معاذ اللہ وہ ایسا ہے جیسا کہ آریہ کہتے ہیں کہ بندہ ہزار گڑگڑائے اور لاکھ گریہ وزاری کرے اور اپنے گناہوں سے توبہ کرے مگر جب تک گدھا اور کتا، بندر اور سور نہ بنا لے اس وقت تک کسی طرح در گزر نہ کرے۔ "سبحانہ و تعالٰی عما یصفون" وہ ان سب باتوں سے پاک اور منزہ ہے۔

اس کا ارشاد تو یہ ہے:

کما قال تعالٰی: ﴿قُلْ يٰعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ. اِنَّ اللّٰهَ يَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِيْعًا ۭ اِنَّهٗ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ ۝﴾[1]

ترجمہ: "آپ کہہ دیجئے کہ اے بندو جنہوں نے کفر کیا اور شرک کر کے اپنے اوپر زیادتی کی ہے تم خدا کی رحمت سے ناامید مت ہو اور یہ خیال مت کرو کہ ایمان لانے کے بعد بھی کفر و شرک پر مواخذہ ہوگا بالیقین اللہ تعالٰی تمام گزشتہ گناہوں کی مغفرت فرمانے والے ہیں البتہ تم کو یہ چاہیے کہ عذاب آنے سے پہلے تم اللہ کی طرف رجوع کرو اور اسلام میں داخل ہو کر اس کے مطیع و فرمانبردار بن جاؤ عذاب آنے کے بعد تمہاری کوئی مدد نہ کی جائے گی۔"

گر کافر و گبر و بت پرستی باز آ
باز آ باز آ از کبر و مستی باز آ
ایں در گہ ما در گہ نومیدی نیست
صد بار اگر توبہ شکستی باز آ

---

[1] القرآن: ۳۹/۵۳

جس طرح ہم نے توبہ کا طریق نجات ہونا قرآن سے نقل کیا ہے اسی طرح کتب سابقہ کے بھی چند حوالے ہدیہ ناظرین کرتے ہیں۔

صحیفہ یسعیاہ باب ۵۵، آیت ۷: وہ جو شریر ہے اپنی راہ کو ترک کرے اور بدکردار اپنے خیالوں کو، اور خداوند کی طرف پھرے کہ وہ اس پر رحمت کرے گا اور کثرت سے معاف کرے گا، آہ۔

تواریخ دوم باب ۷ درس ۱۴: پس اگر میرے لوگ جو میرے نام سے کہلائے جاتے ہیں اپنے تئیں عاجزی کریں اور دعا مانگیں اور میرا منہ ڈھونڈیں اور اپنی بری راہوں سے پھریں تو میں آسمان پر سے سنوں گا اور ان کی خطائیں بخشوں گا اور ان کی زمین کو امان دوں گا۔

زبور باب ۳۲ درس اول: مبارک ہے وہ جس کا گناہ بخشا گیا اور خطا ڈھانپی گئی مبارک ہے وہ آدمی جس کے گناہوں کو خداوند حساب میں نہیں لاتا جس کے دل میں دغا نہیں۔

پھر درس پنجم میں ہے۔ میں نے تجھ پاس اپنے گناہ کا اقرار کیا میں نے کہا کہ میں خداوند کے آگے اپنے گناہ کا اقرار کروں گا سو تو نے میری بدذاتی کا گناہ بخش دیا۔

کتاب الامثال باب ۲۸ درس ۱۳: وہ جو اپنے گناہوں کو چھپاتا ہے کامیاب نہ ہوگا پر وہ جو گناہ کا اقرار کرتا ہے اور اسے چھوڑ دیتا ہے اس پر رحمت ہووے گی مبارک ہے وہ انسان جو سدا ڈرتا ہے۔ اھ۔

انجیل لوقا باب ۱۷ درس ۳: خبردار ہو اگر تیرا بھائی گناہ کرے اسے ملامت کر، اگر توبہ کرے اسے معاف کر اور اگر وہ ایک دن میں سات دفعہ تیرا گناہ کرے اور ساتوں دفعہ تیرے پاس آکر کہے کہ توبہ کرتا ہوں تو اسے معاف کر، اھ۔

تعجب کی بات ہے کہ ایک بھائی تو توبہ سے گناہ معاف کر دے مگر نصاریٰ کے نزدیک "ارحم الراحمین" توبہ کرنے والے کا گناہ معاف نہیں کر سکتا۔

انجیل لوقا باب ۱۵ درس ۳ (بھیڑوں کی تمثیل): جس کی سو بھیڑوں میں سے ایک گم ہو جائے اور پھر وہ گم شدہ بھیڑ مل جائے تو انسان کو بے حد خوشی ہوتی ہے اور دوستوں اور پڑوسیوں کو بھی اس خوشی میں شرکت کے لئے بلاتا ہے اسی طرح ننانوے راست بازوں کی نسبت جو توبہ کی حاجت نہیں رکھتے ایک توبہ کرنے والے گناہ گار کی بابت آسمان پر خوشی ہوتی ہے۔ پھر درس ہشتم میں اسی طرح کھوئے ہوئے درہم کی مثال مذکور ہے کہ جس کے پاس سو درہم ہوں اور ایک کھو جائے اور پھر مل جائے تو بے حد خوشی کرتا ہے کہ میرا کھویا ہوا درہم مل گیا۔ اسی طرح ایک توبہ کرنے والے گناہ گار کی بابت خدا کو فرشتوں کے سامنے خوشی ہوتی ہے۔

توبہ کیا ہے؟ اپنے گناہ کو برا سمجھ کر دنیا اور آخرت کی خرابی اور بربادی کا باعث جان کر فوراً اس فعل سے باز آ جانا اور پھر نہایت ندامت اور شرمساری ذلت اور انکساری کے ساتھ بارگاہ خداوندی میں عفو اور مغفرت کی درخواست کرنا اور آئندہ کے لئے سچے دل سے یہ مصمم اور پختہ ارادہ کر لینا کہ یہ کام پھر کبھی نہیں کروں گا دین محمد صلی اللہ علیہ وسلم میں اس کا نام توبہ ہے۔ محض زبان سے "استغفراللّٰه ربی من کل ذنب واتوب الیہ" (میں اللہ سے ہر گناہ کی توبہ کرتا ہوں اور اسی طرف رجوع کرتا ہوں) کہہ لینے کا نام توبہ نہیں۔ بقول رابعہ بصریہ رحمہ اللہ تعالیٰ ایسی توبہ اور استغفار تو خود توبہ اور استغفار کی محتاج ہے ہاں اگر دل کی ندامت اور شرمساری کے ساتھ زبان سے بھی توبہ اور استغفار اور اپنے قصور کا اعتراف اور اقرار کرے تو سبحان اللہ نور علی نور ہے۔

توبہ اور استغفار کے حکم اور اسرار

اس علیم و حکیم نے انسان کو خطا اور نسیان سے مرکب پیدا فرمایا ہے۔ لغزش اور تقصیر کو اس کی فطرت اور خمیر میں رکھا ہے۔ پس اگر انسانی لغزشوں اور خطاؤں کی بغیر

جزاء اور سزا خدا کی طرف سے معافی ناممکن ہو تو پھر نجات کی کوئی سبیل نہیں۔ اس صورت میں نجات ایک لفظ بے معنی رہ جاتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس علیم وحکیم نے انسان کو سراپا تقصیر اس لئے بنایا۔

۱ تا کہ خدا کی ذات ستودہ صفات کا بے عیب ہونا اس کو منکشف ہو جائے اور یہ سمجھ لے کہ میں سرتاپا عیب ہوں اور وہ قدوس وسلام تمام عیبوں سے پاک اور منزہ ہے۔

۲ اور تا کہ اس علیم وقدیر کی کمال قدرت اور کمال تصرف کا علم ہو کہ وہ مصرف القلوب کس طرح ہمارے ظاہر اور باطن میں متصرف ہے اور کس طرح ہمارے دلوں کو کبھی طاعت کی طرف پھیرتا ہے اور کبھی معصیت کی طرف، کبھی نیکی کی جانب اور کبھی بدی کی جانب۔

۳ اور تا کہ بندہ کو اپنا مجبور ومقہور ہونا معلوم ہو جائے اور یہ اس پر منکشف ہو جائے کہ بدون حق جلا وعلا کی عصمت واعانت اور بدون اس کی توفیق کے کوئی طاعت اور نیکی نہیں ہو سکتی۔ جب وہ اپنی اعانت اور توفیق روک لیتا ہے اسی وقت بندہ سے خطائیں اور لغزشیں شروع ہو جاتی ہیں۔ "لا حول ولا قوۃ الا باللّٰہ"

۴ اور تا کہ اس کی ستاری اور پردہ پوشی کا کچھ اندازہ کر سکے کہ وہ علیم وخبیر کہ جس کی بے چون وچگون نگاہ سے قلب اور سینہ کا کوئی حال مخفی نہیں وہ میری خطائیں دیکھ رہا ہے مگر پھر پردہ پوشی کر رہا ہے لوگوں میں مجھ کو رسوا نہیں کیا۔

۵ اور تا کہ اس علیم وحلیم کے علم وبردباری کا علم ہو کہ اس نے اپنے حلم وکرم سے میری خطا پر فوراً کوئی گرفت نہیں کی اگر چاہتا تو فوراً زمین میں دھنسا دیتا یا اور کسی عذاب سے ہلاک کر ڈالتا مگر وہ حلیم وکریم ہے مواخذہ میں جلدی نہیں فرماتا بلکہ مہلت دیتا ہے شاید بندہ پھر اس کی طرف رجوع کرے ؎

دو کونش یکے قطرہ در بحر علم
گنہ بیند و پردہ پوشد بحلم

اگر بر جفا پیشہ بشتافتے
کہ از دست قہرش اماں یافتے
پس پردہ بیند عملہائے بد
ہمو پردہ پوشد بالائے خود

بعض خدا کے بندے خطا اور لغزش کے بعد تھوڑی دیر کے لئے اپنی خطا اور لغزش سے تو غافل ہو جاتے ہیں مگر اس حق جل شانہ کی کریمی اور ستاری، حلیمی اور بردباری کے مشاہدہ اور مراقبہ میں مستغرق ہو جاتے ہیں جس کا ثمرہ اور نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ندامت اور خجالت، پشیمانی اور شرمساری میں اور غرق ہو جاتے ہیں اور ہر رگ و پے میں حق جل شانہ کی محبت کی لہریں دوڑنے لگتی ہیں کہ ہم تو روسیاہ اور نابکار ہیں اور وہ حلیم اور ستار ہے ؏

گنہ بیند و پردہ پوشد بحلم

گنا دیکھ رہا ہے اور اپنے حلم سے پردہ پوشی کر رہا ہے۔

۶ اور تا کہ بندہ تذلل اور تمسکن خشوع اور خضوع، عجز وانکسار، احتیاج اور افتقار کے کل مدارج و مراحل طے کر کے مولائے برحق کا کامل عبد اور بندہ بن سکے اور نفس امارہ فرعونیت کے مادہ سے بالکل پاک اور صاف ہو جائے۔

نفس حقیقت میں شیطان کا عینی اور توام بھائی ہے اس کے مزاج میں بھی وہی علو اور استکبار ہے جو ابلیس کے مزاج میں ہے جب موقع ملتا ہے فرعون کی طرح انا الحق کہہ کر خدائی کا مدعی بن جاتا ہے اور علی الاعلان اس دعوی کی نشر واشاعت کرتا ہے اور جب مجبور ہو جاتا ہے تو دعوی خدائی کو مخفی اور مضمر رکھتا ہے ؎

نفس اژدر ہاست کے مردہ است
واز غم بے آلتی افسردہ است

اسی وجہ سے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جہاد نفس کو جہاد اکبر فرمایا ہے۔ اس

لئے کہ یہ اندرونی اور قریبی دشمن ہے کفار اور مشرکین تو بیرونی دشمن ہیں اور ظاہر ہے کہ اندرونی دشمن کا استیصال زیادہ اہم اور ضروری ہے۔

وقال تعالٰی: ﴿یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا قَاتِلُوا الَّذِیْنَ یَلُوْنَکُمْ مِّنَ الْکُفَّارِ﴾ [1]

ترجمہ: ''اے ایمان والو قریب کے کافروں سے قتال کرو۔''

اس لئے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے قریبی کافر اور اندرونی دشمن یعنی نفس کے جہاد کو جہاد اکبر فرمایا۔ اسی وجہ سے آپ نفس کے شر سے پناہ مانگنے کا بہت اہتمام فرماتے تھے۔ ہر خطبہ میں نعوذ باللہ من شرور انفسنا ضرور فرماتے یعنی ہم اللہ کی اعانت اور امداد کے ذریعہ اپنے نفوس کی برائیوں سے پناہ مانگتے ہیں۔ ایک حدیث میں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم یہ دعا مانگا کرتے تھے۔

''اللهم لا تکلنی الی نفسی طرفة عین''

ترجمہ: ''اے اللہ ایک لحہ کے لئے بھی مجھ کو میرے نفس کے حوالہ اور سپرد نہ فرما۔ یعنی اگر نفس کے حوالہ ہوگیا تو سوائے ہلاکت اور کیا انجام ہوگا۔''

عبودیت کا تذلل ہی نفس کو فرعونیت کے شائبہ سے پاک کرسکتا ہے۔ تذلل کے مراتب کہ جن کے بغیر نفس کا تزکیہ نہیں ہوسکتا حسب ذیل ہے۔

پہلا مرتبہ...... ذلت احتیاج

یہ ذلت تمام مخلوق میں مشترک ہے اس لئے سبع سموات اور سبع ارضین اور کائنات کا ہر ہر ذرہ اس کا محتاج ہے اور وہ غنی حمید سب سے مستغنی اور بے نیاز ہے اس لحاظ سے ساری مخلوق اس کبیر متعال اور عزیز ذوالجلال کے سامنے ذلیل اور حقیر ہے۔

---

[1] القرآن: ۹/۱۲۳

دوسرا مرتبہ......ذلت اطاعت

یہ اختیاری تذلل ہے جو مطیعین کے ساتھ مخصوص ہے اس لئے کہ ہر مطیع اپنے مطاع کے سامنے اور عابد اپنے معبود کے سامنے ذلیل اور پست ہے۔ عبادت نام ہی اس کا ہے کہ کسی کو عظیم وجلیل سمجھ کر اس کے سامنے تذلل اور تمسکن خشوع اور خضوع اختیار کیا جائے۔

تیسرا مرتبہ......ذلت محبت

یہ ذلت محبین اور مخلصین، عشاق اور والہین کے ساتھ مخصوص ہے۔ محبت کی اساس اور بناہی ذلت پر ہے۔ ہر محب اپنے محبوب کے سامنے ذلیل وخوار ہے ؎

عاشقی چیست بگو بندہ جاناں بودن
دل بدست دگرے دادن و حیران بودن



اذل لمن اھوی لا کسب عزۃ
وکم عزۃ قد نالھا المرء بالذل

اپنے محبوب کے سامنے ذلیل ہوتا ہوں تاکہ عزت حاصل کروں اور بہت سی عزتیں ذلت ہی سے حاصل ہوتی ہیں۔ ؎

اذا کان من تھوی عزیزاً ولم تکن
ذلیلاً لہ فاقرأ السلام علی الوصول

اگر تیرا محبوب عزیز ہو اور تو اس کے سامنے ذلیل نہ ہو تو پھر وصل پر بھی سلام پڑھنا۔

چوتھا مرتبہ......ذلت خطاء وتقصیر

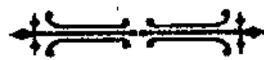
یہ ذلت گناہ گاروں کے ساتھ مخصوص ہے حق جل شانہ کی معصیت اور نافرمانی

کے بعد انسان اپنے اندر ایک خاص ذلت اور خواری کو محسوس کرتا ہے۔ جب انسان میں یہ ساری ذلتیں جمع ہو جائیں اپنے کو محتاج اور فقیر مطلق اور حق تعالیٰ شانہ کو بے نیاز اور غنی مطلق، اپنے کو بندہ اور اس کو معبود، اپنے کو محب اور اس کو محبوب، اپنے کو رو سیاہ اور خطا کار، گناہ گار اور نابکار اور اس کو غفار و ستار سمجھنے لگے تب عبودیت کا خلعت اس کو عطا ہوتا ہے کہ جس سے بڑھ کر اور کوئی خلعت نہیں ۔

لا تدعنی الا بیا عبدھا
فانه اشرف اسمائی

مجھ کو مت پکارا کرو مگر اس کا عبد اور غلام کہہ کر اس لئے کہ یہی نام میرا سب سے بہتر ہے۔ ۔

اگر یک بار گوید بندۂ من
از عرش بگذرد خندۂ من



داغ غلامیت کرد پایۂ خرد بلند
میر ولایت شود بندہ کہ سلطان خرید

۷ اور تاکہ ذنب اور معصیت میں ہونے سے نفس میں کثرت عبادت کی وجہ سے جو عجب پیدا ہو گیا ہے اس کا ازالہ ہو جائے جب نفس میں اپنی عبادت کی وجہ سے اعجاب اور خود پسندی کا مرض پیدا ہو جائے تو ایسی حالت میں ذنب اور معصیت میں مبتلا ہونا ہزار طاعتوں سے زائد نافع اور مفید ہوتا ہے۔

سب جانتے ہیں کہ بعض مرتبہ صحت اور عافیت اتنی مفید اور کار آمد نہیں ہوتی جتنی کہ مرض مفید اور کار آمد ہوتی ہے۔ اس لئے کہ مرض کے آتے ہی طبیعت علاج کی طرف متوجہ ہو جاتی ہے اور طبیب کی رائے سے تنقیہ اور مسہل لیا جاتا ہے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ فاسد مادہ خارج ہو کر طبیعت پہلے سے زائد صاف ہو جاتی ہے اور

اس کے بعد لطیف غذاؤں کے استعمال سے پہلے سے زائد قوی ہو جاتا ہے۔

اسی طرح گناہ میں مبتلا ہو کر بارگاہ خداوندی میں تضرع اور ابتہال گریہ اور زاری کرنا عجب اور خود پسندی کے مادہ فاسدہ کا بالکل استیصال کر دیتا ہے اور پہلے سے زائد بہتر ہو جاتا ہے۔ چنانچہ ایک اثر الٰہی میں ہے۔

"انین المذنبین أحب الی من تسبیح المذلین"

تَرجَمہ: "یعنی گناہ گاروں کی اوں اوں، نار والوں کی تسبیح سے میرے نزدیک زیادہ محبوب ہے۔"

۸ اور تاکہ اس کی شانِ عفو اور مغفرت کا اظہار ہو اس لئے کہ اس کے اسماء حسنی میں غفور رحیم اور عفو کریم اور تواب حکیم بھی ہے اس لئے ضرور ہے کہ دیگر اسماء حسنی کی طرح ان اسماء حسنی کے آثار بھی اس عالم میں ظاہر ہوں۔ اس محی اور ممیت نے شان اور احیا اور اماتت کے ظاہر کرنے کے لئے موت اور حیات کو پیدا فرمایا۔ تاکہ ان کے گناہوں کی مغفرت اور ان کی خطاؤں کو معاف فرمائے اگر گناہ گار نہ ہوں تو پھر مغفرت کس کی ہو اور توبہ اور معذرت کس کی قبول ہو۔ چنانچہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ایک ارشاد میں اسی طرف اشارہ فرمایا ہے:

"لو لم تذنبوا لذهب الله بكم ولجاء بقوم يذنبون ويستغفرون الله فيغفر لهم"

تَرجَمہ: "اگر تم گناہ نہ کرتے تو اللہ تعالیٰ تم کو فنا کر دیتا اور تمہارے بدلہ میں ایسی قوم لاتا کہ جو گناہ کر کے اللہ سے استغفار کرتی اور اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرماتا۔"

۹ اور تاکہ بندہ ذنب اور معصیت میں مبتلا ہو کر بارگاہ خداوندی میں تضرع اور زاری، عجز اور انکساری کے ساتھ رجوع کرے تو حق جل شانہ کی طرف سے اس کو محبوبیت کا خلعت عطا ہو حبیب اللہ کے لقب سے سرفراز ہو۔

کما قال تعالیٰ: ﴿إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ التَّوَّابِينَ وَيُحِبُّ الْمُتَطَهِّرِينَ ۝﴾ [1]

ترجمہ: ”اللہ تعالیٰ توبہ کرنے والوں اور پاک صاف رہنے والوں کو محبوب رکھتا ہے۔“

بارگاہ خداوندی میں کوئی قربت اور کوئی طاعت اس قدر پسندیدہ اور محبوب نہیں، جس قدر کہ توبہ اور استغفار، عجز اور انکسار، استدعا اور سوال، تضرع اور ابتہال اس کو پسندیدہ اور محبوب ہے اس لئے حق جل شانہ نے تمام کائنات اور تمام مخلوقات میں سے انسان کو اپنا محبوب بنایا ہے، تمام مخلوقات پر اس کو شرف اور فضیلت عطا کی، تمام کائنات کو اس کے لئے پیدا کیا اور اس کو اپنے لئے پیدا کیا۔ خود دست قدرت سے اس کو بنایا اور اپنی طرف سے خاص روح اس میں پھونکی مسجود ملائک بنایا۔ زمین کو اس کے لئے فرش اور آسمان کو چھت بنایا قسم قسم کے لذائذ وطیبات، فواکہ وثمرات زمین سے اس کے لئے اگائے ملائکہ اللہ کو ان کی حفاظت کے لئے مقرر کیا کہ سوتے جاگتے سفر اور حضر میں ان کی حفاظت کریں کہ جنات اور شیاطین ان کو اچک نہ لیں۔ علم اور معرفت، خلافت اور امامت۔ نبوت اور رسالت محبت اور خلت سے اس کو سرفراز کیا۔ ان کے دشمن اور حاسد ابلیس لعین کو مقام قرب سے نکالا اور بتلا دیا کہ یہ تمہارا کھلا دشمن ہے۔ اس سے موالات اور دوستی نہ کرنا اور اس کے بہکائے میں نہ آنا اور یہ بھی بتلا دیا کہ ہم اکرم الاکرمین اور ارحم الراحمین اور اجود الاجودین ہیں یعنی سب سے زائد کرم کرنے والے سب سے زائد رحم کرنے والے، سب سے زائد جود و انعام کرنے والے ہیں ہماری رحمت ہمارے غضب پر، ہمارا حلم ہماری عقوبت پر، ہمارا عفو ہمارے مواخذہ پر سابق اور مقدم ہے۔ ہمارے نزدیک عفو انتقام سے، رحمت عقوبت سے، فضل عدل سے کہیں زائد محبوب اور پسندیدہ ہے۔ تمام خیر ہمارے قبضہ میں ہیں رحمت

---

[1] القرآن: ۲/۲۲۲

کے بے شمار خزائن ہمارے ہاتھ میں ہیں اگر تمام آسمان اور زمین والے، اولین اور آخرین، جن اور انس، خشک اور تر سب مل کر ہم سے وقت واحد میں سوال کریں اور ہم اپنے ایک ادنی اشارہ سے سب کی حاجتیں ان کے وہم وگمان سے زائد پوری کر دیں تو ہمارے خزائن رحمت میں ایک ذرہ برابر بھی کمی نہ ہوگی۔

ہم جواد مطلق ہیں ہم باوجود غنائے مطلق اور بے نیازی کے جود اور احسان، انعام واکرام سے اس قدر مسرور اور خوش ہوتے ہیں کہ تم باوجود فقیر مطلق ہونے کے خدا کی نعمتوں کو لے کر اس کا عشر عشیر بھی مسرور اور خوش نہیں ہوتے۔ ایک شاعر اپنے بادشاہ کی مدح میں کہتا ہے ؎

کأن کل سوال فی مسامعه
قمیص یوسف فی اجفان یعقوب

سائلین کا ہر سوال بادشاہ کے کانوں کو اس قدر خوشگوار معلوم ہوتا ہے جیسا کہ یوسف علیہ السلام کا کرتہ یعقوب علیہ السلام کی آنکھوں پر ؎

اذا سالوا شکرتهم علیه
وان سکتوا سالتهم سئولا

اگر لوگ تجھ سے سوال کرتے ہیں تو سائلین کا ممنون اور مشکور ہوتا ہے اور اگر خاموش رہتے ہیں اور تجھ سے سوال نہیں کرتے تو تو ان سے سوال کا سوال کرتا ہے یعنی تو ان سے یہ درخواست اور سوال کرتا ہے کہ آؤ میں جواد اور کریم ہوں مجھ سے سوال کرو اور مانگو۔

دیکھا مخلوق کو انعام اور احسان کس درجہ لذیذ اور خوشگوار ہے تو اس سے کچھ اندازہ لگاؤ کہ ارحم الراحمین اور اجود الاجودین کو انعام واحسان کس درجہ محبوب اور پسندیدہ ہوگا فقراء اور مساکین انعام لے کر اس قدر خوش نہیں ہوتے جتنا کہ سخی اور کریم لوگ انعام دے کر مسرور ہوتے ہیں۔ مساکین اس کریم کی دی ہوئی نعمت کی مسرت اور خوشی میں

مشغول ہیں ان کو معلوم نہیں کہ منعم اور محسن کا قلب کس قدر فرحت اور مسرت سے لبریز ہے بندہ جب اپنے ہم جنس کی فرحت اور مسرت کا کما حقہ اندازہ نہیں کرسکتا تو اس اجود الاجودین اور اکرم الاکرمین کے جود وکرم کے بے چون و چگون مسرت کا کہاں اندازہ کرسکتا ہے۔ چنانچہ انجیل لوقا باب ۱۵، درس ۲۳، میں حضرت مسیح علیہ السلام سے کھوئے ہوئے بیٹے کی تمثیل ذکر کی گئی ہے کہ ایک باپ کے دو بیٹے تھے ایک فرمانبردار اور دوسرا نافرمان۔

چند روز بعد وہ نافرمان بیٹا نادم ہوکر باپ کے پاس واپس اپنے قصور کا اقرار کرنے کے لئے آہی رہا تھا کہ باپ کو ترس آیا۔

۲۱ اور دوڑ کر اس کو گلے لگالیا اور بوسے لئے اور اس کے لئے عمدہ لباس اور نیا جوتہ اور نئی انگوٹھی تیار کرائی اور خوشی میں ایک پلا ہوا بچھڑا ذبح کیا اور احباب کی دعوت کی اور کہا کہ آؤ ہم سب کھا کر خوشی منائیں کیونکہ یہ میرا بیٹا مردہ تھا اب زندہ ہوا، کھویا ہوا تھا اب ملا ہے۔ بتیسویں درس تک اس تمثیل کا ذکر ہے۔

اسی طرح خاتم الانبیاء محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مثال بیان فرمائی ہے کہ ایک شخص اونٹنی پر سوار تھا، اسی پر اس کا ناشتہ اور اس کا پانی تھا ایک لق و دق میدان میں ایک درخت کے نیچے اترا، وہاں آرام کیا سوکر جو اٹھا تو دیکھا کہ اونٹنی ندارد ہے سخت حیران اور پریشان ہوا۔ بہت تلاش کیا کہیں نام ونشان نہ ملا جب بالکل ناامید ہوگیا اور سمجھ لیا کہ اب زندگی محال ہے یکا یک دیکھتا ہے کہ اونٹنی چلی آرہی ہے اور ناشتہ اور پانی سب اسی طرح موجود ہے اس حالت میں جو گم شدہ اونٹنی ملنے کی اس کو مسرت اور فرحت ہوتی ہے حق جل شانہ کو جب اس کا گم شدہ بندہ تائب ہوکر واپس آتا ہے اس سے لاکھ درجہ بڑھ کر مسرت اور خوشی ہوتی ہے۔

خلاصہ یہ کہ انسان کی جو شان ہے وہ کسی مخلوق کی نہیں اور رب العالمین کا محبوب ہے اس پر خدا کا جو فضل وکرم مبذول ہوا وہ کسی مخلوق پر نہیں ہوا۔ ماں اپنے بچے پر وہ

رحم نہیں کر سکتی جو اس ارحم الراحمین نے اپنے بندوں پر فرمایا۔ اس پر بھی اگر بندہ اپنے مولا اور منعم سے سرتابی کرے اور اس کو چھوڑ کر اس کے دشمن یعنی شیطان سے موالات اور دوستی شروع کر دے تو کیا اس ارحم الراحمین کو شاق نہ گزرے گا۔

مادر مہربان

جس ماں نے بچے کو ہزار ناز و نعمت میں پرورش کیا ہو اگر وہ بچہ ماں کی اطاعت نہ کرے تو ماں اس کو گھر سے نکال کر دروازہ بند کر لیتی ہے لیکن اگر وہ بچہ یہ سمجھ کر کہ میں نے غلطی کی، مادر مہربان سے زائد میرے لئے کوئی شفقت اور مہربانی کرنے والا نہیں۔ یہ سمجھ کر نہایت ندامت اور شرمساری کے ساتھ واپس ہوا، اور دروازہ کی چوکھٹ پر سر رکھ کر نہایت ندامت کے ساتھ اپنے قصور کی معذرت کرنے لگا، اور یہ کہنے لگا کہ اے ماں تجھ سے زائد میرا کوئی شفیق اور مربی نہیں مجھ سے قصور ہوا آئندہ سے ایسا نہ ہوگا اس وقت ماں کی مسرت اور خوشی کا حال نہ پوچھو کہ اس کا بھاگا ہوا لخت جگر اور نور بصر پھر واپس آگیا۔ فرط مسرت اور جوش محبت میں بچے کو سینہ سے چمٹا لیتی ہے۔ اور یہ کہتی ہے کہ اے میرے نادان بچے تو کہاں چلا گیا تھا۔ میرے سوا تیرا کہاں ٹھکانہ تھا۔ مجھ سے زائد تیرا کون شفیق اور مہربان اور خیر خواہ اور ہمدرد تھا۔

اسی طرح جب خدا کا بھاگا ہوا بندہ اور اس کا حبیب مخصوص اس کے جود و کرم اور اس کے بے شمار آلاء و نعم کو یاد کر کے پھر واپس آتا ہے اور خدا کے در پر سر رکھ کر نہایت تضرع اور زاری اور عجز اور انکساری، ندامت اور شرمساری سے اپنے قصور کی معافی چاہتا ہے اور یہ عرض کرتا ہے کہ اے میرے پروردگار تیرے سوا میرا کوئی ماوی و ملجا نہیں، تیرے سوا میرا کوئی سہارا اور پناہ نہیں۔ تو ارحم الراحمین اور تواب و رحیم اور جواد کریم ہے۔ ہم تیرے فضل کے محتاج ہیں اور تو ہمارے عقاب سے مستغنی اور بے نیاز ہے۔ تیری بارگاہ میں عفو انتقام سے زیادہ محبوب، رحمت عقوبت سے زیادہ پسندیدہ ہے

فضل عدل سے زیادہ تجھ کو عزیز اور پیارا ہے۔

اس وقت حق جل شانہ کی رحمت واسعہ کا دریا اس قدر جوش میں آجاتا ہے کہ ماں کے جوش محبت کو اس دریائے رحمت سے وہ نسبت نہیں ہوتی جو ایک قطرہ کو دریا کے ساتھ ہے کیونکہ وہ ارحم الراحمین ماں سے کہیں زائد مہربان ہے جیسا کہ حدیث میں ہے۔

"للّٰہ ارحم بعبادہ من الام بولدھا"

ترجمہ: "اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پر ماں سے کہیں زائد مہربان ہے۔"

اس وقت ارحم الراحمین یہ فرماتے ہیں کہ اے بندے میں نے تیرا قصور معاف کیا اور اپنے غضب کو رضا اور خوشنودی سے اور شدت کو رحمت سے اور عقوبت کو عفو سے اور مواخذہ کو حلم اور بردباری سے اور تیری سیئات کو حسنات سے بدل دیا۔

کما قال تعالیٰ: ﴿اِلَّا مَنْ تَابَ وَاٰمَنَ وَعَمِلَ عَمَلًا صَالِحًا فَاُولٰٓئِكَ يُبَدِّلُ اللّٰهُ سَيِّاٰتِهِمْ حَسَنٰتٍ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ۝﴾[1]

ترجمہ: "جس شخص نے توبہ کی اور ایمان لایا اور اعمال صالحہ کئے۔ ایسے لوگوں کی برائیوں کو اللہ نیکیوں سے بدل دیتا ہے۔"

اس لئے کہ جب توبہ کرنے والے نے ہر سیئہ کو ندامت اور پشیمانی، خجالت اور شرمساری سے بدل دیا تو اللہ جل شانہ نے اپنی رحمت سے ہر سیئہ کو حسنہ سے بدل دیا۔

اور ابلیس لعین جب دیکھتا ہے کہ بندہ پر ندامت اور شرمساری اور آہ وزاری کے ساتھ توبہ کرنے پر ارحم الراحمین کی جانب سے یہ رحمتیں برس رہی ہیں تو غیظ وغضب سے اپنے سر پر خاک ڈالنے لگتا ہے اور ابلیس لعین بندہ سے گناہ کرا کر اس قدر پچھتاتا ہے کہ بندہ بھی خود اس قدر نادم اور پشیمان نہیں ہوتا۔ اس حاسد ازلی کو یہ گوارا نہیں کہ

[1] القرآن: ۲۵/۷۰

بندہ گناہ کے بعد پھر بارگاہ خداوندی میں تقرب اور محبت کے ساتھ سرفراز ہو۔ چنانچہ کتاب یسعیاہ باب اول۔ درس ۱۶ میں ہے۔

اپنے برے کاموں کو میری آنکھوں سے دور کرو بدفعلی سے باز آؤ۔ نیکو کاری سیکھو۔ خداوند کہتا ہے اگر چہ تمہارے گناہ قرمزی ہوویں پر برف کی مانند سفید ہو جائیں گے اور ہر چند وہ ارغوانی ہوویں پر اون کی طرح اجلے ہوں گے۔ آہ۔

اس عبارت کا صاف مطلب یہی ہے کہ جو شخص بدی سے باز آ جائے یعنی برے کاموں سے توبہ کرے اور نیکو کار بن جائے اور اعمال صالحہ کرنے لگے تو اس کی سیئات کو حسنات سے بدل دیا جائے گا۔ توبہ اور استغفار کے یہ اسرار ہم نے حافظ شمس الدین ابن قیم قدس اللہ سرہ کی مدارج السالکین سے اقتباس کر کے ہدیہ ناظرین کئے ہیں۔ اب اصل مقصد کی طرف رجوع کرتے ہیں۔

اصل مقصد کی طرف رجوع

خلاصہ یہ کہ گناہ گار کی نجات کا ایک طریقہ توبہ اور استغفار ہے جو عین فطرت اور عقل سلیم کے مطابق ہے۔

آریہ لوگ توبہ اور استغفار کی حقیقت اور اس کے اسرار سے بالکل بے خبر ہیں۔ اس لئے وہ توبہ کی منکر ہیں۔ چنانچہ دیانند جی ستیارتھ پرکاش صفحہ ۲۹۲ میں لکھتے ہیں کہ:

توبہ سے گناہ معاف نہیں ہو سکتے۔ اس لئے کہ خدا منصف ہے کبھی ظلم نہیں کرتا۔ گناہ معاف کرنے سے تو بے انصاف ہوتا ہے جیسا گناہ ہوا ایسی ہی سزا دینی منصف کا کام ہے۔ انتہی کلامہ: سبحان اللہ! کیا دانائی اور فراست ہے کہ اگر خدا توبہ اور معذرت سے بندوں کے قصور معاف فرما دے تو ظلم ہو جائے مگر دیانند جی کو یہ معلوم نہیں ظلم کے معنی دوسروں کے حق تلف کرنے کے ہیں، دوسروں کے حق نہ دلوانا بے شک ظلم ہے مگر اپنے حق کا معاف کر دینا دنیا میں کسی عاقل کے نزدیک ظلم نہیں۔

اور اگر بالفرض اپنا حق معاف کر دینا بھی ظلم ہے تو پھر بتلائیں فضل و کرم کیا چیز ہے؟ ہاں یہ صحیح ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے عدل کی وجہ سے بندوں کے حقوق توبہ سے معاف نہیں فرماتا بلکہ اس میں اپنی شان عدل سے ایک دوسرے کے حقوق ضرور دلائے گا۔ اپنے حقوق میں رحم و کرم فضل اور احسان سے کام لیتا ہے بندوں کے حق میں عدل اور انصاف سے کام لیتا ہے بلکہ اگر حق تعالیٰ شانہ اپنے فضل سے حقوق العباد بھی معاف فرمادیں تو بھی خلاف عدل نہیں اس لئے کہ وہ مالک ہے اور سب اسی کے مملوک ہیں پس حقوق العباد کا بھی حقیقۃً وہی مالک ہے اگر آقا اپنے غلام کے قرضہ کو معاف کر دے تو کوئی ظلم نہیں۔ پنڈت جی کے نزدیک خدا کو اپنے حقوق سے بھی درگزر کرنے کا حق نہیں۔ حالانکہ ساری دنیا کے نزدیک اپنے حقوق سے درگزر کرنا عین لطف و کرم ہے، لالہ جی بھی اگر چاہتے ہیں (مگر بہت ہی کم) تو اپنا حق کبھی نہ کبھی معاف کر ہی دیتے ہیں۔ مگر معاذ اللہ خدا کو اتنا بھی اختیار نہیں جتنا کہ ایک لالہ جی کو ہے، خدا اگر معاف کر دے تو دائرہ عدل و انصاف سے نکل جاتا ہے۔ پنڈت جی کے نزدیک صاحب حق پر اپنے حق کا تقاضہ لازم اور واجب ہے اگر صاحب حق تقاضہ نہ کرے تو یہ عدل اور انصاف کے خلاف ہے۔

پنڈت جی ذرا غور سے کام لیں اور سوچیں کہ جس طرح ذات خداوندی تمام موجودات کی اصل ہے اسی طرح کمالات خداوندی کمالات مخلوق کی اصل ہیں۔ مخلوق میں جو کمال ہے وہ اسی کے کمال کا پرتو اور عکس ہے۔ آفتاب میں اگر نور نہ ہوتا تو زمین کہاں سے منور ہوتی۔ اسی طرح اگر خالق میں کمال نہ ہوتا تو مخلوق میں کہاں سے کمال آتا۔ جود و کرم فضل اور احسان عفو تقصیرات اپنے مجرموں کی خطاؤں کا معاف کرنا بالاتفاق صفات کمال ہیں اور بسا اوقات یہ کہتے ہیں ؎

در عفو لذتے ست کہ در انتقام نیست

تو پھر خدا کی ذات منبع الکمالات کے لئے یہ صفت کمال تسلیم کرنے میں کیوں

تامل ہے۔ علاوہ ازیں اگر توبہ سے قصور معاف نہیں ہو سکتے تو پھر پنڈت جی بتلائیں کہ خدا کے سامنے رونے اور گڑگڑانے اور دعائیں مانگنے سے کیا فائدہ اگر وہ تمہاری توبہ قبول کر لے اور دعا کو سن لے تو تم اس کو ظالم ٹھہرانے کو تیار ہو۔ پنڈت جی لکھتے ہیں کہ دھرم کی پابندی چونکہ بغیر خدا کی مدد اور اعانت کے نہیں ہو سکتی۔ اس لئے ایشور سے اس طرح دعا مانگنی چاہئے۔

اے اگنی (پرمیشور) عہد و صداقت کے مالک و محافظ! میں سچے دھرم پر چلوں گا اے پرمیشور مجھے سچے نیک چلن اور دھرم پر عمل کرنے کی طاقت ہو۔ میرا یہ سچ دھرم کا عہد آپ کی عنایت سے پورا ہو۔ عہد یہ ہے کہ میں آج سے سچے دھرم کی پابندی اور جھوٹ کھوٹے چال چلن سے دوری اختیار کرتا ہوں۔

بجر وید ادھیائے۔ ا۔ منتر، ۵۰۔

خدا سے یہ عہد کرنا کہ میں تیری اطاعت کروں گا اور تیری نافرمانی سے بچوں گا اسی کا نام توبہ ہے، جس کے پنڈت جی منکر ہیں۔ نیز پنڈت جی ستیارتھ پرکاش صفحہ ۲۵۲۔ باب ہفتم کے ۱۴ سوال کے جواب میں لکھتے ہیں کہ:

"خدا کی حمد اور ثنا اور مناجات سے بھی مکتی یعنی نجات حاصل ہو سکتی ہے۔"

لہٰذا توبہ سے بدرجہ اولیٰ نجات حاصل ہونی چاہئے اس لئے کہ توبہ میں ندامت اور پشیمانی اور اپنے عجز و انکساری اور خدائے عز وجل کی عظمت و جلال اور اس کی شان استغناء اور بے نیازی کو ملحوظ رکھ کر خدا کی حمد اور ثنا ہوتی ہے۔

نجات کا دوسرا طریقہ

جس طرح توبہ موجب نجات ہے اسی طرح اعمال صالحہ بھی موجب نجات ہیں۔ دنیا میں اگر کسی سے کوئی قصور ہو جاتا ہے تو بعض اوقات اس شخص کے گزشتہ کارنامے ہی اس قصور کی معافی کا سبب بن جاتے ہیں ۔

واذا الحبیب اتی بذنب واحد
جاءت محاسنہ بالف شفیع

جب دوست سے کوئی گناہ صادر ہو جاتا ہے تو اس کے محاسن ہزار شفیع بن کر سامنے آجاتے ہیں۔

اسی طرح جب کسی سے خدا کا کوئی گناہ صادر ہو جاتا ہے تو اس کے گزشتہ اعمال صالحہ اور مخلصانہ کارنامے جو اس نے اللہ کے لئے کئے تھے اور خدا کی راہ میں جو جان و مال سے جان نثاری کی تھی وہ سب اس کی شفاعت کرتے ہیں اور اس کے قصور کا کفارہ بن جاتے ہیں۔

کما قال تعالیٰ: ﴿اِنَّ الْحَسَنٰتِ یُذْهِبْنَ السَّیِّاٰتِ﴾[1]

ترجمہ: ”بے شک نیکیاں برائیوں کو مٹا دیتی ہیں۔“

﴿وَمَنْ یُّؤْمِنْۢ بِاللّٰهِ وَیَعْمَلْ صَالِحًا یُّكَفِّرْ عَنْهُ سَیِّاٰتِهٖ وَیُدْخِلْهُ جَنّٰتٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِیْنَ فِیْهَاۤ اَبَدًا ؕ ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِیْمُ ۝﴾[2]

ترجمہ: ”جو شخص اللہ پر ایمان لائے اور عمل صالح کرے اللہ تعالیٰ اس کے گناہوں کا کفارہ ادا کرے گا اور اس کو جنت کے باغوں میں داخل کرے گا جس کے نیچے سے نہریں جاری ہوں گی جن میں ایسے لوگ ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے اور یہی بہت بڑی کامیابی ہے۔“

انجیل متی باب ۶ درس ۱۴ میں ہے ”اگر تم آدمیوں کے قصور معاف کرو گے تو تمہارا آسمانی باپ بھی معاف کرے گا (۱۵) اور اگر تم آدمیوں کے قصور معاف نہ کرو گے تو تمہارا باپ بھی تمہارے قصور معاف نہ کرے گا“ اھ۔

معلوم ہوا کہ نیک عمل کی وجہ سے گناہ معاف ہوتے ہیں اس لئے کہ قصور کا

[1] القرآن: ۱۱/۱۱۴ [2] القرآن: ۶۴/۹

معاف کرنا ایک نیک عمل ہے "کَمَا تَدِینُ تُدَان" جیسا عمل کرو ویسی جزا ملے گی۔

اور انجیل لوقا باب ۷ درس ۴۷ میں ایک عورت کا واقعہ مذکور ہے کہ جس کے گناہ حضرت مسیح علیہ السلام کی تعظیم وتکریم کی وجہ سے معاف ہوئے کہ نبی کی تعظیم اعلیٰ درجہ کا نیک عمل ہے انجیل لوقا باب ۱۹ اب درس ۸ میں ہے:

"اے خداوند دیکھ میں اپنا آدھا مال غریبوں کو دیتا ہوں اور اگر کسی کا ناحق کچھ لے لیا ہے تو اس کو چوگنا ادا کرتا ہوں۔ یسوع نے اس سے کہا کہ آج اس گھر میں نجات آئی۔ اھ"

اس آیت میں فقراء اور مساکین پر صدقہ کرنے کو موجب نجات بتلایا ہے۔

نجات کا تیسرا طریقہ

گناہ گار کی نجات کا ایک طریقہ یہ ہے کہ انبیاء کی شفاعت سے اس کا قصور معاف کر دیا جائے۔ سلاطین عالم اگر کسی سے ناراض ہو جاتے ہیں تو جس طرح عجز اور انکساری کے ساتھ معذرت کرنے سے قصور معاف ہو جاتا ہے اسی طرح بعض مرتبہ وزراء اور مقربین بارگاہ سلطانی کی سفارش سے بھی قصور معاف ہو جاتا ہے۔ چنانچہ توریت کے کتاب عدد باب ۱۴ درس ۱۹ میں ہے:

"اب تو اپنی رحمت کی فراوانی سے اس امت کا گناہ بخش دیجئے جیسا تو مصر سے لے کر یہاں تک بخشتا رہا ہے۔ خداوند نے فرمایا کہ میں نے تیرے کہنے سے بخشا۔ اھ"

اس درس میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی شفاعت سے گناہ کا بخشا جانا مذکور ہے۔ کتاب خروج باب ۱۰ درس ۱۶ میں ہے:

"تب فرعون نے موسیٰ اور ہارون کو جلد بلایا اور کہا کہ میں خداوند تمہارے خدا کا گنہگار ہوں۔ سو اب میں تمہاری منت کرتا ہوں فقط اس

مرتبہ میرا گناہ بخشو اور اپنے خدا سے شفاعت کرو فقط اسی موت کو مجھ سے دور کرے چنانچہ وہ فرعون کے پاس سے نکل گیا اور خداوند سے شفاعت کی۔"

اور اسی طرح کتاب خروج کے باب ۸۔ آیت ۸۔ اور آیت ۲۹۔ اور آیت ۳۰ میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی شفاعت کا ذکر ہے پورا باب ہی شفاعت کے بیان میں ہے اور اسی طرح کتاب خروج کے باب نہم آیت ۲۸ میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی شفاعت کا ذکر ہے۔ بنی اسرائیل نے جب گوسالہ پرستی کی اور ان پر خدا کا قہر بھڑکا تو اس وقت بھی حضرت موسیٰ علیہ السلام کی شفاعت سے وہ قہر دفع ہوا جیسا کہ کتاب خروج کے باب ۲۳ میں مذکور ہے۔ تواریخ دوم باب ۳۰ درس ۱۸ سے درس ۲۱ تک میں حضرت حزقیاہ کی دعا سے قصور معاف ہونا مذکور ہے۔

نجات کا چوتھا طریقہ

وہ یہ کہ حق جل شانہ بلا کسی توبہ اور استغفار اور بغیر کسی کی شفاعت کے محض اپنے فضل وکرم سے کسی کے گناہ معاف فرما دیں جیسے بعض مرتبہ سلاطین عالم مراحم خسروانہ سے کسی مجرم کو بغیر سزا رہا کر دیتے ہیں۔

اے طالبان نجات اخروی اور اے خوستگاران حیات ابدی اگر نجات کا صحیح اور ٹھیک راستہ معلوم کرنا چاہتے ہو تو یہ ہے کہ جو اسلام نے تم کو تلقین کیا۔ اور تمام کتب سماویہ اور صحف الٰہیہ نے حرف بحرف اس کی شہادت دی اور فطرت سلیمہ اور عقول مستقیمہ نے اس کی تائید کی، سوچ لو اور خوب سوچ لو کہ نجات کا اس سے بہتر راستہ کہیں نہیں مل سکتا۔ یہی ایک راستہ جنت کا ہے اور اس کے سوا سب راستے جہنم کے ہیں۔

ابطال کفارہ

آریوں کی طرح عیسائیوں نے بھی ایک عجیب وغریب طریقہ نجات کا نکالا۔ وہ

یہ کہ حضرت آدم علیہ السلام نے خدا کی نافرمانی کی۔ اس کی پاداش میں وہ جنت سے نکالے گئے ان کا گناہ نہ اس سزا سے معاف ہوا اور نہ توبہ اور استغفار سے بلکہ نسلاً بعد نسل ان کی اولاد میں منتقل ہوتا رہا حتیٰ کہ انبیاء اور مرسلین بھی اس سے پاک نہ رہے۔ اس لئے خدا کو اس کی سزا دینی ضرور تھی تاکہ اس کی شان عدل میں کوئی فرق نہ آئے اور بندوں پر رحم و کرم بھی ہو جائے۔ اس لئے حق جل شانہ نے بجائے بندوں کے اپنے اکلوتے بیٹے کو صلیب پر چڑھایا۔ تاکہ وہ لوگوں کے گناہوں کا کفارہ ہو، اور لوگوں کے لئے باعث نجات ہو۔ اس صورت میں خدا کا عدل بھی قائم رہا اور اس کا رحم و کرم بھی۔ آھ۔

حضرات! نصاریٰ نے نجات کا یہ انوکھا طریقہ نکالا جو کہ آپ نے پڑھا۔ نجات کا یہ طریقہ نہایت ہی مضحکہ انگیز اور قابل تمسخر ہے کہ گناہ کوئی کرے اور ایک معصوم اور بے گناہ کو پکڑ کر سزا دے دی جائے۔

قال اللّٰہ عزوجل: ﴿مَنِ اهْتَدٰى فَاِنَّمَا يَهْتَدِيْ لِنَفْسِهٖ وَمَنْ ضَلَّ فَاِنَّمَا يَضِلُّ عَلَيْهَا وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى﴾[1]

ترجمہ: "جو شخص ہدایت قبول کرتا ہے وہ اپنے نفع کے لئے ہے اور جو گمراہ ہوتا ہے وہ اپنا ہی نقصان کرتا ہے اور کوئی شخص کسی کا بوجھ نہیں اٹھائے گا۔"

﴿قُلْ لَّا تُسْئَلُوْنَ عَمَّآ اَجْرَمْنَا وَلَا نُسْئَلُ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ﴾[2]

ترجمہ: "آپ ان سے کہہ دیجئے کہ ہمارے جرائم کی بابت تم سے کوئی بازپرس نہ ہوگی اور تمہارے اعمال کے متعلق ہم سے سوال نہ ہوگا۔"

﴿مَنْ عَمِلَ صَالِحًا فَلِنَفْسِهٖ وَمَنْ اَسَآءَ فَعَلَيْهَا وَمَا رَبُّكَ

[1] القرآن: ۱۵/۱۷ [2] القرآن: ۲۵/۳۴

بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيْدِ ﴿۴۶﴾ [1]

ترجمہ: ''جو عمل صالح کرے گا وہ اپنے بھلے کے لئے کرے گا اور جو برا عمل کرے گا اس کا وبال اسی پر ہوگا۔ اور تیرا پروردگار بندوں پر ظلم کرنے والا نہیں۔''

﴿اَمْ لَمْ يُنَبَّاْ بِمَا فِيْ صُحُفِ مُوْسٰى ﴿۳۶﴾ وَاِبْرٰهِيْمَ الَّذِيْ وَفّٰى ﴿۳۷﴾ اَلَّا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى ﴿۳۸﴾ وَاَنْ لَّيْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰى ﴿۳۹﴾ وَاَنَّ سَعْيَهٗ سَوْفَ يُرٰى ﴿۴۰﴾﴾ [2]

ترجمہ: ''کیا اس کو اس مضمون کی خبر نہیں کہ جو (حضرت) موسیٰ اور (حضرت) ابراہیم کے صحیفوں میں ہے کہ کوئی گناہ کرنے والا دوسرے کے گناہ کو نہیں اٹھائے گا اور انسان اسی چیز کا مالک ہے جو اس نے خود کمایا اور اس کی سعی کا پھل اس کو ضرور دکھلایا جائے گا۔''

توریت سفر استثناء باب ۲۴ درس ۱۶ میں ہے۔

''اولاد کے بدلے باپ دادے مارے نہ جائیں نہ باپ دادوں کے بدلے اولاد قتل کی جائے ہر ایک اپنے ہی گناہ کے سبب مارا جائے۔ آھ۔''

اور کتاب حزقیل کے باب ۱۸ درس ۲۰ میں ہے:

''وہ جان جو گناہ کرتی ہے سو ہی مرے گی۔ بیٹا باپ کی بدکاری کا بوجھ نہیں اٹھائے گا اور نہ باپ بیٹے کی بدکاری کا بوجھ اٹھائے گا۔ صادق کی صداقت اسی پر ہوگی اور شریر کی شرارت اسی پر پڑے گی۔''

اور کتاب الامثال باب ۱۱ درس ۸ میں ہے:

''صادق مصیبت سے رہائی پاتا ہے اور اس کے بدلے شریر پکڑا جاتا ہے۔''

---

[1] القرآن: ۴۱/۴۶ [2] القرآن: ۵۳/۳۶ تا ۴۰

اور کتاب الامثال باب ۲۱ درس ۱۸ میں ہے:

''شریر لوگ صادق کے بدلے اور خطا کار راستبازوں کے عوض فدیہ دیئے جاویں گے۔ اھ''

''اس کا مقتضا تو یہ ہے کہ شریروں کو صلیب پر چڑھایا جائے نہ کہ حضرت مسیح بن مریم علیہ السلام کو''

کیا کوئی عاقل اس کو روا رکھ سکتا ہے کہ کسی قاتل کا مقدمہ پیش ہو، اور وہ حاکم بجائے اس قاتل کے اپنے عزیز لخت جگر نور بصر فرزند دلبند کو پھانسی کا حکم دے دے اور اگر بالفرض وہ ایسا کر گزرے تو لوگ اس حاکم کو دیوانہ اور احمق سمجھیں گے۔ یا یہ خیال کریں گے کہ حاکم در پردہ اپنے بیٹے سے ناراض تھا۔ کسی بہانے سے اس کو سزا دینا چاہتا تھا۔ اس لئے ایسا کیا۔

عیسائیوں کے اس عجیب وغریب طریقۂ انصاف پر ایک حکایت یاد آتی ہے۔ ایک چور چوری کرنے کے لئے کسی جولاہے کے مکان میں گھسا۔ اندھیرے میں جامہ دانی کی سلائی اس کی آنکھ میں گھس گئی۔ جس سے چور کی آنکھ پھوٹ گئی۔ صبح کو الٹا چور نے عدالت میں جولاہے پر دعویٰ کر دیا اور درخواست کی کہ میری آنکھ کے بدلے میں اس کی آنکھ پھوڑی جائے۔ حاکم عادل نے حکم دے دیا کہ ضرور جولاہے کی آنکھ پھوڑی جائے۔ جولاہے نے بہت کچھ عذر کیا مگر شنوائی نہ ہوئی۔ دیکھا کہ یہاں تو یہی اندھیر ہے۔ تم بھی ایسا ہی کوئی عذر تراش لو عرض کیا کہ حضور مجھ کو کپڑا بننے کے لئے دونوں آنکھوں سے کام لینا پڑتا ہے۔ سنار کو ہمیشہ ایک ہی آنکھ سے کام ہے اس کی ایک آنکھ بے کار ہے۔ اس لئے کہ جب سنار کام کرتا ہے تو ایک آنکھ سے دیکھتا ہے اور دوسری آنکھ بند کر لیتا ہے۔ حاکم عادل نے حکم دیا کہ بے شک اس کا عذر معقول ہے شہر میں سے کسی سنار کو پکڑ لاؤ۔ سنار پکڑ کر لایا گیا۔ بہت واویلا کیا آخر میرا قصور کیا ہے۔ جواب یہ ملا کہ تم سچ کہتے ہو۔ مگر ہم کو اپنی شان عدل اور انصاف کا قائم رکھنا ضروری

ہے۔ بالآخر اس غریب سنار کی آنکھ پھڑ واہی ڈالی۔

علاوہ ازیں یہ عجیب فلسفہ ہے کہ گناہ گار اور خطا کار کا معاف کر دینا تو شان عدل اور تقدس کے خلاف ہے مگر ایک معصوم اور بے گناہ کو بلاوجہ صلیب پر چڑھا دینا شان عدل وانصاف کے خلاف نہیں۔

نیز اگر گناہ گار کو بخش دینا شان عدل اور تقدس کے خلاف ہے تو وہ غفور رحیم اور عفو کریم کس طرح ہے۔ حالانکہ تمام کتابیں، بہ آواز بلند اس کی شہادت دے رہی ہیں کہ وہ غفور رحیم اور عفو کریم بھی ہے۔ چنانچہ زبور (۱۰۳) درس ۳ میں ہے وہ تیری ساری بدکاریوں کو بخشتا ہے۔

پھر درس ۸ میں ہے:

''خداوند رحیم و کریم ہے۔ غصہ ہونے میں دھیما اور شفقت میں بڑھ کر ہے اس کا جھنجھلانا دائمی نہیں وہ اپنے غصہ کو ابد تک نہیں رکھ چھوڑتا۔ اس نے ہمارے گناہوں کے موافق ہم سے سلوک نہیں کیا اور ہماری بدکاریوں کے مطابق بدلہ نہیں دیا۔''

انجیل لوقا باب ۶ درس ۳۵ میں ہے۔

''وہ یعنی خدا تعالیٰ ناشکروں اور بدوں پر مہربان ہے جیسا تمہارا باپ رحیم ہے تم بھی رحم دل ہو۔ عیب جوئی نہ کی جائے گی۔ مجرم نہ ٹھہراؤ تم بھی مجرم نہ ٹھہرائے جاؤ گے۔ خلاصی دو (یعنی معاف کرو) خلاصی دیئے جاؤ گے (یعنی معاف کئے جاؤ گے) اھ۔''

اور انجیل متی باب ۶ درس ۱۴ میں ہے۔

''اگر تم آدمیوں کے قصور معاف کرو گے تو تمہارا آسمانی باپ بھی تمہیں معاف کرے گا۔ اور انجیل متی کے باب ۱۸ میں بھائیوں کے گناہ معاف کرنے کی ترغیب مذکور ہے۔''

اور انجیل لوقا کے پہلے درس ۶۷ میں زکریا گیت ملاحظہ ہو۔

نیز ہم سوال کرتے ہیں کہ حضرت مسیح علیہ السلام کا حضرت آدم علیہ السلام اور ان کی گناہ گار ذریت کے لئے کفارہ ہونا کس حیثیت سے تھا۔ اگر الوہیت کی حیثیت سے کفارہ ہوئے تو خدا کا صلیب دینا اور خدا کا سولی چڑھانا الوہیت کا ذلیل اور رسوا ہونا لازم آتا ہے جو سراسر خلاف عقل ہے۔ خدا تو غالب اور ظاہر ہونا چاہئے۔ معاذ اللہ وہ خدا ہی کیا ہوا کہ بندوں سے اس قدر مغلوب اور عاجز ہوا کہ بندے اس کو صلیب پر چڑھا دیں اور وہ کچھ بھی نہ کر سکے۔

اگر بشریت اور انسانیت کی حیثیت سے کفارہ ہوئے تو حضرت مسیح ابن آدم ہونے کی وجہ سے خود گناہ گار ہیں۔ اس لئے کہ عیسائیوں کے نزدیک جو آدم کی نسل سے ہے وہ گناہ گار ہے۔

علاوہ ازیں انجیل سے حضرت مسیح علیہ السلام کا گناہ گار ہونا لازم آتا ہے۔ چنانچہ انجیل یوحنا باب دوم درس ۳ میں ہے کہ حضرت مسیح علیہ السلام نے اپنی والدہ محترمہ مریم صدیقہ کو اس طرح خطاب فرمایا۔ (اے عورت تجھے مجھ سے کیا کام ہے)۔

حالانکہ والدہ کی تعظیم نہ کرنا اور اس قسم کے تحقیری کلمات سے اس کو خطاب کرنا گناہ ہے۔

نیز جب حضرت آدم علیہ السلام توبہ اور استغفار کر چکے اور بمصداق "التائب من الذنب کمن لاذنب لہ" (گناہ سے توبہ کرنے والا مثل اس شخص کے ہو جاتا ہے کہ جس نے کوئی گناہ ہی نہیں کیا) گناہ سے بالکل پاک ہو چکے تھے تو ان کی طرف سے حضرت مسیح علیہ السلام کا قتل بالکل عبث اور فضول ہے۔ اور کیا حضرت آدم علیہ السلام کے کھانے کا کفارہ حضرت مسیح علیہ السلام کے چالیس چالیس روز تک مسلسل صوم وصال رکھنے اور ایک طویل عرصہ نہ کھانے سے نہیں ہو سکتا۔

اور اگر بفرض محال حضرت آدم علیہ السلام اپنے گناہ سے تائب نہ ہوئے تھے اور ان کا گناہ اسی طرح باقی رہا تو اب سوال یہ ہے کہ نجات کے لئے فقط حضرت مسیح کے قتل کے علاوہ توبہ اور استغفار بھی ضروری ہے جب دونوں امر (یعنی قتل مسیح اور توبہ اور استغفار) مکمل ہو جائیں تب نجات ممکن ہے۔

نصاریٰ اگر شق اول کو اختیار کریں اور یہ کہیں کہ نجات کے لئے توبہ اور استغفار شرط نہیں بلکہ حضرت مسیح کا قتل کافی ہے تو پھر حضرت آدم تو درکنار یہ کافر و فاجر اور قارون اور فرعون اور ہامان اور نمرود مردود تمام یہود بے بہبود کے لئے حضرت مسیح کی موت کا کفارہ ہونا لازم آتا ہے۔

اور اگر شق ثانی کو اختیار کریں تو نجات کا مدار مجموعہ امرین پر ہے یعنی قتل مسیح اور توبہ ان دونوں کے مجموعہ پر نجات موقوف ہے تو معلوم ہوا کہ فقط حضرت مسیح کی موت نجات کے لئے کافی نہیں جو شخص اپنے گناہوں سے تائب نہیں اور اپنی بدکرداریوں پر نادم اور پریشان نہیں تو اس کے لئے حضرت مسیح کی موت اور حیات سب برابر ہے۔ اس کی نجات توبہ اور استغفار سے ہوگی۔ چنانچہ انجیل مرقس کے سولہویں باب کی سولہویں آیت میں ہے۔

"جو ایمان لائے وہ نجات پائے گا اور جو ایمان نہ لایا وہ مجرم ٹھہرایا جائے گا۔ اھ"

اس سے صاف ظاہر ہے کہ مدار نجات ایمان ہے۔ حضرت مسیح کی موت مدار نجات نہیں۔ اور توبہ اور استغفار اور اپنے گناہوں پر ندامت اور پشیمانی اور حق جل شانہ سے حیا اور شرمساری یہ ایمان کا ایک عظیم الشان شعبہ ہے۔

نیز نصاریٰ کے نزدیک (معاذ اللہ) جب خدا اور حضرت مسیح میں اتحاد اور عینیت ہے تو حضرت مسیح علیہ السلام کے مقتول و مصلوب ہونے سے خود حق جل شانہ کا قاتل اور مقتول ہونا لازم آتا ہے۔

علاوہ ازیں خدا کا یہ کیسا عدل اور انصاف ہے کہ گناہ تو کوئی کرے اور مواخذہ میں اپنے بیٹے کو تڑپا تڑپا کر مارے۔

فرض کرو کہ اگر کوئی آقا اپنے غلام کو کوئی حکم دے اور وہ غلام بھولے سے خلاف حکم کر گزرے اور پھر فوراً ہی دست بستہ نہایت شرمساری اور ندامت کے ساتھ معذرت کے لئے آقا کے سامنے ہاتھ جوڑ کر کھڑا ہو جائے۔ آقا اپنے غلام کی یہ ندامت اور پشیمانی دیکھ کر اپنی خودکشی کر لے یا اپنے فرزند دلبند اور لخت جگر اور نور بصر کے متعلق غلاموں کو حکم دے کہ اس کو بھی سولی پر چڑھا دو اور اس کے منہ پر تھوکو اور طمانچے لگاؤ تو کیا ایسے آقا کو کوئی عاقل اور حکیم کہہ سکتا ہے۔

نیز حق جل شانہ نے انبیاء و مرسلین کو دنیا میں اس لئے بھیجا تاکہ وہ لوگوں کو ایمان اور ہدایت کی تلقین کریں تاکہ جو ایمان لائے وہ نجات پائے اور جو سرتابی کرے وہ ہلاک ہو۔

پس اگر عذاب الٰہی سے خلاصی اور نجات حضرت مسیح کی موت پر موقوف تھی تو ان ہزارہا انبیاء و مرسلین کی آمد سے کیا فائدہ ہوا۔ معاذ اللہ جب حضرات انبیاء ہی جہنم میں محبوس تھے تو دوسروں کو جہنم سے کیسے نجات دلا سکتے تھے۔

نیز اگر یہ قتل و صلب حضرت مسیح کا اختیاری تھا اور حق جل شانہ کی عین مرضی کے مطابق تھا تو حضرت مسیح گھبراتے اور اس سے بھاگتے اور موت کا پیالہ ٹل جانے کی نہایت تضرع اور زاری سے دعا کیوں مانگتے تھے اور دشمنوں سے چھپتے کیوں تھے۔ ان کی شان تو یہ ہونی چاہئے تھی کہ ؎

نشود نصیب دشمن کہ شود ہلاک تیغت
سر دوستاں سلامت کہ تو خنجر آزمائی

حضرت ابراہیم علیہ السلام کو جب حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کے ذبح کا حکم آیا تو حضرت مسیح علیہ السلام حق تعالیٰ شانہ کی طرف سے جان قربان کرنے کا ایک ادنیٰ

اشارہ بھی پاتے تو سو جان قربان کرنے کے لئے حاضر ہو جاتے نیز اگر حضرت مسیح کا قتل اللہ کی رحمت تھی کہ جس سے معاذ اللہ تمام انبیاء و مرسلین جو پانچ ہزار سال سے جہنم میں محبوس تھے حضرت مسیح کے قتل سے رہا ہوئے تو پھر نصاری کو چاہئے کہ یہود کے ممنون ہوں کہ ان کی وجہ سے نصاری کو نجات حاصل ہوئی اور وہی لوگ اس رحمت کبری اور نعمت عظمی کے سبب بنے۔

اور جس طرح صلیب کو بوسہ دیتے ہیں۔ اسی طرح یہود کے ہاتھوں کو بھی بوسہ دیا کریں ؂

هلا غفرتم لليهود لانهم
ابدت نفوسهم الصواب بفعلها

تم نے یہود کو کیوں معاف نہ کیا اور ان کے فعل کی تصویب کیوں نہیں کی ؂

ما ذا عليكم ان تودو هم و هم
سبب النجاة من الجحيم وحرها

ان کو محبوب کیوں نہیں رکھتے وہی تو تمہارے لئے جہنم سے نجات کا سبب بنے ہیں۔

نیز جو لوگ حضرت مسیح سے پہلے گزرے وہ مؤمن تھے یا کافر۔ اگر مؤمن اور ناجی تھے تو ان کی نجات ایمان کی وجہ سے ہوئی نہ کہ حضرت مسیح کے مزعوم قتل وصلب سے۔

اور اگر معاذ اللہ وہ سب کے سب کافر تھے تو حضرت مسیح کا یہ قول ان کی تردید کرتا ہے۔

"فریسیوں نے حضرت مسیح کے شاگردوں سے کہا کہ تمہارا استاد گناہ گاروں کے ساتھ کیوں کھاتا ہے (۱۲) اس نے سن کر یہ کہا کہ تندرستوں کو حکیم درکار نہیں بلکہ بیماروں کو۔ میں راستبازوں کو نہیں بلکہ گناہ گاروں کو

بلانے آیا ہوں۔"

کذافی مرقس باب ۹۔ درس ۱۱، ۱۲، ۱۳۔

اور یہی مضمون انجیل مرقس کے باب ۲ درس ۱۶، ۱۷ میں اور انجیل لوقا کے باب ۱۹ اور ۱۰ میں ہے۔

اور اگر یہ کہا جائے کہ حضرت مسیح صرف گناہ گاروں کے لئے نہیں بلکہ تمام اولین اور آخرین کی خلاصی اور نجات کے لئے مبعوث ہوئے تھے تو پھر سوال یہ ہے کہ جو لوگ حضرت مسیح کی ولادت باسعادت سے پہلے ہی مر چکے اور ان کو حضرت مسیح کا مطلق علم نہ تھا۔ ان کی نسبت یہ کہنا کہ وہ سب گمراہ مرے کیسے صحیح ہوسکتا ہے۔ گمراہ تو وہ ہے کہ جس کو دین حق کی دعوت پہنچی مگر اس نے دعوت کو قبول نہیں کیا۔ بغیر تبلیغ اور دعوت کے کسی پر گمراہی کا حکم لانا صریح ظلم ہے۔ اسی وجہ سے شریعت اسلامیہ کا یہ مسئلہ ہے کہ جو لوگ زمانۂ فترت میں گزرے اور ان کو کسی پیغمبر برحق کی دعوت نہیں پہنچی تو ان پر کوئی مواخذہ نہیں۔ وہ لوگ ناجی ہیں۔

پس اگر حضرت مسیح علیہ السلام کے ذریعہ سے تمام اولین اور آخرین کی خلاصی اور نجات مقصود تھی تو نصاریٰ کے اس زعم کے مطابق حضرت مسیح علیہ السلام کا ظہور حضرت آدم علیہ السلام سے بھی پہلے ہونا چاہئے تھا۔ تاکہ سب کو حضرت مسیح علیہ السلام کی دعوت پہنچ جاتی۔

علاوہ ازیں انجیل کے مطابق حضرت مسیح علیہ السلام صرف بنی اسرائیل کی بھیڑوں کے لئے آئے تھے تمام عالم کے لئے مبعوث نہیں ہوئے تھے۔

بعض نصاریٰ یہ کہتے ہیں کہ حضرت مسیح جب تک زندہ رہے اس وقت تک زندوں کو دعوت دیتے رہے اور مرنے کے بعد مردوں کو دعوت دے رہے ہیں۔ سبحان اللہ عجیب تحقیق ہے۔ خیر جو کچھ بھی ہے لیکن ہمارا سوال یہ ہے کہ حضرت مسیح نے مرنے کے بعد فقط مؤمنین کو دعوت دی یا فقط کافرین کو، یا مؤمنین اور کافرین سب کو ہی دعوت

دی۔ اگر یہ کہا جائے کہ فقط مؤمنین کو دعوت دی تو بے سود ہے جو لوگ پہلے ہی سے ایمان لا چکے اور حق کی دعوت کو قبول کر چکے ان کو دوبارہ دعوت دینے سے کیا فائدہ اور اور اگر یہ کہا جائے کہ مؤمن اور کافر سب ہی کو دعوت دی تو ممکن ہے کہ عالم برزخ میں حال بدل گیا ہو۔ بہت سے مؤمن ایمان سے منحرف ہو گئے ہوں اور فرعون اور ہامان نمرود اور شداد جیسے کافر مشرف با ایمان ہو گئے ہوں۔ اور بہت سے کافر ایمان لے آنے کی وجہ سے داخل جنت ہو گئے ہوں اور بہت سے مؤمن ایمان سے منحرف ہونے کی وجہ سے جہنم میں ڈال دیئے گئے ہوں۔

اور اگر یہ کہا جائے کہ عالم برزخ میں مؤمن اپنے ایمان پر اور کافر اپنے کفر پر قائم رہے اور کسی کی حالت میں کوئی تغیر اور تبدل نہیں ہوا تو پھر مردوں کو دعوت دینے سے کیا فائدہ ہوا؟ دعوت بالکل عبث اور بے کار رہی۔

نیز جس طرح حضرت مسیح نے دنیا میں لوگوں کو حق کی دعوت دی اور لوگ ان کے دشمن ہو گئے اور آپ کے زعم میں دشمنوں نے ان کو قتل بھی کر ڈالا ممکن ہے کہ اسی طرح عالم برزخ میں بھی دشمن آپ پر چڑھ آئے ہوں اور دنیا کی طرح وہاں بھی کامیاب ہو گئے ہوں۔ کیونکہ مرنے کے بعد انسان میں زندگی کی قوت باقی نہیں رہتی۔

نیز تورات میں ہے کہ اسرائیل میرا بیٹا بلکہ پہلوٹھا ہے۔ پس عیاذاً باللہ اگر خدا تعالیٰ اپنی اولاد ہی کو فدیہ میں صلیب دینا چاہتا تھا تو بجائے بیٹی کے لڑکے یعنی مسیح بن مریم کے بجائے اکلوتے بیٹے کو فدیہ میں صلیب پر چڑھانا زیادہ مناسب تھا۔

نیز جس طرح خدا تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے فرزند یعنی اسماعیل علیہ السلام کو قربانی دے کر بچا لیا کیا خدا تعالیٰ اسی طرح اپنے پیارے بیٹے کو نہیں بچا سکتا تھا۔ کیا اللہ تعالیٰ کے نزدیک ابراہیم علیہ السلام کا بیٹا اپنے بیٹے سے زیادہ محبوب تھا کہ اپنا بیٹا تو بھوکا اور پیاسا باپ کو پکارتا مر جائے مگر باپ کو کسی طرح اس پر رحم نہ

آئے اور دوستوں کی اولاد کو جانور کا فدیہ دے کر بچالے۔

ہر جگہ اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبروں کی مدد فرمائی اور ان کے دشمنوں کو ہلاک اور برباد کیا۔ نوح علیہ السلام کے دشمنوں پر طوفان بھیجا۔ ابراہیم علیہ السلام کے دشمن نمرود کو ہلاک کیا۔ موسیٰ علیہ السلام کے دشمن فرعون کو غرق کیا۔ مگر اللہ تعالیٰ نے اپنے پیارے بیٹے کی کوئی مدد نہ کی۔ بلکہ دشمنوں کی مراد پوری کر دی۔

نیز نصاریٰ کے نزدیک مسئلہ کفارہ کا تمام تر دارومدار واقعہ قتل وصلب کے صحیح مان لینے پر ہے قرآن کریم کا دعویٰ یہ ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام نہ قتل کئے گئے اور نہ سولی پر چڑھائے گئے۔ دشمنوں نے جب حضرت مسیح علیہ السلام کے قتل کا ارادہ کیا تو اللہ تعالیٰ نے حضرت مسیح علیہ السلام کو صحیح وسالم آسمان پر اٹھالیا اور ان ہی میں سے ایک شخص کو حضرت مسیح علیہ السلام کا ہم شکل بنادیا لوگوں نے اسی کو مسیح سمجھ کر قتل کر دیا۔

یہ قرآن کریم کی شہادت ہے جو سب سے زیادہ سچی اور بڑی شہادت ہے اور نصاریٰ کے متعدد فرقے بھی اسی کے قائل ہیں کہ عیسیٰ علیہ السلام مقتول اور مصلوب نہیں ہوئے بلکہ زندہ آسمان پر اٹھائے گئے جیسا کہ تواریخ میں مذکور ہے اور پادری سیل نے بھی اپنے ترجمہ میں سورۃ آل عمران میں بعض فرقوں کا ذکر کیا ہے۔ معلوم ہوا کہ واقعۂ صلیب نصاریٰ کے نزدیک متفق علیہ نہیں۔

ہم فقط اسی الزامی جواب پر اکتفا کرنا نہیں چاہتے بلکہ تاریخی حیثیت اور انجیل کی نصوص سے یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ واقعہ کی حقیقت واقعیہ وہی ہے جو قرآن کریم نے خبر دی اور جس کو نصاریٰ کے بعض محققین نے بھی تسلیم کیا۔

1 تاریخی حیثیت سے یہ مسلم ہے کہ جس وقت یہود بے بہبود لعنہم اللہ تعالیٰ نے حضرت مسیح علیہ السلام کو صلیب پر چڑھانے کا ارادہ کیا تو تمام حواریین اس سے ڈرے کہ ہم نہ پکڑے جائیں سب بھاگ گئے تھے۔ وہاں کوئی موجود نہ تھا۔ لہٰذا یہ کہنا کہ حضرت مسیح علیہ السلام صلیب پر چڑھائے گئے یہ صرف یہودیوں کا بیان ہے۔ اب ہر

عاقل اندازہ لگالے کہ یہودیوں کی روایت یا شہادت کس پایہ کی ہے بعض نصاریٰ کا قول ہے کہ واقعہ قتل کے وقت ایک حواری موجود تھا جو دور سے دیکھ رہا تھا۔ سو اگر یہ تسلیم بھی کرلیا جائے تو تب بھی یہ روایت متواتر اور مشہور نہیں کہلا سکتی جس سے سننے والوں کو جزم اور یقین حاصل ہوسکے۔

رہے یہود سو ان کی بھی جماعت ایک قلیل جماعت تھی۔ ان کا متفق ہو کر ایک جھوٹا واقعہ بنالینا کوئی مستبعد نہیں، ہوسکتا ہے کہ انہوں نے اپنی ناکامی کو چھپانے کے لئے اس طرح واقعہ بنا کر لوگوں میں مشہور کردیا ہو۔

۲ جس وقت یہودی حضرت مسیح کو پکڑنے کے لئے گئے تھے وہ رات کا وقت تھا اور رات بھی تاریک اور اندھیری تھی۔ روشنی اور چراغ کا نام و نشان نہ تھا۔ پھر اس پر طرہ یہ کہ جو لوگ پکڑنے کے لئے گئے تھے وہ حضرت مسیح علیہ السلام کو پہچانتے نہ تھے۔ اگر وہ پیادے حضرت مسیح علیہ السلام کو پہچانتے تھے تو حضرت مسیح کے ایک شاگرد کو کیوں پکڑلیا کہ وہ ساتھ چلے اور بتلائے کہ حضرت مسیح یہ ہیں۔

۳ انجیل متی باب ۴۔ آیت پنجم میں یہ ہے کہ:

> ''ابلیس نے حضرت مسیح سے یہ کہا کہ اگر تو خدا کا بیٹا ہے تو اپنے تئیں نیچے گرادے کیونکہ وہ تیری بابت اپنے فرشتوں کو حکم دے گا اور وہ تجھے ہاتھوں پر اٹھالیں گے۔ ایسا نہ ہو کہ تیرے پاؤں کو پتھر کی ٹھیس لگے۔
> یسوع نے اس سے کہا کہ یہ بھی لکھا ہے کہ تو اپنے خداوند کی آزمائش نہ کر۔ اھ۔''

حضرت مسیح کا جواب میں یہ فرمانا کہ یہ بھی لکھا ہے کہ تو اپنے خدا کی آزمائش نہ کر اس امر کی صریح تصدیق ہے کہ گزشتہ نوشتوں میں جو مسیح کی بابت لکھا ہے کہ فرشتے اس کو ہاتھوں پر اٹھالیں گے وہ بالکل برحق ہے۔ مگر اس کے علاوہ یہ بھی لکھا ہے۔

''اگر تو خدا کا بیٹا ہے تو اپنے تیئں یہاں نیچے گرا دے۔ کیونکہ لکھا ہے کہ تیری بابت اپنے فرشتوں کو حکم دے گا کہ تیری حفاظت کریں اور یہ بھی کہ وہ تجھے ہاتھوں پر اٹھالیں گے۔ ایسا نہ ہو کہ تیرے پاؤں کو پتھر کی ٹھیس لگے۔''

انجیل متی اور انجیل لوقا کی اس عبارت پر کہ مسیح کی بابت یہ لکھا ہے کہ خدا اپنے فرشتوں کو یہ حکم دے گا الخ۔ زبور کے اکیانوے باب کی گیارہویں آیت کی طرف اشارہ ہے۔ جیسا کہ انجیل متی اور انجیل لوقا دونوں کے حاشیہ میں اس مقام پر لکھا ہے:

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ زبور کی وہ آیات کہ جن کی طرف انجیل متی اور انجیل لوقا میں اشارہ کیا گیا ہے وہ بتمامہا ہدیہ ناظرین کریں تاکہ ناظرین کرام صحیح نتیجہ نکال سکیں۔

زبور (۹۱) آیت ۱۱

کیونکہ وہ تیرے لئے اپنے فرشتوں کو حکم کرے گا کہ وہ تیری نگہبانی کریں (۱۲) کہ وہ تجھے ہاتھوں پر اٹھالیں گے۔ تا نہ ہو کہ تیرے پاؤں کو کسی پتھر سے ٹھیس لگے۔ (۱۳) تو شیر اور سانپ کو لتاڑے گا۔ تو شیر کے بچہ اور اژدہے کو پاؤں تلے کچلے گا (۱۴) اس لئے کہ اس نے مجھ سے دل لگایا۔ میں اسے نجات دوں گا اور میں اسے اونچے پر بٹھاؤں گا کہ اس نے میرا نام پہچانا۔ (۱۵) وہ مجھے پکارے گا اور میں اس کو جواب دوں گا اس کے دکھ اٹھانے کے وقت میں اس کے ساتھ ہوں گا۔ میں اسے چھڑاؤں گا اور اسے عزت دوں گا۔ (۱۶) میں اسے عمر کی درازی سے سیر کروں گا اور اپنی نجات اسے دکھاؤں گا۔اھ۔

اس عبارت سے صاف ظاہر ہے کہ حضرت مسیح دشمنوں سے بالکل مامون اور محفوظ رہیں گے۔ اور اسی باب کی ساتویں اور آٹھویں آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت مسیح تو بالکل محفوظ رہیں گے اور کوئی شریر ان کے بدلہ قتل کیا جائے گا۔ ''لیکن وہ

تیرے نزدیک نہ آوے گی۔ فقط تو اپنی آنکھوں سے نگاہ کرے گا اور شریروں کے بدلے کو دیکھے گا" اھ۔

انجیل یوحنا کے باب ۷ کے آیت ۱۳ میں ہے کہ ہلاکت کے فرزند کے سوا ان میں سے کوئی ہلاک نہ ہوا تا کہ کتاب مقدس کا لکھا ہوا پورا ہو۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ یہ امر بھی ملحوظ رہے کہ: اس مقام پر انجیل کے حاشیہ میں ہے کہ کتاب مقدس کے لکھے ہوئے زبور کے (۱۰۹) ایک سونویں باب کی آٹھویں آیت کی طرف اشارہ ہے۔

اس کے دن تھوڑے ہوویں اس کا عہدہ دوسرا پاوے اس کے بچے یتیم ہو جاویں۔ اس کی جورو بیوہ ہو جائے۔

اور چھبیسویں (۲۶) آیت میں ہے:

"اے خداوند تو میری کمک (امداد) کر اپنی رحمت کے مطابق مجھے نجات دے (۲۷) تا کہ وہ جانیں یہ تیرا ہاتھ ہے۔ وہ لعنت کریں پر تو برکت دے جب وہ اٹھیں تو شرمندہ ہوں پر تیرا بندہ شادمان ہو اور دشمن خجالت کی پوشاک سے ملبوس ہو اور شرمندگی کی چادر سے آپ کو چھپا لیویں۔ میں اپنے منہ سے خداوند کی بہت ہی ستائش کروں گا۔ میں بہتوں کے بیچ اس کی حمد گاؤں گا۔ کیونکہ وہ مسکین کے داہنے ہاتھ پر کھڑا ہے تا کہ اس کو ان سے جو اس کی جان پر فتویٰ دیتے ہیں رہائی دیوے۔"

اس عبارت کی توضیح و تشریح کے لئے کتاب الاعمال باب اول کی آیت بستم ملاحظہ ہو کیونکہ زبور میں لکھا ہے:

"اور اس کا عہدہ دوسرا لے لے۔"

اور انجیل یوحنا باب ۱۲ آیت ۳۴ میں ہے:

"لوگوں نے اس کو جواب دیا کہ ہم نے شریعت کی یہ بات سنی ہے کہ مسیح علیہ السلام ابد تک رہے گا۔"

اور پھر آیت ۳۷ میں ہے:

''کہ یسوع یہ باتیں کہہ کر چلا گیا اور ان سے اپنے آپ کو چھپا لیا۔'' انتہی

خلاصہ یہ کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت مسیح کی نسبت جو وعدہ کیا تھا وہ پورا کیا کہ حضرت مسیح علیہ السلام کو دشمنوں سے بھی چھڑایا اور عمر بھی اتنی دراز کی کہ قیامت کے قریب تک زندہ رہیں گے اور آسمان سے اتر کر دجال کو قتل کریں گے اور پھر وفات پائیں گے۔

اور زبور باب ۲۱ آیت ۴ میں ہے:

''اس نے تجھ سے زندگی چاہی اور تو نے اس کو عمر کی درازی ابد تک بخشی۔'' انتہی۔

انجیل یوحنا کے ان الفاظ میں کہ ہم نے شریعت کی یہ بات سنی کہ مسیح ابد تک رہے گا۔ اس سے زبور کی ان پیشین گوئیوں کی جانب اشارہ تھا یعنی عہد قدیم میں ایسا ہی لکھا ہے کہ مسیح قیامت تک زندہ رہیں گے۔ دشمن ان کے قتل اور صلب میں سراسر ناکام رہیں گے اور زبور میں حضرت مسیح کی نسبت یہ جملہ مذکور ہے۔

''وہ مجھے پکارے گا۔''

اس سے قتل اور صلب سے نجات اور رہائی کے لئے خدا کو پکارنا مراد ہے۔ جیسا کہ انجیل مرقس باب ۱۴ آیت ۳۵ اور انجیل متی باب ۲۶ آیت ۳۹ میں ہے۔

''اور منہ کے بل گر کے یہ دعا کی کہ اے میرے باپ اگر ہو سکے تو یہ پیالہ مجھ سے ٹل جائے تاہم جیسا میں چاہتا ہوں ویسا نہیں بلکہ جیسا تو چاہتا ہے۔ آھ۔''

خط کشیدہ فقرہ اس بات کو واضح کئے دیتا ہے کہ خدا بھی یہی چاہتا ہے کہ حضرت مسیح علیہ السلام کو دشمن نہ قتل کر سکیں۔

جب حضرت مسیح علیہ السلام دعا فرما چکے تب خدا کی جانب سے ایک فرشتہ آپ

کی اعانت کے لئے آیا۔ جیسا کہ انجیل لوقا باب ۲۲ آیت ۳۹ میں ہے:

''ایک فرشتہ اسے دکھائی دیا وہ اسے تقویت دیتا تھا۔ اھ''

یعنی حضرت مسیح علیہ السلام کو وہ فرشتہ آسمان پر اٹھا لے گیا اور ان کے ہاتھ سے آپ کو چھڑا لیا ورنہ اگر حضرت مسیح علیہ السلام معاذ اللہ یہود کے ہاتھ سے قتل ہوئے تو پھر نہ معلوم فرشتہ نے کیا مدد کی اور اس کے آنے سے کیا فائدہ مرتب ہوا۔ کیا معاذ اللہ وہ فرشتہ محض قتل کا تماشہ دیکھنے آیا تھا۔

اس کے بعد یہودیوں کو اشتباہ اس قدر شدید ہوا کہ حضرت مسیح کو باوجودیکہ آپ ہمیشہ انہیں میں رہتے تھے نہ پہچان سکے۔

اور حضرت مسیح کی اس دعا کا قبول ہونا عبرانیوں باب ۵ آیت ۷ میں مذکور ہے۔ چنانچہ یہود نے کہا کہ جس کا میں بوسہ لوں اسے پکڑ کر حفاظت سے لے جانا جیسا کہ انجیل میں مرقس باب ۱۴ آیت ۴۴ میں مذکور ہے۔ اور انجیل یوحنا باب ۱۸ آیت چہارم میں ہے:

''یسوع باہر نکلا اور ان سے کہنے لگا کہ کسے ڈھونڈتے ہو۔ انہوں نے جواب دیا کہ یسوع ناصری کو یسوع نے ان سے کہا کہ میں ہی ہوں یہ کہتے ہی وہ سب پیچھے گر پڑے۔ پس ان سے پوچھا کس کو ڈھونڈتے ہو۔ وہ بولے یسوع ناصری کو یسوع نے کہا کہ میں تم سے کہہ چکا ہوں کہ میں ہی ہو۔ آھ۔''

ناظرین غور فرمائیں کہ اس سے زائد اور کیا اشتباہ ہوگا کہ حضرت مسیح علیہ السلام سامنے کھڑے ہیں اور وہ پریشان ہو کر ڈھونڈ رہے ہیں اور حضرت مسیح بلند آواز سے اور سختی سے بار بار فرماتے ہیں کہ میں ہی مسیح ہوں۔ یہ اس لئے تھا کہ آپ کو اپنی نجات اور حفاظت اور رفع الی السماء کا پورا پورا یقین تھا۔

یہود کو اگر اشتباہ نہ تھا تو حضرت مسیح کے ایک شاگرد کو ۲۰ درہم رشوت دینے کی کیا

ضرورت تھی جیسا کہ انجیل متی باب ۲۶ آیت ۱۴ میں ہے:

''بلکہ اس اشتباہ اور شک کی بابت حضرت مسیح خود ہی رفع الی السماء سے قبل پیشگوئی کر چکے تھے۔''

جیسا کہ انجیل متی باب ۲۶ آیت ۳۱ تا ۳۵ میں ہے، اور انجیل مرقس باب ۱۴ آیت ۲۷ میں ہے:

''ح حینئذ قال لهم یسوع کلکم تشکون[1] فی فی هذه اللیلة فاجاب بطرس وان شك فیك الجمیع فانی لا اشك فیك ابدا قال له یسوع الحق اقول لك انك فی هذه اللیلة قبل ان یصیح دیك تنکرنی ثلاث مرات اه''

ترجمہ: ''یسوع نے اس وقت ان سے یہ کہا کہ تم سب کے سب میرے بارے میں اس شب میں شک میں پڑو گے بطرس نے کہا اگرچہ سب شک میں پڑ جائیں مگر میں تیرے بارہ میں شک نہ کروں گا۔ یسوع نے کہا کہ میں سچ کہتا ہوں کہ تو ہی اس بات میں مرغ کی بانگ دینے سے پہلے تین مرتبہ میرا انکار کرے گا۔''

اسی وجہ سے قرآن کریم میں ارشاد ہے:

﴿وَمَا قَتَلُوْهُ وَمَا صَلَبُوْهُ وَلٰكِنْ شُبِّهَ لَهُمْ ۚ وَاِنَّ الَّذِيْنَ اخْتَلَفُوْا فِيْهِ لَفِيْ شَكٍّ مِّنْهُ ۚ مَا لَهُمْ بِهٖ مِنْ عِلْمٍ اِلَّا اتِّبَاعَ الظَّنِّ. وَمَا قَتَلُوْهُ يَقِيْنًا ۙ ﴿۱۵۷﴾ بَلْ رَّفَعَهُ اللّٰهُ اِلَيْهِ ۚ وَكَانَ اللّٰهُ عَزِيْزًا حَكِيْمًا ﴿۱۵۸﴾﴾[2]

ترجمہ: ''اور یہود نے حضرت مسیح کو قتل کیا اور نہ سولی پر چڑھایا لیکن ان

---

[1] یہ عبارت عربی انجیل مطبوعہ ۱۸۶۹ء سے نقل کی گئی ہے۔ اور عربی کی عبارت اس لئے نقل کی گئی تاکہ ناظرین قرآن کے الفاظ کے ساتھ مطابقت کر سکیں۔

[2] القرآن: ۴/ ۱۵۷، ۱۵۸

کو اشتباہ ہو گیا اور ان کے بارہ میں اختلاف کرنے والے شک میں
پڑے ہوئے ہیں ان کو حقیقت حال کا مطلق علم نہیں محض گمان اور اٹکل کا
اتباع کر رہے ہیں عیسیٰ علیہ السلام کو یقیناً قتل نہیں کیا بلکہ اللہ تعالیٰ نے
ان کو اپنی طرف اٹھالیا اور اللہ غالب اور حکمت والا ہے۔''

خلاصہ یہ کہ حضرت مسیح علیہ السلام نے جو پیشین گوئی فرمائی تھی کہ لوگ میرے بارہ میں شک کریں گے وہ پوری ہوئی اور ایسی پوری ہوئی کہ انیس سو سال گزر گئے کہ لوگ اب تک شک میں پڑے ہوئے ہیں۔ قرآن کریم نے ہی ہم کو صحیح واقعہ کی خبر دی اور بتلایا کہ اہل کتاب شک میں پڑے ہوئے ہیں۔ قرآن کریم اگر خبر نہ دیتا تو ہم کو صحیح واقعہ نہ معلوم ہوتا اور نہ اہل کتاب کے شک کا علم ہوتا۔

انجیل یوحنا باب ۷ آیت ۳۲، ۳۳ میں ہے:

''پس سردار کاہنوں اور فریسیوں نے اس کے پکڑنے کو پیادے بھیجے۔ یسوع نے کہا میں اور تھوڑے دنوں تک تمہارے پاس ہوں پھر اپنے بھیجنے والے کے پاس چلا جاؤں گا۔ تم مجھے ڈھونڈو گے مگر نہ پاؤ گے اور جہاں میں ہوں تم نہیں آسکتے۔'' انتہی۔

اور انجیل یوحنا باب ۸ آیت ۲۱ میں ہے:

''اس نے پھر ان سے کہا میں جاتا ہوں اور تم مجھے ڈھونڈو گے اور اپنے گناہ میں مرو گے۔ جہاں میں جاتا ہوں تم نہیں آسکتے۔ پس یہودیوں نے کہا کیا وہ اپنے آپ کو مار ڈالے گا جو کہتا ہے جہاں میں جاتا ہوں تم نہیں آسکتے اس نے ان سے کہا تم نیچے کے ہو اور میں اوپر کا ہوں۔ تم دنیا کے ہو میں دنیا کا نہیں۔'' الی آخرہ''

یعنی اصل میں میں آسمان کا باشندہ ہوں۔ نفخۂ جبریلی سے پیدا ہوا ہوں۔ صورۃً انسان ہوں معنیً فرشتہ ہوں۔ جہاں فرشتے رہتے ہیں وہاں جاؤں گا۔ اس لئے تم سے

کہے دیتا ہوں کہ مجھ کو ڈھونڈو گے مگر نہ پاؤ گے۔ تم مجھ کو زمین پر ڈھونڈو گے اور میں آسمان پر جاؤں گا اور وہاں تم آ نہیں سکتے۔ اس لئے تم میرے ڈھونڈنے کی مشقت نہ اٹھانا۔

پس حضرت مسیح کا پانا ہی محال ہے تو ان کا قتل کرنا اور سولی دینا بھی قطعاً محال ہوگا۔ حضرت مسیح کا تو یہ ارشاد ہے کہ کوئی مجھ کو پا نہیں سکتا اور یہود کا دعوی یہ ہے کہ "انا قتلنا المسیح عیسی بن مریم رسول اللّٰہ" یہ تو ناممکن ہے کہ نصاری حضرت مسیح کے قول کو نہ مانیں۔ لہٰذا اگر یہود کے قول کی تصدیق کرتے ہیں تو اس کی صورت صرف یہی ہے کہ جو قرآن نے ذکر کی ہے کہ یہود نے ان کے شبیہ کو قتل کیا۔ جس کو حضرت مسیح کے ہمشکل بنا دیا تھا اور حضرت مسیح ان کے قتل وصلب سے بالکل محفوظ رہے۔ کوئی دشمن ان کے پاس بھی نہ آسکا۔

کما قال تعالٰی: ﴿وَاِذْ کَفَفْتُ بَنِیٓ اِسْرَآءِیْلَ عَنْکَ﴾ [۱]

ترجمہ: "اور جس وقت میں نے بنی اسرائیل کو تجھ سے باز رکھا۔"

یعنی بنی اسرائیل کو آپ کے پاس ہی نہ آنے دیا چہ جائیکہ وہ قتل کر سکتے اور کلمہ عن جو لغت میں ہے مساعدت اور مجاوزت کے لئے وضع ہوا ہے وہ ہی اس معنی کی تائید کرتا ہے۔

انجیل مرقس باب ۱۶ آیت ۱۹ صفحہ ۱۰۴، آخری صفحہ:

"خداوند یسوع ان سے کلام کرنے کے بعد اٹھایا گیا۔" اھ۔

انجیل لوقا باب ۲۴ آیت ۵۰ صفحہ ۱۷۶، آخری صفحہ:

"جب وہ انہیں برکت دے رہا تھا تو ایسا ہوا کہ ان سے جدا ہو گیا اور آسمان پر اٹھایا گیا۔" اھ۔

اور اسی باب کے آیت ۳۶ تا آیت ۴۰ حضرت مسیح علیہ السلام سے حواریین کو

---

[۱] القرآن: ۵/۱۱۰

رفع الی السماء سے قبل جسم کا دکھانا مذکور ہے جس سے صاف ظاہر ہے کہ یہ رفع جسمانی تھا نہ کہ روحانی۔

انجیل یوحنا باب ۳ آیت ۱۳ صفحہ ۱۸۲:

"اگر میں تم سے آسمان کی باتیں کہوں تو کیوں کر یقین کرو گے اور آسمان پر کوئی نہیں چڑھا سوائے اس کے کہ جو آسمان سے اترا یعنی ابن آدم جو آسمان میں ہے۔"

اور رسولوں کے اعمال باب اول آیت ۹ تا آیت ۱۱ صفحہ ۳۳۳ کی طرف مراجعت کریں۔ انجیل کی بے شمار نصوص ہیں جن سے حضرت مسیح علیہ السلام کا رفع الی السماء اور نزول عن السماء کا تذکرہ صحیفہ دانیال باب ہفتم آیت ۱۳ اور انجیل متی باب ۲۴ آیت ۲۹ تا ۳۱ اور انجیل لوقا باب ۲۱ آیت ۲۷ اور انجیل یوحنا باب اول آیت ۵۱ وغیرہ میں مذکور ہے۔

حق یہ ہے کہ حضرت مسیح علیہ السلام نہ مقتول ہوئے اور نہ مصلوب بلکہ جب یہود نے آپ کے پکڑنے کا ارادہ کیا تو اللہ تعالیٰ نے فرشتہ بھیج کر حضرت مسیح کو تو آسمان پر اٹھا لیا اور ان میں سے ایک شخص کو حضرت مسیح کے مشابہ بنا دیا جس کو یہود نے حضرت مسیح سمجھ کر قتل کیا اور پھر سولی پر لٹکایا۔

اور حضرت مسیح کے متعلق جس قدر واقعات درج انجیل ہیں عجب نہیں کہ یہود نے مسیحی کو رشوت دے کر یہ غلط مضامین انجیل میں لکھا دیئے ہوں۔

جو امت اپنے پیغمبر یا خدا کو معاذ اللہ تیس روپے لے کر فروخت کر سکتی ہے اور اس کے قتل میں دشمنوں کی معین اور مددگار ہو سکتی ہے وہ اگر رشوت لے کر کچھ غلط واقعات درج کتاب کر دے تو کیا تعجب ہے۔

ایک شبہ اور اس کا ازالہ

نصاری یہ کہتے ہیں کہ ایک شخص کو بلا وجہ حضرت مسیح علیہ السلام کے مشابہ بنا کر قتل کرنا ظلم ہے۔

جواب یہ ہے کہ جب آپ کے نزدیک تمام گناہ گاروں کے عوض میں خدا کا اپنے بے گناہ اور معصوم بیٹے کو قتل کرا دینا ظلم نہیں تو پھر ایک کافر یہودی یا کسی گناہ گار مؤمن کا حضرت مسیح علیہ السلام کے کفارہ اور فدیہ کے لئے قتل کرا دینا کیسے ظلم ہو سکتا ہے۔

جس طرح ابراہیم علیہ السلام جب حکم خداوندی کی تعمیل کی غرض سے اکلوتے بیٹے کے ذبح کے لئے تیار ہو گئے تو فوراً بیٹے کو بچا لیا گیا اور ان کے بجائے ایک مینڈھا بطور فدیہ ذبح کرا دیا۔

کیا اسی طرح ممکن نہیں کہ حضرت مسیح علیہ السلام کے قتل کے وقت حضرت مسیح کے بچانے کے لئے ایک کافر و فاجر کو حضرت مسیح کا مثیل اور شبیہ بنا کر بطور فدیہ قتل کرا دیا جائے جیسا کہ کتاب الامثال باب ۱۱ درس ۸ میں ہے:

"صادق مصیبت سے رہائی پاتا ہے اور اس کے بدلہ شریر پکڑا جاتا ہے۔"

اور کتاب الامثال باب ۲۱ درس ۱۸ میں ہے:

"شریر لوگ صادقوں کے بدلے اور خطا کار راست بازوں کے عوض فدیہ دیئے جائیں گے۔" اھ

ایک شبہ اور اس کا جواب

شبہ یہ ہے کہ عاصی اور گناہ گار کے قصور کو توبہ یا بدون توبہ کے معاف کر دینا اور اس پر سزا نہ دینا خلاف عدل ہے۔

جواب یہ ہے کہ خطا اور قصور کا معاف کر دینا ہرگز عدل نہیں بلکہ عین فضل اور عین جود اور عین کرم ہے۔ نیز وہ خالق اور مالک ہے۔ جس طرح چاہے اپنے ملک میں تصرف کرے۔ "لا یسئل عما یفعل" ؎

از ہرہ آنکہ از ہم تو
کشاید زبان جزبہ تسلیم تو

صحیفہ یسعیاہ کے باب ۴۵ درس نہم میں ہے:

اور رومیوں کے باب ۹ درس ۲۰ میں ہے:

"اے انسان تو کون ہے جو خدا کے سامنے جواب دیتا ہے۔ کیا بنی ہوئی چیز بنانے والے سے کہہ سکتی ہے کہ تو نے مجھے کیوں ایسا بنایا (۲۱) کیا کمہار کو مٹی پر اختیار نہیں کہ ایک ہی لوندے میں سے ایک برتن عزت کے اور دوسرا بے عزتی کے لئے بنائے۔"

اور حضرت مسیح علیہ السلام انگوری باغ کے مزدوروں کی تمثیل میں فرماتے ہیں۔ انجیل متی باب ۲۰ درس ۱۳ "یہاں میں تیرے ساتھ بے انصافی نہیں کرتا۔

(۱۵) کیا مجھے روا نہیں کہ اپنے مال کو جو چاہوں کروں۔

حضرت مسیح علیہ السلام کے اس جواب کے بعد گناہوں کی مغفرت میں کیا استبعاد ہے۔

انجیل لوقا کے باب ۶ درس ۲۷ سے ۳۸ تک دشمنوں سے محبت کرنے کا اور گنہ گاروں کے قصور معاف کرنے کی ترغیب ہے۔

باب مذکور کی ۳۶ آیت میں ہے: کیونکہ وہ ناشکروں اور بدوں پر بھی مہربان ہے۔

نجات دائمی

اہل اسلام اور اہل کتاب بلکہ تمام عقلاء اس پر متفق ہیں کہ نجات دائمی اور ابدی

ہونی چاہئے مگر سوامی دیانند دائمی نجات کا شد و مد سے انکار کرتے ہیں۔ جیسا کہ ستیارتھ پرکاش کے باب نہم صفحہ ۳۵۸ پر ہے کہ نجات لاانتہا نہیں ہوسکتی۔

حالانکہ نجات حقیقت میں وہی ہے کہ جس میں ہمیشہ کے لئے ہر قسم کے رنج و محن سے رستگاری ہو۔ چند روزہ راحت کا نام کسی عاقل کے نزدیک نجات نہیں بلکہ فطرۃً ہر شخص دوامی نجات کا طالب اور ساعی ہے بلکہ سوامی دیانند بھی اسی کے خواہاں ہیں۔ چنانچہ ستیارتھ پرکاش باب پنجم صفحہ ۲۱۶ بت سنیاسی الی قولہ موت کے بعد دائمی خوشی حاصل کرتا ہے اور ستیارتھ پرکاش کے صفحہ ۳۵۶ باب نہم میں ہے:

"اس کو دنیوی سکھ دکھ چھوتے بھی نہیں بلکہ ہمیشہ آنند میں رہتا ہے "واصرح من هذا کله ما قال فی" رگوید آدی بھاشیہ بھومکا صفحہ ۱۱۱ مہتیا گیان یعنی جہالت کے دور ہونے سے جیو کے تمام دوش (عیب) دور ہو جاتے ہیں۔ پھر عیب کے دور ہونے سے ادھرم اور نفس پرستی وغیرہ کا خیال دور ہو جاتا ہے۔ جس کے دور ہو جانے سے پھر جنم نہیں ہوتا۔ جنم کے نہ ہونے سے تمام دکھ بالکل معدوم ہو جاتے ہیں۔ دکھوں کے مٹ جانے سے موکش یعنی پرمیشور کے قرب میں پرم آنند (راحت اعلیٰ) حاصل ہوتا ہے۔ اسی کو موکش یعنی نجات کہتے ہیں۔" اھ۔

اور گوید آدی بھاشیہ صفحہ ۱۱۴، سطر ۳، ۴، ۵ ملاحظہ ہو:
اور اخیر سطر سے باب ختم ہونے تک۔

نجات کے محدود ہونے کی سب سے بڑی دلیل جو سماج نے پیش کی ہے وہ یہ ہے کہ بندہ کا عمل محدود ہے لہٰذا اس کی جزا اور نجات بھی محدود ہونی چاہئے۔

جوابِ اوّل: اگر یہ اصول صحیح ہے تو پھر ہر شخص کی عمر کے موافق اس کو مکتی (نجات) ملنی چاہئے۔ تینتالیس لاکھ بیس ہزار برس مکتی کی میعاد مقرر کرنا سراسر اس اصول کے خلاف ہے۔ جیسا کہ ستیارتھ پرکاش کے صفحہ ۳۵۷ بجواب سوال ۲۲ باب نہم

میں مذکور ہے، اور پھر باب نہم کے ۲۶ سوال کے جواب میں صفحہ ۳۵۹ پر ہے مکتی پیدا ہونے اور مرنے کے مانند نہیں۔ کیونکہ جتنی مدت دنیا کی ۳۶ ہزار بار پیدائش اور فنا کی ہے اتنے عرصہ تک جیو کا مکتی کے آنند میں رہنا اور دکھ کے نزدیک نہ آنا کیا چھوٹی بات ہے۔

جوابِ دوم: اس اصول اور قاعدہ کے مطابق دوسرا اشکال یہ لازم آتا ہے کہ ہر ناجی روح کی نجات کا زمانہ مختلف ہونا چاہئے اور روح کی مکتی کی مدت اس کے اعمال کے مطابق ہونی چاہئے اس لئے کہ جب ارواح اور ان کے اعمال میں اختلاف اور تفاوت ہے تو ان کی مدت ہائے نجات میں بھی ضرور تفاوت ہونا چاہئے سب کی نجات کا زمانہ برابر اور یکساں کیسے قرار دیا گیا۔

اور اگر یہ کہا جائے کہ مختلف اعمال کی مختلف سزا ہونا ضروری نہیں تو پھر تناسخ باطل ہو جاتا ہے۔

جوابِ سوم: یہ کہ اگر یہ قاعدہ صحیح ہے تو پھر ہر مجرم کو فقط اتنی ہی مدت تک سزا ملنی چاہئے کہ جتنے وقت میں اس نے جرم کیا ہے مثلاً کسی نے آدھ گھنٹے میں چوری کی تو اس کو صرف آدھ گھنٹہ کے لئے جیل خانہ میں بند رکھنا چاہئے۔ سال دو سال کی سزا اس کے لئے ہرگز ہرگز نہ ہونا چاہئے۔

بادشاہوں کا معمولی معمولی باتوں پر بڑے انعامات اور جاگیرات کا دینا تمام عقلاء کے نزدیک مستحسن ہے مگر سماج کے نزدیک غالباً یہ بالکل ممنوع اور ناجائز اور گناہ عظیم ہوگا۔

جواب تحقیقی: اعمال باعتبار حسن اور قبح کے مختلف المراتب ہوتے ہیں۔ کوئی عمل کم درجہ کا حسین ہوتا ہے اور کوئی زائد درجہ کا۔ علی ہذا قبح کا حال سمجھئے۔

ایمان باللہ و برسولہ اگرچہ ظاہراً مختصر اور محدود ہے۔ مگر معنیً اس کے حسن اور خوبی کی کوئی حد اور پایان نہیں۔ اور کفر باللہ و برسولہ کی قباحت اور شناعت کی کوئی انتہا نہیں۔

اس لئے ایمان کی جزاء وثواب دائمی اور کفر کی سزا و عذاب دائمی مقرر کی گئی۔

یہی وجہ ہے کہ ایک جج کو جو کہ صرف دو تین گھنٹہ کام کرتا ہے دو ہزار روپیہ ماہانہ تنخواہ ملتی ہے اور ایک مزدور کو جو تمام دن کام کرتا ہے صرف ۱۰ روپے ماہانہ دیئے جاتے ہیں۔ اس لئے کہ جج کا کام معنوی حیثیت سے مزدور کے کام سے بہتر ہے۔

ورنہ سماج کے اصول کے موافق مزدور کی تنخواہ جج سے زائد ہونی چاہئے۔ اس لئے کہ اس نے زائد مدت کام کیا ہے۔

دنیا ہی میں اس کی نظائر موجود ہیں کہ ایک معمولی فعل کا ثمرہ نہایت طویل اور ممتد ہوتا ہے۔ اگر کوئی شخص کسی کا ہاتھ کاٹ ڈالے تو تمام عمر کے لئے اس کا ہاتھ بے کار ہو جاتا ہے۔ ہاتھ کاٹ ڈالنا ایک دو منٹ سے زیادہ کا کام نہیں۔ ایک مرتبہ کے زنا سے ساری عمر آتشک میں مبتلا رہتا ہے۔ ایک مرتبہ گالی دے دینے سے ساری عمر کے لئے دشمن ہو جاتا ہے۔ الی غیر ذلک کام صرف ایک دو منٹ ہے مگر اس کا نتیجہ بہت طویل اور ممتد ہے۔ معلوم ہوا کہ یہ قاعدہ کہ محدود کی جزاء بھی محدود ہونی چاہئے غلط ہے۔

دیدار خداوندی

قرآن اور حدیث اور اجماع صحابہ اور تابعین سے یہ امر ثابت ہے کہ اہل ایمان جنت میں دیدار خداوندی سے مشرف اور سرفراز ہوں گے۔ جس طرح وہ خداوند ذوالجلال بندوں کو دیکھتا ہے اور خود مکان اور جہت سے پاک اور منزہ ہے اور بندے مکان اور جہت میں ہیں اسی طرح عقلاً یہ بھی ممکن ہے کہ بندے اس خداوند ذوالجلال کو اس طرح دیکھیں کہ بندے تو کسی خاص سمت اور مکان میں ہوں اور خداوند قدوس سمت اور مکان سے پاک اور برتر ہو رؤیت (دیکھنے) کے لئے یہ ضروری نہیں کہ جس شئے کو دیکھا جائے وہ جسم ہی ہو اور کسی خاص سمت اور مکان میں ہو یہ تمام باتیں

رؤیت کی شروط عادیہ میں، عقلاً جائز ہے کہ رؤیت کی تمام شروط موجود ہوں لیکن اگر حق تعالیٰ شانہٗ نہ چاہیں تو رؤیت نہ ہو۔ بلی اندھیری رات میں چوہے کو دیکھتی ہے مگر ہم نہیں دیکھتے۔ آسیب والا جنوں کو دیکھتا ہے اوران سے باتیں کرتا ہے مگر ہم نہیں دیکھتے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جبریل امین کو دیکھتے اور ان سے باتیں کرتے مگر حاضرین مجلس جبریل امین کی دید سے محروم تھے۔ اسی طرح عقلاً یہ بھی جائز ہے کہ بغیر ان شروط مزعومہ کے رویت ہو سکے صورت اولی میں رؤیت کی شروط موجود ہیں مگر رؤیت منتفی تھی۔ صورت ثانیہ اس کا عکس ہے کہ شروط مزعومہ منتفی ہوں اور رؤیت متحقق ہو۔ آخر آج بھی تو حق تعالیٰ کو دل کی آنکھ سے بے کیف دیکھتے ہیں قیامت کے دن سر کی آنکھوں سے بے کیف دیکھیں گے۔

مکان کو بغیر مکان کے اور جہت کو بغیر جہت کے دیکھتے ہیں حالانکہ مکان کسی مکان میں نہیں اور جہت کسی جہت میں نہیں ورنہ تسلسل لازم آئے۔ اسی طرح اگر حق تعالیٰ شان بغیر مکان اور جہت کے نظر آئیں تو کیوں محال سمجھتے ہو۔ مکان اور جہت تو مخلوق خداوندی میں بھی شرط نہیں جب وہ جہت اور مکان سے منزہ ہو کر نظر آ سکتے ہیں تو خالق کون ومکان کے دیدار کے لئے مکان اور جہت کی شرط کیوں ہے۔ اور علی ہذا رؤیت کے لئے مرئی کا احاطہ بھی شرط نہیں۔ ہم آسمان کو دیکھتے ہیں۔ مگر ہم آسمان کو محیط نہیں۔ نیز رؤیت علم اور معرفت کی ایک خاص نوع ہے اور علم اور معرفت کے لئے ان علوم کا کسی مکان اور جہت میں ہونا کسی عاقل کے نزدیک شرط ادراک نہیں بس جس طرح باری تعالیٰ کی معرفت بغیر کسی کیفیت اور صورت اور بغیر کسی مکان اور جہت کے ممکن ہے اسی طرح اس کی رؤیت بھی بغیر کسی مکان اور جہت کے ممکن ہے۔

قال الاستاذ ابوالقاسم القشیری سمعت ابابکر بن فورک یقول سئل الاستاذ ابوسهل عن جواز رؤیة اللّٰه تعالیٰ من طریق العقل فقال الدلیل علیه شوق المؤمنین الی لقائه والشوق ارادة

مفرطة والارادة لا تتعلق بالمحال فقال السائل ومن الذى يشتاق الى لقائه فقال الاستاذ ابوسهل يشتاق اليه كل حر مؤمن فاما من كان مثلك فلا يشتاق.

كذا فى طبقات الشافعية الكبرى فى ترجمة محمد بن سليمان الى سهل ٢/١٦٣.

ترجمہ: ''استاذ ابوالقاسم قشیری رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ میں نے ابوبکر بن فورک کو یہ کہتے ہوئے سنا ہے کہ ایک مرتبہ استاذ ابوسہل سے یہ سوال کیا گیا کہ کیا عقلاً اللہ تعالیٰ کی رؤیت ممکن ہے فرمایا کہ لقاء خداوندی اور دیدار الٰہی کی طرف اہل ایمان کا اشتیاق یہ اس کے امکان کی دلیل ہے اس لئے کہ شوق ارادہ مفرطہ کا نام ہے اور ارادہ محال سے متعلق نہیں ہوتا۔ پھر سائل نے یہ دریافت کیا کہ وہ کون ہے کہ جو اس کی لقاء کا مشتاق ہے فرمایا کہ ہر مخلص مسلمان لقاء خداوندی کا مشتاق ہے البتہ تجھ جیسا بے حس مشتاق نہیں۔''

حق تو یہ ہے کہ اشتیاق خلاف عقل نہیں بلکہ عدم اشتیاق خلاف عقل ہے عقلاً یہ کیسے ممکن ہے کہ انسان اپنے مربی اور محسن کی لقاء اور دیدار کا مشتاق نہ ہو جب کبھی کوئی پریشانی پیش آتی ہے تو نظریں اس کی طرف اٹھتی ہیں اور دل اس کی طرف دوڑتا ہے۔ یہ اشتیاق نہیں اور کیا ہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اللہ کا کلام سنا۔ کلام سے متکلم کا اشتیاق پیدا ہوا اور دیدار کی درخواست کی ''رَبِّ اَرِنِیْٓ اَنْظُرْ اِلَیْکَ'' جواب ارشاد ہوا ''لَنْ تَرٰنِیْ'' یعنی تم دیکھ نہ سکو گے اور میرے جمال بے مثال کی تاب نہ لاسکو گے۔ موسیٰ علیہ السلام کی یہ مشتاقانہ درخواست خود اس کے ممکن ہونے پر دلالت کرتی ہے اگر دیدار خداوندی کوئی محال چیز ہوتی تو خود موسیٰ علیہ السلام سوال نہ فرماتے اور یہ ناممکن ہے کہ اللہ کے

نبی کو یہ علم نہ ہو کہ کونسی چیز بارگاہ خداوندی میں ممکن ہے اور کونسی محال۔

نیز حق جل وعلا کا جواب خود اس کے امکان پر دلالت کرتا ہے۔ اس لئے کہ جواب میں یہ فرمایا "لن ترانی" "تم نہیں دیکھ سکو گے اور یہ نہیں فرمایا کہ "لن اری" کہ میں نہیں دیکھا جا سکتا۔ یعنی میری رویت ممکن نہیں اگر کوئی شخص کسی کے دامن یا برتن میں کھانے کی چیز سمجھ کر یہ کہے کہ "اعطنیہ لا کلہ" یعنی یہ چیز مجھ کو کھانے کے لئے دے دیجئے اگر وہ چیز جنس غذا اور جنس طعام ہی سے نہ ہو تو یہ جواب دیں گے "انہ لا یوکل" یہ چیز کھانے کی نہیں اور اگر وہ چیز جنس طعام سے ہو تو یہ جواب دیں گے "انك لن تاکلہ" یعنی تم نہیں کھا سکتے مطلب یہ ہے کہ چیز اگرچہ کھانے کی ہے مگر تمہارا معدہ اس کو برداشت نہ کر سکے گا۔ اسی طرح حق تعالیٰ شانہ کا جواب میں "لن ترانی" فرمانا اس کا مطلب یہ ہے کہ اگرچہ میں اس قابل ہوں کہ دیکھا جاؤں میری طرف سے کوئی حجاب نہیں مگر تم میں دیدار کے تحمل کی قوت نہیں اس لئے تم مجھ کو اس وقت نہیں دیکھ سکتے۔ آخرت میں قوت تحمل عطا کر دی جائے گی اس لئے وہاں دیکھ سکیں گے۔

دنیا دار فنا ہے اور آخرت دار بقا ہے آخرت میں پہنچ جانے کے بعد نہ کسی کو موت آئے گی نہ کوئی بیمار ہوگا اور نہ کسی کو ضعف لاحق ہوگا۔ جیسا کہ کسی شاعر نے کشمیر کی تعریف میں کہا ہے ؎

برسوختہ جانے کہ بہ کشمیر در آید
گر مرغ کباب است بابال و پر آید

ہر جگہ کی خاصیت جدا ہے بعض جگہوں کی آب و ہوا کمزور ہوتی ہے اور بعض مقامات کی آب و ہوا قوی ہوتی ہے اسی طرح آخرت کو سمجھو کہ وہاں قوت ہی قوت ہوگی ضعف کا نام ونشان نہ ہوگا اس لئے وہاں پہنچ کر دیدار خداوندی کا تحمل ہو سکے گا علاوہ ازیں کلمہ "لن" کلام عرب میں نفی وجود کے لئے مستعمل ہوتا ہے۔ نفی امکان کے لئے نہیں آتا۔

خلاصہ کلام

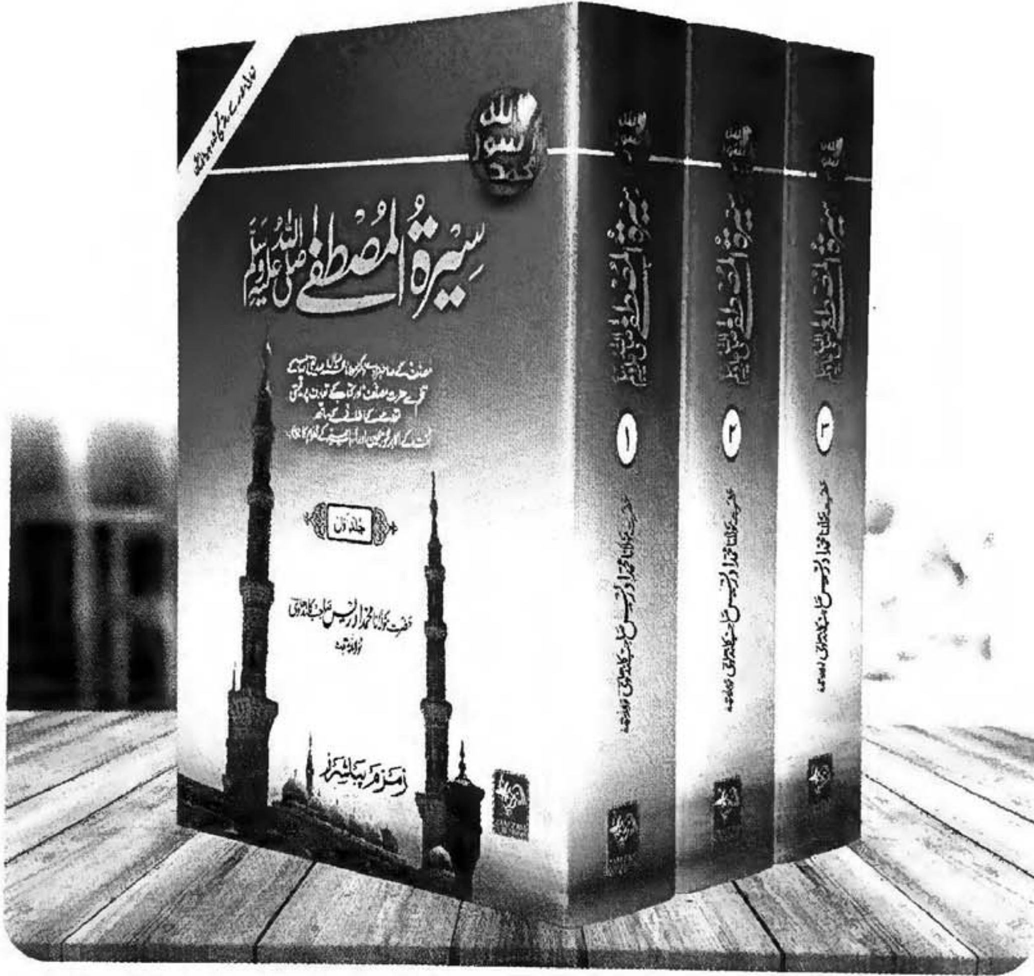
یہ کہ دیدار خداوندی عقلاً ممکن ہے اور مخبر صادق نے اس کے وقوع کی خبر دی ہے لہٰذا اس پر ایمان لانا واجب اور ضروری ہے ہاں اس کی حقیقت اور کیفیت سوائے اللہ تعالیٰ کے کسی کو معلوم نہیں عوام مؤمنین کو ہر جمعہ کو دیدار ہوگا اور خواص کو روزانہ صبح اور شام ہوگا اور عورتوں کو عیدین کے موقعہ پر۔ آیات اور روایات حدیث کی تفصیل اگر درکار ہو تو حادی الارواح الی بلاد الافراح للحافظ ابن قیم رحمہ اللہ تعالیٰ کی طرف مراجعت کریں اور اگر عقلی دلائل مطلوب ہوں تو اتحاف شرح احیاء العلوم اور تقریر دلپذیر مصنفہ حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی قدس اللہ سرہ کی طرف مراجعت کریں۔

واللّٰه سبحانه و تعالٰى اعلم وعلمه اتم واحكم اللهم انى اسألك الرضا بعد القضا وبرد العيش بعد الموت ولذة النظر الى وجهك والشوق الى لقائك فى غير ضراء مضرة ولا فتنة مضلة اللهم زينا بزينة الايمان واجعلنا هداة مهديين فاطرالسموات والارض انت وليى فى الدنيا والاخرة توفنى مسلما والحقنى بالصالحين. آمين يا رب العالمين وصلى اللّٰه تعالٰى على خير خلقه سيدنا ومولانا محمد وعلى اله واصحابه وازواجه وذرياته اجمعين. سبحان ربك رب العزة عما يصفون وسلام على المرسلين والحمد للّٰه رب العالمين.



برائے یادداشت

سیرۃ المصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم



مصنفؒ کے صاحبزادے ڈاکٹر مولانا میاں محمد صدیقی صاحب کے
قلم سے حضرت مصنفؒ اور کتاب کے تعارف پر قیمتی
مقدمے کے اضافے کے ساتھ
اُمت کے اکابر مورخین اور اربابِ سِیَر کے عُلوم کا جوہر۔





زمزم پبلشرز
+92 335 1111326
: zamzampublisher@gmail.com
: www.zamzampublishers.com.pk